تعارف

و

پیش لفظ

Marfat.com

صفحہ ۱۳۰ – وجود مطلق

صفحہ ۱۳۶ — وحدت میں کثرت

" ۱۵۲ – کلام مغربی

۱۵، ۲۱۲ — فلسفہ خودی کا ماخذ قرآن مجید ہے -

۲۱۷ -

۲۳۱ - بیعت مرشد

۲۳۴ - ملوکیت

۲۸۱ - اسلامی سوشلزم — ؟

۲۸۸ -

۲۹۰ - متضاد نظریات

۳۰۹ - معجزہ دلیل نبوت نہیں ہے - (اشارہ کا عقیدہ اس کے خلاف ہے)

۳۶۵ - وحدۃ الوجود

۳۷۵ - انداز گفتگو نے دھوکہ دیئے ہیں ورنہ

[illegible]

۳۹۴ - در بحر فہم غیر قرآن مستمر است

۴۱۱ - اسلامی اشتراکیت

صفحہ ۲۸ - صوفی کی تشریح

۱۷۱ - توحید وجودی قرآن و سنت سے ماخوذ ہے -

۲۶ - بیعت کی حقیقت از شاہ ولی اللہ صاحب

۳۰ - مختلف اقوام میں وحدت الوجود کا تصور

Marfat.com

تعارف

از

ڈاکٹر غلام سرور صاحب ایم اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ)
صدر شعبہ فارسی، کراچی یونیورسٹی

یہ کتاب ایک نہایت مشکل موضوع پر تصنیف کی گئی ہے اور اپنے مطالب کی وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے "اقبالیات" میں ایک اہم مقام رکھتی ہے اس تصنیف میں فاضل مصنف نے جن موضوعات پر اظہار خیال فرمایا ہے اور جن نظریات کو پیش کیا ہے ان پر منطقیانہ بحث کرتے ہوئے اپنے دعویٰ کی دلیل میں قرآن مجید، احادیث نبوی، اور صوفیائے کرام کے آثار معجز نظام سے متعدد دلائل و شواہد پیش کئے ہیں جس سے اس تصنیف کی پوری قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

میں نے اس تصنیف کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فاضل مصنف کے عقیدہ کی رو سے چونکہ علامہ اقبال نے بعض مسائل تصوف میں اکابر اولیاء کے نظریات سے اختلاف کیا ہے یا تصوف کی موجودہ شکل و صورت اور دور حاضرہ کے صوفیہ پر اعتراضات کئے ہیں، اس لئے بعض ناقدین اقبال نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ علامہ اقبال تصوف اسلام کے مخالف ہیں۔ نیز۔ ان حضرات نے اپنے مقالات اور اپنی تصانیف میں علامہ اقبال کے اعتراضات کی تشریح اس انداز سے کی ہے کہ علامہ مرحوم کے شیدائیوں کے دل میں تصوف اسلام کے متعلق نفرت کا بیج بویا جائے۔

اس تصنیف میں صاحب تصنیف نے اپنے مختلف مقالات [illegible] بات کی تردید شد و مد [illegible]
کہ علامہ اقبال تصوف [illegible]

کی پوری وضاحت کی ہے کہ ناقدینِ اقبال چونکہ اپنی کور سوادی کی بنا پر خو
اسلام کے مخالف ہیں۔ اس لئے انہوں نے علامہ اقبال کے بعض خیالات کو ا
مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کیا ہے۔

انہوں نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ درحقیقت علامہ اقبال اور صوفیائے کر
عرفانی نظریات میں پوری مطابقت ہے اور علامہ اقبال نے جن نظریات کو پیش
وہ تمام تر وہی ہیں جو ان سے پہلے صوفیائے کرام پیش کرتے آئے ہیں۔

جناب مصنف نے اس امر کی تفصیل بھی دی ہے کہ اسلامی تصوف کے
کریم اور احادیث نبویؐ اور آثارِ صحابہؓ ہیں۔ علامہ اقبال نے بیشتر نظریات صوفیا
آثار سے لئے ہیں اور صوفیائے کرام نے وہ نظریات قرآن وحدیث سے لئے
اقبال نے اکثر و بیشتر انہی نظریات کو پیش کیا ہے جو صوفیائے کرام نے پیش
وہ ان کے مقالات کا جزوِ اعظم ہیں۔ جناب مصنف نے اپنے مقالات میں
موضوعات بھی پیش کئے ہیں جن کا مطالعہ علامہ اقبال کے نظریات کے سمجھ
ہے۔ اس لئے انہوں نے ان تمام موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے اور قار
کے لئے مفید سرمایہ پیش کیا ہے۔

مذکورہ بالا بیانات سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تصنیف ا
اور افادیت کے لحاظ سے "اقبالیات" میں کس قدر اونچا مقام رکھتی۔

میرے عقیدے کی رو سے اس دور میں جب کہ خود اپنے ہی ملک میں
اسلام کے خلاف ایسی تحریکیں پائی جاتی ہیں جن کا مقصد تصوف اسلام کی حقیقت
کم کرنا ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ ذہنوں کو مسموم کرنا بھی ہے یہ ضروری تھا کہ
... اور مفسدانہ تحریکوں کے خلاف آواز بلند کرے اور اگر ایک
... طرف خود تصوف ...

Marfat.com

ہو فیائے کرام کے درخشاں کارناموں کو بھی پیش کرے جو انہوں نے نہ صرف مسلمانوں
ہ بنی نوع آدم کی بہتری کے لئے انجام دیئے ہیں۔

الحمد للہ! کہ یہ اہم کام پروفیسر عبدالغنی صاحب نیازی نے بطرزِ احسن انجام
ا ہے۔ اس کام کی عظمت اور اس کی افادیت کا اندازہ وہی احباب کر سکتے ہیں جو خود
ضرت مصنف کی علمی اور روحانی عظمت سے واقف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بھاری
جھ اس زمانے میں جب کہ مادیت روحانیت پر غالب آچکی ہے۔ وہی شخص اٹھا سکتا
ہے جو نہ صرف تصوف اسلام سے پوری واقفیت رکھتا ہو بلکہ صوفیائے کرام کی
مت اور بزرگی کا بھی دل سے قائل ہو۔ میں اس عظیم الشان کام کی انجام دہی کے سلسلے
ں جناب مصنف کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتا ہوں

آخر میں قارئین اقبالیات سے اس تصنیف کے عمیق مطالعہ کی خواہش کرتا ہو
ر یہ اس لئے کہ مجھے یقین ہے کہ وہ اس تصنیف سے خاطر خواہ فائدہ حاصل کریں گے
ر علامہ اقبال کے کلام کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لئے ان کے سامنے نئے
ستے کھلیں گے

(دستخط)

صدر شعبہ فارسی — کراچی یونیورسٹی

[نوٹ: محترمی جناب ڈاکٹر صاحب نے ازراہِ عنایت چودہ پندرہ صفحات
پر مشتمل تعارف تحریر فرمایا تھا لیکن چونکہ پبلشرز کی رائے میں کتاب کا حجم اس کا
متحمل نہ ہو سکتا تھا لہٰذا مجبوراً اس کا خلاصہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ اس کے لیے
مصنف جناب ڈاکٹر صاحب سے معذرت خواہ ہے]

ریحانہ

Marfat.com

د

پیش لفظ

از پروفیسر یوسف سلیم چشتی، شارحِ کلامِ اقبال و مدیر "ندائے ح

جن لوگوں نے اقبال کی شاعری اور زندگی کا مطالعہ کیا ہے ان پر یہ مخفی نہیں کہ وہ اسلامی تصوف کے دل و جان سے حامی اور اپنی افتادِ طبع کے لحاظ سے صوفی ہیں۔ تصوف خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، ظاہری وضع قطع کا نام نہیں بلکہ ایک مخصوص ذہنیت اور ایک مخصوص زاویۂ نگاہ کا نام ہے جو نتیجہ ہے اس مخصوص افتادِ طبع یا سرشت کا جو ایک انسان اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے جس طرح ایک شاعر یا مصوّر ملکۂ شاعری یا مصوّری رحمِ مادر ہی سے اپنے ساتھ لاتا جس طرح ایک غیر شاعر یا غیر مصوّر باوجودِ سعیٔ بلیغ شاعر یا مصوّر نہیں بن سکتا اسی طرح ایک عقلیت پسند (RATIONALIST) لاکھ کوشش کرے صوفی نہیں بن سکتا بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ جس شخص میں پیدائشی طور پر مذہبی میلانِ طبع موجود نہ ہو وہ ساری عمر "الٰہیات" کا مطالعہ کرنے کے باوجود کبھی خدا پرست نہیں بن سکتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۱۹۲۷ء میں ایک دن اسی موضوع پر علامہ اقبال سے گفتگو ہو رہی تھی۔ گفتگو کا آغاز میرے اس سوال سے ہوا تھا کہ اب جبکہ کانٹ نے ا واجب الوجود کی تینوں مشہور و مقبول دلیلوں کو باطل کر دیا ہے تو ان حالات میں لئے آپ کیا چارۂ کار تجویز کرتے ہیں؟ مرحوم نے میرے استفسار کے جواب تھی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ تم کسی منکرِ خدا کو منطقی دلیلوں سے

Marfat.com

ا قائل نہیں کر سکتے جس شخص کے اندر مذہبی میلان کارفرما نہیں ہے۔ بالفاظ دیگر جس ں افتادِ طبع ملحدانہ ہے وہ کبھی بھی خدا کی ہستی کا معترف نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد جو واب انہوں نے دیا اس نے آگے چل کر خود میری زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا کہنے ے "خدا عقل سے ثابت ہو نہیں سکتا۔ عقل تو صرف محسوسات میں چل سکتی ہے اور خدا رآء الورآء ثم ورآء الورآء ہے اس کی ہستی کا یقین حاصل کرنا چاہتے ہو تو دل کے ینے پر صیقل کرو:۔

آئینۂ دل چوں شود صافی و پاک
نقشہا بینی بروں از آب و خاک
بینی اندر خود علومِ انبیاء
بے کتاب و بے معید و اوستا۔ (مرشد رومی)

یہ تفصیل میں نے محض اس لئے لکھی کہ ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ اقبال نے رے سوال کا جو جواب دیا وہ صرف ایک صوفی ہی دے سکتا ہے عقل کا تتبع رت تک دل کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔

یہ جواب بجائے خود ایک ناقابلِ تردید ثبوت ہے اس بات کا کہ اقبال رچہ شاعر بھی تھے اور فلسفی بھی مگر طبعاً وہ صوفی تھے۔ اب ان کی زندگی اور ان کی عری سے اپنے دعوے کو ثابت کرتا ہوں:۔

(۱) ضربِ کلیم میں اقبال نے اپنے فرزند جاوید سلمہٗ سے یوں خطاب کیا ہے:

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ — ہے اس کی نہاد کافرانہ
دربارِ شہنشہی سے بہتر — مردانِ خدا کا آستانہ
لیکن یہ دورِ ساحری ہے — انداز سب اس کے جادوانہ
خالی ان سے ہوا دبستاں — تھی جن کی نگاہ تازیانہ

Marfat.com

جس گھر کا گھر چراغ ہے تو ہے اس کا مذاق عارفانہ

اس سے معلوم ہوا کہ صرف اقبال ہی صوفی نہ تھے بلکہ ان کے گھر کا مذاق بھی "عارفانہ" ہی تھا فلسفیانہ نہ تھا۔

(۲) اقبال کے خطوط سے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے دوستوں اور مدّاحوں کو لکھے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والدین صوفی منش تھے اور ان کے والد نے قادری سلسلہ میں بیعت بھی کرا دیا تھا۔

(۳) ۱۹۰۵ء میں جب وہ عازم انگلستان ہوئے تو دلّی پہنچ کر حضرت محبوب الٰہیؒ کے آستانۂ مبارک پر حاضر ہوئے اور جو نظم آنجنابؒ کی خدمت میں پیش کی اس کے ہر شعر سے عقیدت و محبت کی خوشبو آتی ہے۔ دو شعر لکھتا ہوں:

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

نہاں ہے تیری محبت میں رنگِ محبوبی بڑی ہے شان، بڑا احترام ہے تیرا

(۴) انہیں مدة العمر صوفیائے کرام سے عقیدت رہی چنانچہ غالباً ۱۹۲۱ء یا ۱۹۲۲ء میں نقشبندی سلسلہ کے نامور بزرگ حضرت میاں شیر محمد صاحب قبلہؒ سے ملنے کے لئے شرق پور گئے تھے (یہ قصبہ لاہور سے ۲۰ میل ہے)

(۵) ۱۹۳۵ء میں پانی پت سے واپسی کے موقع پر "سرہند" قیام کیا اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے مزار مبارک پر حاضری دی اور اپنے خطوط میں ان روحانی برکات کا بھی ذکر کیا ہے جو انہیں مزار پر انوار سے حاصل ہوئی تھیں۔

جو شخص صوفی نہ ہو اوّل تو وہ کسی بزرگ کے مزار پر "حاضر" نہیں ہوگا اور اگر کسی وجہ سے (مثلاً مزار کی ساخت کا مطالعہ کرنے کے لئے) وہاں چلا بھی جائے تو وہ کبھی یہ نہیں لکھے گا کہ مجھے فلاں مزار سے روحانی فیض حاصل ہوا بلکہ اس وضع و قماش کے لوگ تو روحانی فیض ... یا التباس جو اس سے تعبیر کرتے ہیں اور بقول شخصے مزاروں پر حاضری سے ...

Marfat.com

اجتناب کرتے ہیں جس طرح ذیابطیس کا مریض شکر سے پرہیز کرتا ہے۔

(۶) اقبال نے اپنی مشہور مثنوی "اسرارِ خودی" میں تصوّف ہی کی زبان استعمال کی ہے اور تصوّف ہی کی بنیادی تعلیم "وحدت وجود" سے مثنوی کا آغاز کیا ہے۔

(۱) مثنوی کے ابتدائی عنوان میں "تعینات وجود" خالص تصوّف کی اصطلاح ہے۔

(ب) پہلا شعر تصوّف کی بنیادی تعلیم کا علمبردار ہے۔

پیکرِ ہستی ز اسرارِ خودی است   ہر چہ مے بینی ز اسرارِ خودی ست

یہاں خودی سے انسانی خودی مراد نہیں بلکہ خدا مراد ہے جسے انائے مطلق بھی کہتے ہیں۔

(۷) انہوں نے ساری عمر مسلمانوں کو ہیگل، برگساں اور نیٹشے کے بجائے سنائیؒ، عطارؒ رومیؒ اور جامیؒ کے اتباع کا مشورہ دیا۔ چند شعر لکھتا ہوں ؎

علاج آتشِ رومیؒ کے سوز میں ہے تیرا   تری نظر پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
گرہ ستارہ ہے تیری خودی کی ساز ابتک   کہ تو ہے نغمۂ رومیؒ سے بے نیاز ابتک

پیر رومیؒ را رفیق راہ ساز   تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

اے حکیم غیب امام عارفاں!   پختہ از فیض تو خام عارفاں
آنچہ اندر پردۂ غیب ست گوئے   بو کہ آب رفتہ باز آید بجوئے

(خطاب بہ حکیم سنائی در مسافر ص ۱۹)

(۸) وہ دردِ دل کو فلسفہ اور حکمت پر ترجیح دیتے ہیں اور جو شخص مسلک کے اعتبار سے صوفی نہ ہو تو وہ کبھی یہ کام نہیں کر سکتا بلکہ عقلی آدمی تو "دردِ دل" کے وجود ہی کا قائل نہیں ہوتا اور اسے خللِ دماغ سے تعبیر کرتا ہے۔ ایک شعر لکھتا ہوں ؎

بر عقل فلک پیما ترکانہ شبیخوں بہ!
یک ذرّۂ دردِ دل از علم فلاطوں بہ

Marfat.com

(۹) ان کی رائے میں فلسفی راستے کے غبار میں گم ہو جاتا ہے صرف عاشق (صوفی) منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے:۔

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم دستِ رومیؒ پردۂ محمل گرفت

(۱۰) ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عقل پرستی کا انجام "بے حضوری" ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات صرف صوفی ہی کہہ سکتا ہے:۔

انجام خرد ہے بے حضوری ہے فلسفہ زندگی سے دوری

(۱۱) انہوں نے اپنے خطوط میں اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے کہ اسرارِ خودی میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ سب مسلمان صوفیہ اور حکماء کے خیالات سے ماخوذ ہے۔

(۱۲) انہوں نے ساری عمر ہر تصنیف میں مولانا رومؒ کو اپنا مرشد تسلیم کیا اور انکی شاگردی پر فخر کیا۔

پیرِ رومیؒ مرشدِ روشن ضمیر! کاروانِ عشق و مستی را امیر

(مثنوی چہ باید کرد)

صحبت پیرِ رومؒ سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش لاکھ حکیم سربجیب، ایک کلیم سربکف

(بالِ جبریل)

ز رومی گیر اسرارِ فقیری کہ آں فقر است محسودِ امیری
ز چشمِ مستِ رومیؒ وام کردم سرورے از مقامِ کبریائی

(ارمغان)

مقامِ غور ہے کہ تصوف کا مخالف، ایک صوفی بلکہ صوفیوں کے سرتاج کو اپنا مرشد کیسے بنا سکتا ہے؟

(۱۳) انہوں نے صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ فلسفہ سے دل کی کلی نہیں کھل سکتی، بلکہ طبیعت مکدر ہو جاتی ہے اگر اطمینان قلب درکار ہو تو کانٹ کی تنقید یا ہیگل کی منطق

کے بجائے رومیؒ یا جامیؒ کا کلام پڑھو:

مرا از منطق آید بوئے خامی
دلیلِ او دلیلِ ناتمامی
برویم بستہ درہا را کشاید
دو بیت از پیر رومیؒ یا ز جامیؒ

(۱۴) ان کی نگاہ میں وہ جاہل آدمی (یہاں جاہل سے مراد وہ شخص ہے جو منطق فلسفہ اور کلام سے ناواقف ہو) جس کی نگاہ "راہ بین" ہو، یعنی جو خدا تک پہنچنے کا راستہ جانتا ہو ایک بو حامد اور رازیؒ نہیں بلکہ اس پائے کے دو سو عالم فاضل آدمیوں سے بہتر ہے

خرد بیگانۂ ذوقِ یقین است
قمارِ علم و حکمت بد نشین است
دو صد بو حامد و رازی نیرزد
بناداں کہ چشمش راہ بین است

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جس شخص نے ساری عمر مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی (یہ رباعی وفات سے چند ماہ قبل کہی تھی) وہ تصوّف کا مخالف کیسے ہوسکتا ہے۔

(۱۵) انہوں نے ساری عمر مسلمانوں کو صحبتِ شیخ اختیار کرنے کی تلقین کی، تصوّف کا مخالف مسلمانوں کو افیون کی یہ کڑوی گولی کیسے کھلا سکتا تھا۔ آج کل کے مدعیان اصلاح قوم تو صحبتِ شیخ کو سمِ قاتل سمجھتے ہیں اور عقل پرستی کا منطقی نتیجہ یہی ہے۔ بہر حال اقبالؒ نے تو اپنے مرشدِ برحق مولائے رومؒ کی اتباع میں مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا ہے کہ مردِ کامل کی جوتیاں سیدھی کئے بغیر خدا نہیں مل سکتا۔ پہلے مرشد کا فرمان درج کرتا ہوں پھر مرید کا قول پیش کروں گا۔

دامنِ او گیر زوتر بے گماں   تا رہی از فتنۂ آخر زماں

Marfat.com

ناظرین کچھ سمجھے کہ "یہ فتنۂ آخر زماں" کیا ہے؟ یہ وہی فتنہ ہے جس کی طرف سے عقل پرست طبقہ عموماً غافل ہی رہتا ہے۔ مرشدِ رومیؒ فرماتے ہیں کہ اگر تم اپنی زندگی میں کسی شیخ کامل کا دامن تھام لوگے تو اس کی تربیت سے فانی فی اللہ ہو کر باقی باللہ ہو جاؤ گے یعنی خدا تک پہنچ جاؤگے اور جب اسے دیکھ لوگے تو پھر مرتے وقت وساوس شیطانی سے محفوظ رہو گے کیونکہ جب وہ تمہارے دل میں یہ وسوسہ ڈالے گا کہ خدا نہیں ہے تو تم فوراً اس سے کہہ سکو گے کہ دُور ہو مردود! میرے سامنے سے! میں تو اسے دیکھ چکا ہوں "شنید" تو محلِ شک ہو سکتی ہے لیکن "دید" ہر قسم کے ریب و شک کو مٹا دیتی ہے اور اسی لئے اقبال نے مسلمانوں کو تنبیہ کیا ہے کہ دینِ اسلام کا مقصود "دید" ہے نہ کہ "شنید"۔

چیست دیں؛ دریافتن اسرارِ خویش
زندگی مرگ است بے دیدارِ خویش

اب سنئے! مریدِ ہندی کیا کہتا ہے!

اے سرت گردم گریز از ما چہ تیر
دامن او گیر و بے تابانہ گیر
اندریں عالم نیرزی با خسے
تا نیاویزی بدامانِ کسے

(مثنوی چہ باید کرد)

وہ تو ہمیں شیخ کامل کی آستاں بوسی کا مشورہ دیتے ہیں ؎

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے

(۱۶) انہوں نے علمِ کتابی کے مقابلہ میں "نگاہ" کی فضیلت اور قیمت واضح کی ہے اور سب جانتے ہیں کہ تصوف کا سارا دار و مدار ہی "نگاہ" پر ہے جب تک کہ مرید یا سالک

Marfat.com

اپنے شیخ کی نگاہ کا فیض حاصل نہ کرے، اس کے اندر وہ انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا جس کی بدولت ایک ذرہ رشکِ آفتاب ہو جاتا ہے۔ یعنی خطاب کا فرزند فاروقِ اعظمؓ بن جاتا ہے۔

واضح ہو کہ نگاہ سے محض نگاہ مراد نہیں ہے اگرچہ یہ معمولی نگاہ بھی تاثیر سے خالی نہیں ہوتی، در اصل اس سے وہ توجہ مراد ہے جو ایک شیخ ظاہر و باطن میں اپنے مرید پر مبذول کرتا رہتا ہے۔ یہ گویا روحانی بجلی کا تار ہے جو ایک مرید کو اپنے شیخ سے مربوط کر دیتا ہے اور اس طرح وہ مرید اپنے اندر شیخ کی صفات پیدا کر لیتا ہے۔ اسی کو اصطلاح میں فنا فی الشیخ کے مقام سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی کو نئی پیدائش بھی کہتے ہیں ۔

بہر حال اب سنئے کہ اقبال کیا کہتے ہیں:

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی؟
سکھائے کس نے اسمٰعیلؑ کو آدابِ فرزندی

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

(۱۷) اقبال کی شاعری کا لطف سے زیادہ حصہ سلوک طے کئے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ یا اس سے سلوک طے کرنے کا اشارہ مستنبط ہوتا ہے مثلاً

رقصِ تن در گردش آرد خاک را
رقصِ جاں برہم زند افلاک را

Marfat.com

اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب
تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب
سرِّ دینِ مصطفیٰؐ گویم ترا
ہم بہ قبر اندر دعا گویم ترا

یعنی اقبال مرحوم مسلمان نوجوانوں سے کہتے ہیں کہ جسمانی رقص سے تو صرف تیرا جسم گردش میں آتا ہے لیکن روحانی رقص سے تجھ میں یہ قوّت پیدا ہو جائے گی کہ تو اس کائنات میں انقلاب پیدا کر دے گا۔ اگر تو اپنی روح کو رقص میں لے آئے تو دینِ اسلام کی حقیقت تجھ پر آشکار ہو جائے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ روح رقص میں کیونکر آئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح جسم کو رقص میں لانے کے لئے کسی رقّاص یا ماہرِ فنِ رقص کی شاگردی ضروری ہے۔ اسی طرح روح کو رقص میں لانے کے لئے اس رقص کے ماہر کی صحبت اختیار کرنی لازم ہے فن تو صاحبِ فن کی صحبت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اب دوسرا سوال یہ ہے کہ روح کو رقص میں لانے کے لئے کہاں جائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ صوفیائے کرام اس فن کے ماہر ہیں اور تصوّفِ اسلامی اسی فنِ رقصِ روحانی کے مکمل نصابِ تعلیم کا دوسرا نام ہے جب تک کسی شیخِ کامل کی صحبت میں رہ کر یہ فن نہیں سیکھے گا وہ قیامت تک اپنی روح کو رقص میں نہیں لا سکتا۔

دوسرا شعر سنئے:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

سوال یہ ہے کہ ایک انسان اپنے من کے سمندر میں کیسے ڈوبے؟ اب یا تو یہ کہو کہ اقبال نے یہ ایک مہمل بات کہہ دی ہے یا پھر کسی ایسے آدمی کی تلاش کرو جو تمہیں من میں ڈوبنے اور ابھر آنے کا طریقہ سکھا دے۔ استاد کے بغیر کوئی شخص پانی میں تیرنا نہیں سیکھ سکتا

تو استاد کے بغیر من میں کیسے ڈوب سکتا ہے؟ جو شخص استاد سے تیرنے کا فن سیکھے بغیر پانی میں غوطہ لگائے گا وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

سا تصوّف دراصل من میں ڈوب کر سراغ زندگی پا جانے ہی کو کہتے ہیں۔ اس قسم کے سینکڑوں اشعار اقبال کے کلام میں موجود ہیں جن کا مفہوم سلوک طے کئے بغیر واضح نہیں ہو سکتا۔

(۲۱) اقبال نے اسرار خودی میں استحکام خودی کا جو پروگرام بیان کیا ہے وہ دراصل سلوک کی مختلف منزلوں کا دوسرا نام ہے۔ اقبال کے فلسفہ کا خلاصہ اگر دو لفظوں میں بیان کرنا ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اپنی خودی کو مستحکم کر لو یعنی وہی استحکام خودی۔ اس کا طریقہ انہوں نے یہ بتایا ہے:

عاشقے! محکم شو از تقلید یار
تا کمند تو کند یزداں شکار
اندکے اندر حرائے دل نشیں!
ترک خود کن سوئے حق ہجرت گزیں
محکم از حق شو، سوئے خود گام زن
لات و عزائے ہوس را سر شکن
لشکرے پیدا کن از سلطان عشق!
جلوہ گر شو بر سر فاران عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرح اِنِّی جَاعِلٌ سازد ترا

آپ نے دیکھا یہ طریقہ کیا ہے؟ وہی صوفیائے کرام کا وضع کردہ سلوک ہے جسے اقبال نے اپنی وضع کردہ مصطلحات میں بیان کیا ہے یعنی وہی شراب کہنہ ہے جسے نئی

Marfat.com

بو تل میں بھر دیا ہے۔ اس کی تشریح ذیل میں درج کرتا ہوں:

○ اقبال کہتے ہیں کہ خودی عشق و محبت سے مستحکم ہوتی ہے

○ اے مخاطب! کیا تو عاشق بننا چاہتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو سُن!

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تقلید کر۔ اگر تو حضورؐ کی تقلید (اتباع) کرے گا تو اللہ تعالیٰ خود تجھ سے محبت کرنے لگے گا۔ پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ قرآنِ حکیم کی اس آیت کا ترجمہ ہے:

..... یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اب اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تفصیل بیان کرتے ہیں:

(ا) جس طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے "غارِ حرا" میں خلوت اختیار فرمائی تھی تو بھی اپنے دل کے "غارِ حرا" میں خلوت اختیار کر۔ گویا خودی کو مستحکم کرنے کے نصاب کا پہلا سبق خلوت ہے اور سب جانتے ہیں کہ تصوف میں خلوت پہلا سبق ہے۔ سالک خلوت اختیار کر کے وہی کام کرتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غارِ حرا میں کیا تھا یعنی ذکر، فکر، مراقبہ اور محاسبہ۔ اب غور کیجئے کہ اقبال استحکامِ خودی کا وہی طریقہ بتا رہے ہیں جو صوفیوں میں مروج ہے اور صوفیوں نے یہ طریقہ یا پہلا سبق حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے سیکھا ہے۔

(ب) دوسرا سبق یہ ہے کہ "ترکِ خود کن" یعنی اپنی خودی کو ترک کر دے! اقبال کے عقیدت مند جو تصوف کے خلاف ہیں اور یہ کہتے نہیں تھکتے کہ اقبال تصوف کے خلاف تھے ذرا غور کریں کہ ان کا مرشد یا ممدوح کیا کہہ رہا ہے؟ کس طبقہ کی زبان بول رہا ہے؟ ترکِ خودی یعنی نفیٔ خودی کا درس دے رہا ہے! عجب تماشا ہے اگر کوئی صوفی نفیٔ خودی کی تلقین کرے تو گردن زدنی ہے لیکن اقبال ترکِ خودی کی تعلیم دے تو وہ لائقِ تحسین ہے۔

افسوس! کہ اقبال کے عقیدت مندوں نے نہ تصوف کا مطالعہ کیا اور نہ اس فن کی مصطلحات کسی صاحبِ فن سے سیکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اضحوکہ روزگار بن گئے۔ ترکِ خودی یا نفیٔ خودی کا مفہوم یہ نہیں کہ خودی کو فنا کر دو۔ یہاں خودی سے نفسِ امّارہ مراد ہے

جس کی نفی یا جس کے ترک کی صوفیوں نے تعلیم دی ہے اور اقبال نے انہی سے یہ نکتہ سیکھا ہے
جسے اپنے لفظوں میں بیان کیا ہے۔

(ج) تیسرا سبق یہ ہے: "سوئے حق ہجرت گزیں" یعنی اپنے نفس کی خواہشات سے قطع تعلق کر کے خدا کی طرف ہجرت کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرضی مولیٰ میں اپنی مرضی گم کر دو۔ اسی کو صوفیہ کہتے ہیں، فنا فی اللہ ہو جاؤ۔ آپ نے دیکھا، یہ وہی تصوّف کی تعلیم ہے جسے اقبال نے اپنے لفظوں میں پیش کیا ہے۔

(د) چوتھا سبق (سلوک کی چوتھی منزل) یہ ہے کہ حق سے رابطہ پیدا کر کے محکم ہو جاؤ یہ وُہی بات ہے کہ فانی فی اللہ ہو کر باقی باللہ ہو جاؤ۔ جب سالک اپنی مرضی (نفس کی خواہشات) کو خدا کی مرضی میں فنا کر دیتا ہے تو پھر وُہ حق کے ساتھ ہو کر زندگی بسر کرتا ہے یعنی وہ وہی کرتا ہے جو خدا چاہتا ہے۔ ع

تابع حق دیدن و نادیدنش

(ہ) پانچواں سبق: "سوئے خود گام زن"۔ یعنی پہلے اپنی خودی کو ترک کرو۔ پھر جب خدا سے تعلق پیدا ہو جائے تو خودی کی طرف واپس آجاؤ۔ یعنی اب اپنے نفس پر حکومت کرو۔ واضح ہو کہ سلوک طے کرنے سے پہلے نفس انسان پر حکمران ہوتا ہے لیکن جب سالک سلوک طے کر لیتا ہے تو بوجہ تعلق باللہ نفس پر حکمران ہو جاتا ہے۔

(و) چھٹا سبق: نفس کے بتوں کو توڑ دو۔ یعنی نفس کو پامال کر دو۔

(ز) ساتواں سبق: عشق کی قوت سے لشکر پیدا کرو۔ یعنی پہلے اخلاق رذیلہ کا خاتمہ کرو۔ پھر اخلاق حسنہ پیدا کرو۔ یہ لشکر کیا ہے؟ وہ پاکیزہ خصائل ہیں جو سالک کے اندر پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً صبر و شکر، زہد و ورع، جود و سخا، ہمدردی، رحمدلی وغیرہ وغیرہ۔

(ح) آخری سبق: جب تمہارے اندر صفات حسنہ پیدا ہو جائیں تو عشق کے مقام بلند پر فائز (جلوہ گر) ہو جاؤ۔ یعنی اب لوگوں کو مسلکِ عشق اختیار کرنے کی دعوت

Marfat.com

دو۔ گمراہوں کی اصلاح کرو، تربیتِ نفوس کا فریضہ انجام دو جب تم اس مقام پر فائز ہو جاؤ گے تو خلیفۃ اللہ یا نائبِ حق بن جاؤ گے۔ تصوّف کے مخالفوں سے ہمارا سوال یہ ہے کہ اقبال کے اس تجویزہ پروگرام اور صوفیائے کرام کے وضع کردہ "سلوک" میں کیا فرق ہے؟ ہر ایماندار شخص یہی کہے گا کہ صرف لفظوں کا فرق ہے۔ ایک نے "پانی" کہا دوسرے نے "آب"۔ بات تو ایک ہی ہے۔

جب کوئی شخص اقبال کے اس پروگرام پر عمل کرے گا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیگا کہ وہ اسلامی تصوّف پر عمل کر رہا ہے۔ اگر صفحات اجازت دیتے تو میں اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے کلامِ اقبال سے ایک دو نہیں سینکڑوں نظائر اور شواہد پیش کرتا تاہم جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ بھی کلامِ اقبال سے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ہے کہ اقبال نے ساری عمر تصوّف ہی کی تعلیم دی ہے اور اپنی خودی کو مستحکم کرنے کے لئے جب بھی کوئی شخص اقبال کے پروگرام پر عمل کرے گا تو وہ دراصل اسلامی تصوّف پر ہی عمل کرے گا جسے شک ہو وہ تجربہ کر کے دیکھ لے۔ سب سے زیادہ افسوسناک بات تو یہ ہے کہ اقبال کے مداح اور عقیدت مند ان کے کلام کو محض ذہنی تفریح کے لئے پڑھتے ہیں۔ اس پر عمل کرنے کا خیال دل میں پیدا نہیں ہوتا۔ جب یہ لوگ اقبال کا یہ شعر پڑھتے ہیں ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں   مرے مولا! مجھے صاحبِ جنوں کر

تو بے اختیار نعرۂ تحسین بلند کرتے ہیں کہ سبحان اللہ! کیا بات کہی ہے لیکن کسی کے دل میں خرد سے قطع نظر کر کے جنون اختیار کرنے کا داعیہ پیدا نہیں ہوتا۔ وجہ یہ ہے کہ "صاحبِ جنوں" بننے کے لئے "صاحبانِ جنوں کی صحبت اختیار کرنا لازم ہے اور یہ راستہ بہت مشکل ہے۔ غالباً اسی لئے مرنے سے چند ماہ قبل اقبال نے یہ کہا تھا:

از آں رمزے کہ گفتم ہے نبردند
ز شاخِ نخلِ من خرما نخوردند

Marfat.com

من اے میر امم! داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خواں انے شمر دند

اگر غور کیا جائے تو اقبال کا یہ شکوہ بالکل درست ہے۔ واقعی اس کے "یاروں" نے اسے ایک غزل خواں ہی سمجھا۔ اقبال نے ساری عمر مسلمانوں سے یہی کہا تھا کہ عشق رسولؐ اختیار کرو۔ کیوں؟ اس لئے کہ

ع مسلم ار عاشق نباشد کافر است

اور عشق رسولؐ کتابوں سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ عاشقانِ رسولؐ کی صحبت اختیار کرنے سے پیدا ہو سکتا ہے اور تصوّف عاشقانِ رسولؐ کی صحبت ہی میں بیٹھنے کا دوسرا نام ہے لیکن یاروں نے خود اقبال کو تصوّف کا مخالف قرار دے کر اس کی تعلیمات ہی پر خط نسخ پھیر دیا۔

محترم نیازی صاحب نے اپنی اس گرانقدر تصنیف میں اس قسم کی تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا ہے اور اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ علامہ اقبال ساری عمر قرآنی تصوّف کی تبلیغ واشاعت کرتے رہے۔ کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ فاضل مصنف اپنے مقصد میں بہمہ وجوہ کامیاب ہوئے ہیں۔ چونکہ صفحات کی قلت کے پیش نظر مبسوط تبصرہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے میں صرف ابواب کتاب کے خلاصے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔ کتاب کی پوری خوبیاں تو بالاستیعاب مطالعہ کے بعد ہی ظاہر ہو سکتی ہیں۔

(۱) پہلے باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اقبال نے اپنی تصانیف میں اکابر صوفیہ کے ہی خیالات کو اپنی زبان میں پیش کیا ہے۔

(۲) دوسرے باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلامی تصوّف کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہے اور اقبال نے اس سے سرِ مو انحراف نہیں کیا ہے۔ ہاں انہوں نے غیر اسلامی تصوّف پر اعتراضات کئے ہیں۔

Marfat.com

(۳) تیسرے باب میں وحدتِ الوجود کی تشریح کی ہے۔ اس کے بعد حقیقت انسانی کی توضیح کی ہے۔ اس کے بعد مشاہدہ کی حقیقت بیان کی۔ پھر یہ واضح کیا ہے کہ اسلامی تصوّف "نفی خودی" کی تعلیم نہیں دیتا۔ اس کے بعد اسلامی تصوّف میں ارتقاء کا مفہوم بیان کیا ہے۔ آخر میں مومن کی معراج کا مفہوم واضح کیا ہے۔

(۴) چوتھے باب میں انہوں نے اسلامی وحدت الوجود اور غیر اسلامی وحدت الوجود میں فرق بیان کیا ہے۔

(۵) پانچویں باب میں اسلامی فقر کی وضاحت کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ اقبال نے تمام تصانیف میں اسی کی تلقین کی ہے۔

(۶) چھٹے باب میں یہ بتایا ہے کہ خودی کا نظریہ قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔ اس کے بعد مسلمان صوفیہ کے ارشادات کی روشنی میں اس کی وضاحت کی ہے بعد ازاں درجہ خودی کی نسبت سے نوعیت "عمل" کی وضاحت کی ہے اور صوفیائے کرام پر بے عملی کے الزام کو غلط ثابت کیا ہے۔

(۷) ساتویں باب میں عشق کی ماہیت بیان کی ہے اور اس غلط فہمی کو دور کیا ہے کہ صدر اول میں تصوف کی اصطلاحات مروج نہیں تھیں، اس لئے تصوّف ایک غیر اسلامی شئے ہے۔ آخر میں یہ ثابت کیا ہے کہ عارف کا مرتبہ عالم سے بڑھ کر ہے۔

(۸) آٹھویں باب میں بیعت و اطاعتِ مرشد کی ضرورت واضح کی ہے اور اس کے فوائد بیان کئے ہیں۔ نیز وسیلہ کا مفہوم بیان کیا ہے۔ آخر میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ تلاوت کے ساتھ اگر تزکیۂ قلب ضروری نہ ہوتا تو غیر مسلم مفسرین قرآن ضرور مسلمان ہوتے۔ وہ مسلمان کیوں نہ ہوتے؟ اس لئے کہ حضورؐ کے فیض سے محروم ہیں۔

(۹) نویں باب میں روحانیت اور سیاست کی وضاحت کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ

Marfat.com

(۱) روحانیت "ایندھن" نہیں ہے۔

(ب) اس کے لئے سیاسی اقتدار شرط نہیں ہے

(ج) مقصدِ حیات حکومت نہیں بلکہ استرضاءِ باری تعالیٰ ہے۔

(د) روحانیت کے آگے مادیت اور حکومت ہمیشہ سرفگندہ رہی ہے۔

(ہ) روحانیت اور عارفانہ مذاق ہی نے اقبال کو اقبال بنا دیا۔ ورنہ وہ بھی عرفی اور غالب ہوتے یا نیٹشے اور برگساں۔

(۱۰) دسویں باب میں "انسان" کا قرآنی تصور پیش کیا ہے کہ وہ صرف ایک "تخلیقی فعلیت" ہی نہیں بلکہ "اخلاقی اور روحانی فعلیت" بھی ہے۔

(۱۱) گیارھویں باب میں "انسان کامل" کی توضیح کی ہے کہ دراصل حضور حقیقی معنی میں انسان کامل ہیں لیکن آپ کی اتباع سے اولیاء اللہ میں بھی بتفاوت مدارج رنگِ کمال پیدا ہو سکتا ہے اور کمالِ انسانیت ذہنی، قلبی اور روحانی ترقی کے مجموعہ کا نام ہے۔

(۱۲) بارھویں باب میں موت وحیات کا فلسفہ سمجھایا ہے اور اسی سلسلہ میں تصوف کے احسانات گنائے ہیں۔ ایثار اور قربانی کا حقیقی مفہوم واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اسلامی تصوف کی نمایاں ترین خصوصیت "احترام آدمیت" ہے۔ اسی میں اس امر پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ اقبال نے "وصل" کے بجائے "فراق" پر کیوں زور دیا ہے؟ آخر میں یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ جس طرح فرد اپنی ہستی جماعت میں "گم" کر کے قلزم بن جاتا ہے گم نہیں ہوتا۔ اسی طرح سالک خدا میں فنا ہو کر نائبِ خدا بن جاتا ہے، فنا نہیں ہوتا۔

جس طرح "گم شدن" اقبال کی اصطلاح ہے اور اس سے بہتر اور برتر زندگی مراد ہے اسی طرح "فنا" صوفیہ کی اصطلاح ہے اور اس سے بھی بہتر اور برتر زندگی مراد ہے۔

(۱۳) تیرھویں باب میں انہوں نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ سائنس اور فلسفہ نے حقیقتِ حیات کی جانب ہماری کیا رہنمائی کی ہے اور اس ضمن میں یہ بتایا ہے کہ سائنس

تو اس باب میں خاموش ہے کیونکہ

؎ "خدا باہر ہے حدّ دور بیں سے"

ہاں فلسفہ میں تصوریت ایسا مدرسۂ فکر ہے جس میں ایک حد تک اسلام کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ پھر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اقبال کو بعض حضرات نے برگساں کا ہمنوا قرار دیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے ان کا فلسفۂ حیات قرآن وسنت اور مسلمان صوفیوں کے ارشادات سے ماخوذ ہے۔

(۱۴) چودھویں باب میں جس کا عنوان ہے "محدود کا سفر لامحدودیت کی جانب"۔ انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ ہر شے اپنے اصل کی طرف سفر کر رہی ہے۔ اس سفر میں انبیاء اور اولیاء کی رہنمائی ہی صحیح ہے۔ نیز تصوف اسلام ہی ان سوالوں کا جواب دے سکتا ہے۔

محکم کیسے ہو زندگانی　　کس طرح خودی ہو لازمانی

(۱۵) پندرھویں باب میں انھوں نے حیات اجتماعی کے بعض اہم پہلو واضح کئے ہیں جو اقبال نے صوفیہ سے اخذ کئے ہیں۔ مثلاً

(ا) جغرافیائی وطن انسان کا اصلی وطن نہیں ہے

(ب) اسلام تمام امتیازات کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے۔ یہی اس کی شان جمال ہے

(ج) اور اپنے مخصوص تمدن کی حفاظت کے لئے عسکری قوّت کو ضروری قرار دیتا ہے یہ اس کی شانِ جلال ہے اور ملت کے عروج کے لئے دونوں کا امتزاج ضروری ہے۔

چونکہ یہ دونوں شانیں عشقِ الٰہی سے پیدا ہو سکتی ہیں اسی لئے صوفیائے کرام نے عشق کی تلقین کی ہے

(۱۶) سولھویں باب میں اسلامی خانقاہوں کی اہمیت دکھائی ہے اور خانقاہیت اور رہبانیت کا فرق واضح کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ:

(ا) اسلامی خانقاہیں وہ تربیت گاہیں تھیں جہاں سے مبلغین تیار ہو کر نکلتے تھے، مثلاً محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ۔

Marfat.com

(ب) تبلیغ و اشاعتِ اسلام کا فریضہ انہی خانقاہ نشینوں نے انجام دیا۔

(ج) اقبال نے جو اعتراضات کئے ہیں وہ غیر مسلموں کی خانقاہوں پر کئے ہیں۔ خودی کی تربیت آج بھی اسلامی خانقاہوں ہی میں ہو سکتی ہے نہ کہ کالجوں میں۔

(د) جس "نگاہ" کا درس اقبال نے ساری عمر دیا وہ صرف صحبتِ مرشد ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اور مرشد جہاں بیٹھ کر "نگاہ" پیدا کرتا ہے اسی جگہ کا دوسرا نام خانقاہ ہے چونکہ اقبال نے موجودہ زمانہ کے بعض جاہل پیروں اور غیر اسلامی تصوف پر اعتراضات کئے ہیں۔ اس لئے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ اقبال تصوف ہی کے مخالف ہیں۔ مولف نے اس غلط فہمی کا کامل ازالہ کر دیا ہے۔

جو لوگ صحیح قرآنی تصوف سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ انشاء اللہ بہت مفید ہو گا۔ انہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ جس تصوف کی اکابر صوفیہ نے تعلیم دی ہے وہ سراسر قرآن اور حدیث سے ماخوذ ہے بلکہ عین اسلام ہے۔ اس کے لئے وہ ویدانتی یونانی یا عجمی نظریات کے ہرگز ممنون نہیں ہیں۔

اہم نکتہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اقبال نظریہ وحدت الوجود کے خلاف تھے۔ فاضل مولف نے اس غلط بینی اور غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا ہے۔ ذیل میں اقبال کی تصانیف سے وہ اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں انہوں نے وحدت الوجود کی تعلیم دی ہے:

(۱) کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے (بانگ درا ۱۹۰۵ء)

(۲) پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است (اسرار خودی ۱۹۱۵ء)

نوٹ: یہاں خودی سے خدا مراد ہے ورنہ شعر مہمل ہو جائیگا۔

(۳) بر سر ایں باطل حق پیرہن ☆ تیغ لا موجود الا ھو بزن (رموز بیخودی ۱۹۱۸ء)

نوٹ: لا موجود الا ھو سے خالص وحدت الوجود مبرہن ہے جیسے شیخ اکبر

Marfat.com

نے فصوص الحکم اور فتوحات مکیہ میں بالوضاحت پیش فرمایا ہے۔

(۴) کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی ٭ کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی! ٭ تلاش خود کنی جز او نیابی (پیام مشرق ۱۹۲۴ء)

نوٹ: اس رباعی سے وحدت الوجود کا عقیدہ ایسی صفائی کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ مخالفین بھی جرأت انکار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب میں نے ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مرحوم سے پوچھا کہ جناب! آپ نے پیام مشرق کا عربی میں ترجمہ کیا ہے مگر اس رباعی کو کس جرم میں شامل ترجمہ نہیں کیا؟ تو کہنے لگے کہ "اس سے وحدت الوجود ثابت ہوتی ہے اور میں اس نظریہ کا مخالف ہوں"۔ میں نے کہا مگر یہ بات دیانت کے تو خلاف ہے، آپ کو لازم تھا کہ ترجمہ کر دیتے اور حاشیہ میں اپنا اختلاف ظاہر کر دیتے۔ خجالت آمیز لہجہ میں کہنے لگے "انشاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں تلافی مافات کر دوں گا۔"

(۵) بضمیرت آرمیدم تو بجوش خود نمائی ٭ بکنارہ بر فگندی دُرِ آبدار خود را
در خاکدانِ ما ، گہرِ زندگی گم است ٭ ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست
(زبورِ عجم ۱۹۲۷ء)

---

(۶) اگر زیری ز خود گیری ، زبر شو ٭ خدا خواہی؟ بخود نزدیک تر شو
(گلشنِ رازِ جدید ۱۹۲۷ء)

---

(۷) "یہ کائنات اپنی تفصیل کے اعتبار سے لماتِ مادی کی غیر شعوری حرکت سے لے کر انائے انسانی کی بالارادہ حرکت تک انائے کبیر (حق تعالیٰ شانہٗ) کا جلوۂ ذات ہے۔" (خطبات مدراس ۱۹۲۸ء)

---

(۸) عبدہٗ از فہم تو بالاتر است ٭ زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
لا الٰہ تیغ و دمِ او عبدہٗ ٭ فاش تر خواہی؟ بگو ھو عبدہٗ (جاوید نامہ ۱۹۳۱ء)

(۹) از ضمیرِ کائنات آگاہ اوست ٭ تیغ لا موجود الا اللہ اوست (مسافر ۱۹۳۳ء)

(۱۰) وہی اصل مکان و لامکاں ہے ٭ مکاں کیا شے ہے؟ اندازِ بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے، کیا بتائے ٭ اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟ (بالِ جبریل ۱۹۳۶ء)

Marfat.com

(۱۱) خرد ہوئی ہے زمان و مکان کی زناری ۔ نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم ۔ خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

(ضرب کلیم ۱۹۳۵ء)

(۱۲) مرد مومن از کمالاتِ وجود ۔ او وجود و غیر او ہر شے نمود (پس چہ باید کرد ۱۹۳۶ء)

(۱۳) اگر خواہی خدا را فاش بینی ۔ خودی را فاش تر دیدن بیاموز

(۱۴) چساں مومن کند پوشیدہ را فاش ۔ ز لاموجود الا اللہ دریاب (ارمغانِ حجاز ۱۹۳۸ء)

میں نے اثباتِ مدعا کے لئے ہر کتاب سے صرف ایک یا دو شعر نقل کر دیئے ہیں ورنہ ان کے کلام میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جن سے "وحدۃ الوجود" کا عقیدہ ثابت ہوتا ہے۔ میں نے ہر کتاب کے ساتھ سنِ تصنیف بھی درج کر دیا ہے جس سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال نے ۱۹۰۵ء سے لے کر تا دمِ وفات عقیدۂ وحدت الوجود کی تلقین کی ہے۔ ارمغانِ حجاز کی یہ دو رباعیاں وفات سے ۴-۵ ماہ پہلے موزوں ہوئی تھیں یعنی اقبال مرتے دم تک شیخ اکبرؒ کے متبع اور ثنا گر اور مقلد رہے ہیں۔

مجھے امید ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ ان اشعار کا مطالعہ کرنے کے بعد اس باب میں کسی کو کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہے گی۔

ایک شخص یہ تو کہہ سکتا ہے کہ میں اس عقیدے کو تسلیم نہیں کرتا لیکن کوئی شخص بقائمی ہوش وحواس یہ نہیں کہہ سکتا کہ اقبال مرحوم عقیدۂ وحدت الوجود کے خلاف تھے وہ مرنے سے چند ماہ پہلے تک مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے رہے ۔

زمین و آسمان و چار سو نیست ۔ درین عالم بجز اللہ ھو نیست (ارمغانِ حجاز ص ۱۵۱)

اقبال کا صرف یہی ایک شعر وحدت الوجود کے اثبات کے لئے کافی ہے۔

بہرحال محترمی نیازی صاحب نے اپنی گرانقدر تصنیف میں اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا ہے جس کے بدلے وہ تمام شیدائیانِ اقبال کی طرف سے ہدیہ تبریک وتحسین کے مستحق ہیں۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو جو اسلامی تصوف کی حمایت میں لکھی گئی ہے قبولِ عام کی سند عطا فرمائے اور مسلمانوں کو اس سے بیش از بیش فائدہ پہنچائے اور انہیں بزرگانِ دین خصوصاً خواجگانِ چشت وارثانِ بہشت کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد!

حرفِ آخر

فاضل مصنف نے اس کتاب میں قوم کے اربابِ فکر و نظر کی خدمت میں چند اہم تجاویز بھی پیش کی ہیں۔ قارئین کی سہولت کے لئے میں انہیں ذیل میں اختصار کے ساتھ درج کئے دیتا ہوں تاکہ ان کی اہمیت واضح ہو سکے:۔

(۱) اقبال کا اصل پیغام:

ع کہ ہوا ایک جنیدی و اردشیری (دوسرا مقالہ)

(۲) نوجوانوں کی تعلیم و تربیت — دماغی اور روحانی:

کالجوں کے ساتھ ساتھ خانقاہی نظام کی ضرورت ہے (سولھواں مقالہ)

(۳) صوفیائے کرام کے عمل کی قدر و قیمت اور اہمیت:

ان پر بے عملی کا الزام سراسر غلط ہے بلکہ کوتاہیٔ فکر کا ثبوت ہے وہ اپنے فن میں متخصصین کا مرتبہ رکھتے ہیں اور روحانی مریضوں کی اصلاح کر کے عملِ صالح کا نمونہ پیش کرتے ہیں عمل صرف چل جانے ہی کا نام نہیں ہے کسی کی زندگی میں انقلاب پیدا کر دینا سارے عملوں سے بڑھ کر عمل ہے۔

(۴) جمعیت کا صحیح مفہوم:

فقہی تعبیرات کو بھی کہہ کر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ رہبانیت اور خلوت گزینی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دیکھئے اقبال کیا کہتے ہیں:۔

شعر مصطفیٰؐ اندر حرا خلوت گزید

خاکپائے خواجگانِ چشتؒ

فقیر یوسف سلیم چشتی کان اللہ لہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین وسلام علی المرسلین

حاصلِ عمر نثارِ رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

"گر قبول افتد زہے عزّ و شرف"

نذرِ عقیدت

اپنے تمام برگزیدہ پیرانِ عظام سلسلہ عالیہ قادریہ، چشتیہ، نظامیہ، نیازیہ نقشبندیہ، سہروردیہ کے نام، جن کی پاکیزہ تعلیم و ہدایت سے لاکھوں سینے معرفتِ الٰہی کے گنجینے بنے اور بے شمار طالبانِ حق منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔

ع

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

خادمُ الفقرا

پروفیسر (شاہ) محمد عبد الغنی (ایم۔ اے)

قادری، چشتی، نیازی، نظامی

جبلپوری

کراچی - جنوری ۱۹۶۱ء

Marfat.com

دیباچہ

چوں شود اندیشۂ قومے خراب
ناسرہ گردد بدستش سیم ناب

میرد اندر سینہ اش قلب سلیم
در نگاہِ او کج آید، مستقیم!

پس نخستیں بایدش تطہیر فکر
بعد ازیں آساں شود تعمیر فکر

قوم کا اندازِ فکر و نظر بدلنے اور قلب کی اصلاح کرنے کے سلسلے میں علامہ اقبال کی کوششیں اسی وقت بار آور ہو سکتی ہیں جب کہ ان کے افکار و نظریات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ لیکن علامہ کا ذہنی سرمایہ بہت وسیع اور متنوع ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر ان کے افکار و نظریات کا سرسری جائزہ بھی آسان نہیں۔ اس کے لئے آرٹ و سائنس، فلسفہ و مذہب، فقر و تصوف، تاریخ و سیاست، معاشیات و نفسیات اور مسائل مابعد الطبیعیات وغیرہ سب کچھ جاننے کی ضرورت ہے۔

زیرِ نظر مقالات میں صرف اسلامی فقر و تصوف سے متعلق علامہ کے افکار و نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ (۱) اسلامی فقر و تصوف کے بنیادی اصول اور اجزائے ترکیبی کیا ہیں؟ (۲) ان کے ماخذ کیا ہیں؟ (۳) علامہ کے افکار و نظر کس حد تک اسلامی فقر و تصوف سے ماخوذ ہیں؟ (۴) کہاں اُن میں تضاد نظر آتا ہے؟ اور کیوں؟ (۵) فقر و تصوف اور صوفیائے کرام پر انہوں نے کیا اعتراضات کئے ہیں اور کیوں؟ (۶) وہ اعتراضات کس حد تک صحیح ہیں؟ (۷) اسلامی تصوف میں "انسان" "انسانِ کامل" "حقیقت انسانیہ" ارتقاء رُوحانی، فنا، بقا، فراق، وصال، وجود انا، موت، حیات، فقر، قلندری، ولایت، نبوت اور خلافت فی الارض وغیرہ اصطلاحات

Marfat.com

کا کیا مفہوم ہے ؟ (۸) از روئے قرآن و سنت حیات انسانی کا کیا مقصد ہے؟ (۹) کیا اسلامی روحانیت کسی سیاسی اقتدار کی محتاج ہے؟ (۱۰) مسلم فقراء و مشائخ نے انسانیت کی کیا خدمت کی ہے اور تاریخ اسلام میں اس کا کیا مقام ہے؟ (۱۱) آئندہ بھی عالم انسانیت کو ان کے مسلک و مشرب اور ان کی خدمات کی کیوں ضرورت ہے ؟ اور (۱۲) کیا واقعی علامہ اقبال نے اس سے بہتر کوئی نئی چیز ہمیں دی ہے یا اکابر صوفیہ اور اولیاء اللہ کے عقائد و نظریات ہی نئے لباس میں ہمارے سامنے پیش کیے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ

ان سوالات کے علاوہ اور بھی متعدد مسائل ہیں جو ان مقالات میں زیر بحث آئے ہیں ان کی اہمیت مطالعہ ہی سے واضح ہو سکے گی۔

ظاہر ہے کہ ان سوالات کا تسلی بخش جواب اسی وقت دیا جا سکتا ہے جب کہ اسلامی فقر و تصوف سے کما حقہ واقفیت ہو۔ لیکن اس واقفیت کے لئے دو شرطوں کی تکمیل کی ضروری ہے۔

(اول) اسلامی تصوف اور اسلامی فقر و درویشی کو خود مسلمان صوفیائے کرام کی تصنیفات، تالیفات اور ان کے حالات و ملفوظات سے معلوم کیا جائے نہ کہ مستشرقین مخالفین اسلام یا ان لوگوں کے بیانات سے جن کی زندگی کا نصب العین "رب کی ملاقات" نہیں بلکہ صرف مادی لذائذ حیات ہیں یا جو روحانیات میں ان نکات پر ایمان نہیں رکھتے جن پر مشائخ کرام اور صوفیائے عظام کا صدیوں سے اجماع ہے۔

(دوم) اسلامی فقر و تصوف اور ان سے متعلقہ مسائل و امور کی واقفیت کیلئے کتابی و اکتسابی علم کے علاوہ کشف صدر اور معرفت حق کی دولت بھی ضروری ہے۔

معرفت حق تعالیٰ نتیجہ ہے۔ اور کشفِ صدر یا الہام ذریعہ۔ فقر، قلندری، درویشی

Marfat.com

اور تصوف مخصوص نوعیت کی عملی زندگی کے نام ہیں جسے منزل مقصود تک پہنچانے والا راستہ کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں عبادت کے اُن طریقوں پر عمل کیا جاتا ہے۔ جن سے کشف و الہام کی قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ علمِ معرفت قابلِ بیان اور معرفت ناقابلِ بیان ہے۔ لیکن حقیقت حال کی کامل دریافت کے لئے علم معرفت اور معرفت دونوں ضروری ہیں۔

مندرجہ بالا تمام قسم کے سوالات کے جوابات زیرِ نظر مقالات میں موجود ہیں (البتہ ترتیب مختلف ملے گی اور عنوانات بھی مختلف ہوں گے) یہ مقالات چونکہ مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں لہذا ممکن ہے بعض نکات کی کہیں کہیں تکرار نظر آئے لیکن ایسے مقالات میں اس قسم کا نقص ناگزیر اور قابلِ معافی ہے۔

اس سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ اس ناچیز نے حتی الامکان مذکورۂ بالا دونوں شرائط کی تکمیل کی ہے اور اس کے بعد ہی اپنے خیالات سپردِ قلم کئے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ——

اقبالیات پر کوئی اہم تالیف یا مقالہ ایسا نہیں جو میری نظر سے نہ گزرا ہو (فہرست طویل تھی لہذا شامل نہیں کی گئی) اس کے علاوہ میں نے اقبال کو بغور پڑھا بھی ہے اور ایم اے تک کے طلباء کو پڑھایا بھی ہے۔ اس لئے مجھے علامہ کی فکر و نظر پر بار بار غور کرنے اور پوری توجہ سے مطالعہ کرنے کا کافی موقع ملا ہے۔ علاوہ بریں جن علوم سے علامہ نے بحث کی ہے۔ انہیں سمجھنے کے لئے متعلقہ کتب کا مطالعہ بھی بغور کیا ہے۔

شرط دوم کی تکمیل کا شرف بھی اس طرح حاصل ہے کہ خاندان میں مدت دراز سے اسلامی فقر و درویشی کی مستند دولت موجود اور تعلیم و تربیت پر یہی رنگ غالب

Marfat.com

ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اعلیٰ ترین دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ بزرگان خاندان قادریہ، چشتیہ، نیازیہ کے فیضان باطنی اور برکات روحانی سے قلب و نظر کا دامن مالامال ہے اور زبان حال پر ؎

دامانِ نگہ تنگ و گُلِ حُسن تو بسیار

کا وظیفہ ہے۔ ناظرین کرام اسے خودستائی پر محمول نہ کریں کیونکہ مذکورۂ بالا معیار پر تحقیق استناد مضامین کے لئے ان حقائق کا اظہار ضروری تھا۔

میں اس بات کا قائل نہیں کہ علامہ اقبال اسلامی تصوف کے خلاف تھے اور نہ اس کا کہ خدارسی کے لئے انہوں نے اس سے بہتر کوئی نیا مسلک دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ کیونکہ تحقیق سے ایسا ثابت نہیں ہوتا۔ میں یہ کہنے پر بھی مجبور ہوں (اور ہر انصاف پسند میری ہمنوائی کرنے پر مجبور ہوگا) کہ صوفیائے کرام کی اُن خدمات کا جواب نہیں جن کا ذکر میں نے دیباچۂ ہذا میں آگے چل کر ایک جگہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں ہمیں علامہ اقبال کے صرف اختلافی اشعار پر نظر نہ رکھنی چاہیئے۔ (کیونکہ انہوں نے اگر کسی بات کی شروع میں مخالفت کی ہے تو کچھ دن بعد اس کی موافقت بھی کی ہے) بلکہ یہ دیکھنا چاہیئے کہ بحیثیت مفکر ان کی کس رائے کو آخری و قطعی سمجھا جائے۔ نیز یہ دیکھنا چاہیئے کہ کیا اکابر صوفیہ رض اور علامہ اقبال کی بیان کردہ اخلاقی و روحانی اقدار حیات ایک دوسری کی ضد ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو اختلاف لازماً فروعی ہونگے بنیادی نہیں۔ لیکن اختلافات جب تک بنیادی نہ ہوں علامہ اقبال کو تصوف کا مخالف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

صوفیائے کرام انسان کے روحانی ارتقاء کے ماہر ہوتے ہیں۔ اس کے سوا دہ

کسی دوسری چیز کا دعویٰ نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ حتی الامکان وہ مخلوقِ خدا کی خدمت کرتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان سے غلط توقعات وابستہ کر کے الزامات عاید کئے جاتے ہیں۔ یہ انصاف کے خلاف ہے۔ عام طور پر یہ بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ فقر و تصوف اسلام کا جزو نہیں ہیں بلکہ ویدانت، فلاطونیت اور بُدھ مت وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔ گویا یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام صرف ظاہر پرستی کا مذہب ہے۔ اسے انسان کی رُوحانی، معنوی ارتقاء سے کوئی واسطہ نہیں۔ اور آنحضرت صلعم سے لے کر آج تک جتنے اولیائے اللہ اور اکابر صوفیہ رح گزرے ہیں۔ اُن کا مسلک رُوحانیت خدانخواستہ غلط تھا۔ لیکن کیا کوئی صحیح الدّماغ۔ سلیمُ القلب، محقق مسلم ان امور کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے؟

واضح رہے کہ یہ امور دین اللہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی مغزِ اسلام اور رُوحِ دین ہیں اور انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال کے مرشد مولانا رُومؒ نے کہا تھا:۔

من ز قرآں بر گزیدم مغز را
استخواں پیش سگاں انداختم
جُبّہ و دستار و علم و قیل و قال
جملہ در آبِ رواں انداختم

فلسفہ خواہ کچھ کہے لیکن وہ وحی و الہام کا ہم پلہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ نہ اس پر دین کی بنیاد قایم کی جا سکتی ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہ نے ایک خط میں لکھا تھا۔ کہ خواص جس تصوف کے قائل ہیں۔ وہ روح دین اور سرّ اخلاص ہے۔ اربابِ ظاہر کا اس باب میں کچھ کہنا قلتِ نظر کی دلیل ہے۔ اقبال کوئی صاحب وحی

Marfat.com

نہیں کہ ان کے قول و عمل میں خطاء نہیں ہو سکتی۔ نہ وہ عالم شریعت اور واقفِ علومِ دین تھے۔ وہ بے شبہ مخلص اور بہت مخلص اور دین اسلام اور حضور انور صلعم اور اکابر ملت کے شیدا تھے۔ حضور سے اُن کو عشق تھا۔ دین اسلام کی بڑی غیرت تھی۔ ایک متکلم کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بلند تھا۔ مگر بایں ہمہ ان کے قول پر مسائل دین کی بنیاد ڈالنا فساد کی راہ ہے۔۔۔" [۱]

سید صاحب مرحوم کی بزرگانہ شخصیت، فضیلتِ علمی اور دِقّتِ نظر کا کون معترف نہیں ہے۔ دین کے معاملہ میں جب ایسے جیّد بزرگ احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تو ان سے کم مرتبہ رکھنے والے حضرات کو اپنی جسارت پر شرم آنا چاہیئے [۲]

فروعی اختلافات ہمیشہ رہے ہیں اور رہیں گے۔ اس میں مضائقہ نہیں۔ لیکن بنیادی اختلافات سے انسان مخالف کیمپ میں پہنچ جاتا ہے۔ ہم کو غیر مسلم نقادانِ مغرب سے بہت ہوشیار رہنا چاہیئے۔ وہ اس خوبصورتی سے اعتراض کرتے ہیں کہ ہمارے بنیادی اصولوں پر ضرب پڑتی رہے اور سرسری مطالعہ کرنے والوں کو اس کی خبر بھی نہ ہونے پائے۔ جسم میں زہر آہستہ آہستہ سرایت بھی کر جائے اور کھانیوالا یہی سمجھتا رہے کہ وہ مٹھائی کھا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو نہ اس امر کی اجازت دی جا سکتی ہے کہ وہ ایسے دوست نما مخالفین اسلام کی زہر آلود شیرینی استعمال کرتے

---

[۱] "عرفانِ اقبال" از مولانا بشیر مخفی کراچی۔ ص ۲۸۴ تا ص ۲۸۷

[۲] بالخصوص علامہ اقبال کی فکر و نظر کے وہ شارحین جو اپنے بیانات میں اکابر صوفیہ اور اُن کے مسلک کی تضحیک و تردید محض مخالفین اسلام کی تقلید میں کرتے ہیں۔ اور یہ کبھی نہیں سوچتے کہ قرآن و سنت اور علمائے طریقت کے اجماع سے کیا ثابت ہوتا ہے۔

رہیں۔ نہ اس امر کی کہ وہ اس کے زیر اثر اسلام یا اسلامی فقر و تصوف کی بنیادیں کھودیں اور اسے "تجدید و اصلاح" کا نام دیں۔ کیونکہ اصلاح کی گنجائش فروعات میں ہوسکتی ہے۔ اصل اصول میں نہیں۔

خود علامہ اقبال نے جابجا اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ وہ چند فروعی مسائل کے سوا تمام امور دین میں اولیاء اللہ اور اکابر صوفیہ کے مسلک کے پیرو ہیں۔ انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ان کا فلسفہ خودی اور نظریہ زمان و مکان وغیرہ سب صوفیۂ اسلام ہی کے نظریات سے ماخوذ ہیں۔ البتہ انہوں نے ان حقائق کو نئے انداز سے پیش کیا ہے تاکہ اہل مغرب کا دماغ ان کو قبول کر سکے۔ ؎

شُنیدم ہرچہ از پاکان اُمت
تُرا با شوخیٔ رندانہ گفتم (اقبالؒ)

محققین کا ایمان ہے کہ اسلامی تصوف انسانیت کا مذہب ہے۔ وہ اُن اصولوں کا مجموعہ ہے جو انسانیت کو درجۂ کمال عطا کرتے ہیں۔ ان اصولوں پر کاربند رہ کر ہی انسان "خَلِیفَۃُ اللّٰہ"، "اَشْرَفُ الْمَخْلُوْقَات"، "اِنسانِ کامل" اور اللہ تعالےٰ کا "مُقرب" بن سکتا ہے۔ اس مشرب کی ابتداء خودشناسی اور انتہاء خداشناسی ہے۔ اگر انسان کو تنگ نظری، تنگدلی، صوبائیت، وطنیت، قومیت، نسلیت اور فرقہ پرستی کی خطرناک برائیوں سے کوئی مسلک باز رکھ سکتا ہے اور اللہ کی زمین کو باہمی جنگ و جدال اور فساد و خونریزی سے بچا سکتا ہے تو وہ اسلام کے اخلاقی و روحانی اصول پر عمل درآمد ہے۔ جس کا دوسرا نام "اسلامی تصوّف" ہے۔

اسلامی تصوف کے اصول ابدی حقائق پر مبنی ہیں۔ اس لئے وہ ہر زمانے

Marfat.com

اور ہر ملک میں قلبِ انسانی کی اصلاح کے لئے مفید ہیں۔ یہ اصول ابتدائے زمانۂ تخلیق سے انسان کی راہنمائی کر رہے ہیں۔ یہی اصول اسلام کے جزوِ لاینفک کی حیثیت سے مختلف ارتقائی مراحل سے گزرے ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے مرشدِ اعظم۔ ہادیٔ اکرم سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے منسوب ہوکر درجۂ کمال حاصل کیا۔ حضور ختمی مرتبت ؐ کے بعد یہی اصول آپ کے جانشینانِ شریعت و طریقت کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔

اس طویل سفرِ ارتقاء میں بعض اوقات انسانی ذہن کی گمراہیوں، فکر کی کوتاہیوں اور عقلِ سرکش کی ہرزہ سرائیوں کے سخت حملے بھی ہوئے لیکن وحی الٰہی۔ انبیائے کرام اولیاء عظام اور ان کے کشف و الہام نے ہمیشہ کھوٹے کو کھرے سے علیحدہ کر کے بتایا اور اس طرح انسان۔ "بالخصوص اندر کے انسان" کو معراجِ کمال پر پہنچانے کی کوشش کی۔

آج بھی ان محسنین انسانیت کی برگزیدہ تعلیمات اپنی جگہ حق ہیں۔ مگر خود مسلمان ان کی اصل رُوح سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ ان کی زندگی کا نصب العین اب صرف مادی مفادات کا حصول رہ گیا ہے نہ کہ رضائے الٰہی کا حصول۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اب اکابر دین رضہ اور اولیاء اللہ کے انسانیت نواز اصولوں میں نہ "اپنوں کے لئے کوئی پیغامِ حیات نظر آتا ہے" نہ "غیروں کے لئے کوئی کشش باقی رہ گئی ہے"۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اسلام اکابر صوفیہ، شعائر اسلامی، اخلاق و روحانیت، عبادات و مجاہدات وغیرہ کے خلاف زہر اُگلنا اور غیر مسلموں، مغرب زدہ افسروں، حاکموں اور بے دینوں کے سامنے ان باتوں کا مذاق اڑانا ہی ان کی نظر میں "ترقی و ترقی پسندی" کی خاص علامت ہے اور تصوف کا نام سنتے ہی اُسے "خلافِ اسلام"، "زندگی سے فرار"، فرسودہ و ناکارہ نظامِ حیات ہونے کے تمغے عطا

Marfat.com

کئے جاتے ہیں۔

معاشرے میں یہ زہر عرصۂ دراز سے پھیل رہا ہے اور ہمارے اکثر موجودہ صوفیائے کرام کا یہ حال ہے کہ

○ ــــ وہ مخالفین کے مضامین نہیں پڑھتے۔ لہذا انہیں اُن کے اعتراضات کی خبر نہیں۔

○ ــــ ان کی اکثریت انگریزی زبان اور علوم جدیدہ سے ناواقف ہے۔ اور قدیم طرز کے جوابات سے نئے دماغوں کی تسلی نہیں ہوتی۔

○ ــــ انہوں نے شاید اب تک یہ محسوس نہ کیا کہ اخلاق و رُوحانیت سے نئی نسل کی بے تعلقی ان کے مسلک و مشرب اور وقار و افتخار کیلئے زبردست خطرہ ہے۔ نیز یہ کہ نئے دماغوں کی مذہب سے بیزاری ترکی کی طرح مذہبی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے (اس کی ذمہ داری علمائے ظاہر، مبلغین اساتذہ اور والدین پر بھی عاید ہوتی ہے)

○ ــــ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ نئے زمانے کے تعلیم یافتہ اشخاص کیوں ان کے مسلک کی جانب راغب نہیں ہوتے۔ اِلاّ ماشاءَ اللہ

○ ــــ ان کی اکثریت صرف چند روایتی تقاریب میں اُلجھ کر رہ گئی ہے جو موجودہ حالات اور حقائق زندگی کے پس منظر میں غیر مفید معلوم ہوتے ہیں۔

ان باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اکثریت اور اہل تصوف کے درمیان ایک خلیج حائل ہو گئی ہے جو روز بہ روز وسیع تر ہوتی جاتی ہے لیکن اس خلیج کا پاٹنا ضروری ہے۔ چنانچہ زیر نظر مقالات اسی جذبے کے تحت لکھے گئے ہیں۔ انہیں جامع نہ سمجھا جائے

بلکہ مقصد یہ ہے کہ صوفیائے کرام اور انگریزی داں طبقہ کی توجہ و تحقیق کا رُخ اسلامی فقر و تصوف کی بیش قیمت انسانیت نوازی، دائمی اقدار کی جانب پھیرا جائے۔ تاکہ اس میں مزید کام ہو سکے اور مذہب بیزار افراد زیادہ سے زیادہ حضرات صوفیائے کرام کے گرویدہ بن سکیں۔

اسلامی فقر و تصوف پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ انسان کو خدانخواستہ "زندگی سے فرار" یا بے عملی کی تعلیم دیتا ہے۔ لہٰذا سطور ذیل میں صوفیائے کرامؒ کی اہم خدمات کا خلاصہ بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) ان بزرگوں نے ملّتِ اسلامیہ کو ہمیشہ افراط و تفریط سے بچایا اور اسلامی زندگی کے عناصر ترکیبی میں توازن برقرار رکھا ہے۔

چنانچہ جب مسلمان فتوحات اور حکومت کی دلفریبیوں میں مبتلا ہو کر اسلام کے اخلاقی و روحانی فضائل سے محروم ہونے لگے تو فقرائے اسلام نے ان دلفریبیوں کی مخالفت کی اور اسلام کے اخلاقی و روحانی اصولوں کو اپنی عملی زندگی کے ذریعہ ان کے سامنے پیش کیا۔ (واقعۂ کربلا کے بعد ملوکیت نوازی کے دور میں فقرائے اسلام کا کارنامہ یہی تھا اور ان کی عملی زندگیاں کمالات فقر و تصوف کا آئینہ تھیں) اور جب وہ سیاسی زوال کے باعث ذہنی انتشار میں مبتلا ہونے لگے۔ تب بھی اولیاء کرام و صوفیہ عظام آگے بڑھے اور انہیں اخلاقی پستیوں کے مہیب غار میں گر کر تباہ ہونے سے بچایا۔

یہ انہی بزرگوں کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ بدترین سیاسی، معاشی طوفان بھی اسلام کے اساسی اصولوں کو تباہ نہ کر سکے۔

Marfat.com

(۲) انہوں نے بے لوث خدمتِ خلق اللہ اور بے ریا عباداتِ الٰہی کے ذریعہ انسان کو خدا تک پہنچنے کا راستہ دکھایا۔

(۳) انہوں نے ہمیشہ دنیا میں رہنے کا صحیح نمونہ اُن افراد کے سامنے پیش کیا جو دنیا کی دلفریبیوں کے نشے میں خدا کو بھول جاتے ہیں۔

(۴) انہوں نے علم کی قابلِ قدر خدمت کی۔ انسانی فکر کو نئی راہیں دکھائیں۔ اور اُسے کجروی سے روکا۔ (اغلاط فلسفہ کی اصلاح کشف والہام کے ذریعہ حقائق کا اظہار اس کی مثالیں ہیں)

(۵) انہوں نے اخلاقی و روحانی تربیت کے مراکز قایم کئے اور افراد معاشرہ کی اخلاقی و روحانی تربیت پر خاص توجہ کی تاکہ معاشرہ کی اخلاقی بنیادیں استوار ہوں (یہ خدمت حکومت کے بس کی بات نہ پہلے تھی نہ آج ہے۔ اس کے لئے حکومت مشائخ اسلام کی ہمیشہ محتاج رہتی ہے۔

(۶) انہوں نے ہمیشہ اپنی عملی زندگی سے آزادی و حُریت کا بہترین معیار دنیا کے سامنے پیش کیا اور اپنے زرین اصولوں کو قربان کرکے ارباب اقتدار کے ساتھ غلط مفاہمت کبھی نہیں کی۔

(۷) انہوں نے ہمیشہ ملوکیت کے ظلم و استبداد سے خلق اللہ کو بچانے کی کوشش کی۔

صوفیائے کرام اور فقرائے اسلام کا مذکورہ "بالا عمل" خدا کے بندوں کے ساتھ معاشرے اور ملتِ اسلامیہ کی خدمت کے لحاظ سے تھا۔ بلحاظ دین ان کے "عمل" کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

(۱) انہوں نے طالبان حق کو اللہ سے ملنے کا سیدھا، قطعی اور یقینی راستہ دکھایا

اور اپنی راہنمائی میں انہیں منزل مقصود تک پہنچایا۔

(۲) انہوں نے اسلام کی رُوح اور اس کی معنوی حیثیت و اہمیت انسان کے سامنے پیش کر کے انسانی رُوح کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا۔ اسے علماء و فضلاء کے فضول قیل و قال اور خشک استدلال سے بچانے کی کوشش کی۔ کیونکہ اس سے افتراق و انتشار کے فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ خدا نہیں ملتا۔

(۳) انہوں نے اتباع رسولؐ پر خاص زور دیا اور اپنی عملی زندگی سے اُس کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ کیونکہ اسی میں فلاح انسانیت۔ کمال انسانیت اور رضائے الٰہی کے حصول کا راز مضمر ہے۔

(۴) مذکورہ بالا اصولوں کے ذریعے اور اپنی سیرت و کردار کا بہترین عملی نمونہ پیش کر کے دین اسلام کی تبلیغ وسیع پیمانے پر کی اور کسی حکومت کی مدد کے بغیر کروڑوں نفوس کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا۔

(۵) اسلام کی اخلاقی، روحانی اور تبلیغی جد وجہد کی تاریخ انہی حضرات کی عملی زندگی سے مرتب ہو سکتی ہے۔ نہ کہ مسلمان حکمرانوں کی خانہ جنگیوں اور سیاسی لڑائیوں کی داستانوں سے۔

آج پھر اسلامی فقر و تصوف سے یہی کام لینا ہے اور پہلے "اپنوں کی غلط فہمیاں دُور کرنا ہیں۔ صوفیاء کرام اور فقراء عظام کی اخلاقی، روحانی اور تبلیغی سرگرمیوں کی تاریخ مرتب کرنے کی جانب ابھی تک مورخین اسلام نے بہت کم توجہ کی ہے۔ تاہم ان بزرگوں کے حالات میں جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انہی میں کافی مواد موجود ہے جس کے پیش نظر اُن کی خدمات کا خلاصہ اوپر مذکور ہوا۔

Marfat.com

یہ صحیح ہے کہ خدماتِ ملی کے دائرہ میں دیگر علوم و فنون کی اشاعت۔ سیاسیات معاشیات، ملک کا نظم و نسق، عدلیہ، مقننہ، تنظیم فوج، جارحانہ اور مدافعانہ جنگیں اور اسی قسم کے دیگر مسائل بھی آتے ہیں۔ لیکن یہ خیال غلط ہے کہ ان امور کو اسلام کے روحانی اور اخلاقی اقدار سے کوئی واسطہ نہیں۔ یا صوفیہ کرامؒ ان امور میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ وہ حتیٰ الامکان اور حسب ضرورت تمام امور میں حصہ لیتے ہیں۔ البتہ خاص توجہ وہ اپنے مخصوص شعبے کی جانب رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ اسی کے ماہر ہوتے ہیں۔ دیگر امور کی اصلاح و ترقی ارباب اقتدار کی ذمہ داری ہے۔ نہ کہ فقراء و مشائخ کی۔

دنیا میں تقسیم کار کا طریقہ رائج ہے۔ ہر فن کے ماہرین جُدا جُدا ہوتے ہیں اور زندگی میں اُن کی خدمت کا مقام بھی الگ الگ ہوتا ہے۔ فقراء و مشائخ اسلام کا کام بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ لہذا اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ مُومن مؤمن نہیں بن سکتا۔ جب تک اس کا قلب اخلاقی امراض سے پاک نہ ہو۔ اور جب تک ان کی موت وحیات اللہ کے لئے نہ ہو ؎

خِرد نے کہہ بھی دیا لَا اِلٰہ تو کیا حاصل
دِل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال عشق سے پیدا ہوتی ہے اور آتش عشق صوفیائے کرام کی غلامی سے بھڑکتی ہے۔

زیر نظر مقالات میں نہ صرف ان حقائق کی تفصیل ملے گی بلکہ بعض دیگر امور کا ذکر بھی ملے گا۔ جن کا تعلق فقر و تصوف اسلام اور اقبال سے ہے۔ مذکورہ بالا حقائق کی تائید میں قرآن و سُنت، اولیاء اللہ کی عملی زندگی اور بعض اوقات عقلی دلائل پیش

کئے گئے ہیں۔ اور ان سے علامہ اقبال کی موافقت کے ثبوت میں حتی الامکان ہر جگہ ان کے اشعار، خطوط اور خطبات کے حوالوں سے کام لیا گیا ہے۔ حسب ضرورت دیگر کتب کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔ یہ مضامین میری سالہا سال کی تحقیق و تلاش، وسیع مطالعہ اور ذاتی تجربات کا نتیجہ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان کا مطالعہ مستشرقین یورپ اور مخالفین تصوف کی پھیلائی ہوئی اکثر غلط فہمیوں کو دور کر دے گا۔ اس سے ان حضرات کی غلط فہمیاں بھی دور ہو جائیں گی جو علامہ اقبال کو اسلامی تصوف کا مخالف سمجھتے ہیں۔ یا یہ سمجھتے ہیں کہ خدانخواستہ اسلامی تصوف ویدانت - بدھ ازم - فلاطونیت یا نو فلاطونیت سے ماخوذ ہے۔ متصوفین کی راہنمائی اور چشم کشائی کے لئے بھی ان مقالات میں کافی مواد موجود ہے۔ لیکن واضح رہے کہ ان میں مشائخ عظام کے خاص فن کی تفصیلات سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ اس کے لئے انہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ کیونکہ کسی فن کو استاذ کے بغیر سیکھنا خطرات سے خالی نہیں۔

ناظرین کرام کو اگر میری اس حقیر کوشش میں کوئی خوبی نظر آئے تو وہ اسے اولیاء اللہ کے فیض روحانی سے اور جملہ نقائص کو خود میری کوتاہ فہمی سے منسوب فرمائیں ؎

معانی ہرگز اندر حرف ناید
کہ بحر قلزم اندر ظرف ناید

انتہائی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنے تمام کرم فرما بزرگوں اور دوستوں کا جنہوں نے مجھے اس سلسلہ میں مدد دی ہے شکریہ نہ ادا کروں۔ بالخصوص میں اپنے مخصوص دینی و روحانی بھائی جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا تہ دل سے شکر گذار ہوں جن کی قدر دانی، ہمت افزائی اور توجہ خصوصی کی بدولت میرے افکار پریشاں کا یہ مجموعہ

موجودہ شکل میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو سکا۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود ایک پُر مغز مقدمہ تحریر فرمایا اور اس طرح اپنی قدردانی کا ثبوت دیا۔ مقدمۂ مذکور کی بدولت ان مقالات کی معنوی خوبیاں اجاگر ہو سکیں۔ اور کتاب کی قدر و قیمت کا مقام واضح ہو گیا۔

اسی طرح میں اپنے مخلص کرم فرما ڈاکٹر غلام سرور صاحب ایم اے۔ پی، ایچ، ڈی (علیگ۔) صدر شعبۂ فارسی کراچی یونیورسٹی کا بھی تہ دل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے انتہائی عدیم الفرصتی کے باوجود ہر مقالہ بلکہ ہر لفظ کا مطالعہ گہری نظر سے کیا۔ اور نہ صرف متعدد مفید مشورے دئے۔ بلکہ میری استدعا پر اپنا نہایت قیمتی وقت صرف کر کے ایک گرانقدر تعارف بھی تحریر فرمایا۔ جس سے کتاب کی اہمیت و افادیت میں چار چاند لگ گئے۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اولیاء کرام کے طفیل میرے تمام کرم فرماؤں کو جزائے خیر دے اور میری اس حقیر خدمت کو حُسنِ قبول عطا فرمائے۔

کراچی، جنوری سنہ ۱۹۶۱ء

مطابق رجب سنہ ۱۳۸۰ھ

خاکپائے بزرگانِ قادریہ، چشتیہ، نیازیہ، نظامیہ

محمد عبدالغنی

عفی عنہٗ

Marfat.com

(۱)

اقبال پر صوفیائے کرام کے کلام و عقائد کے زبردست اثرات

Marfat.com

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ
عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَ
الصّٰلِحِيْنَ ج وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ؕ ذٰلِكَ
الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ؕ (۴ — ۶۹، ۷۰)

ترجمہ:-

اور جو لوگ اللہ و رسول کا حکم مانتے ہیں۔ ایسے اشخاص اُن حضرات کے ساتھ ہیں۔ جن پر اللہ نے انعام کیا ہے۔ یعنے انبیاء، صدیقین اور شہداء و صلحاء۔ اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں اور اُن کے ساتھ رفاقت محض اللہ کا فضل ہے۔ اور اللہ بس ہے خبر رکھنے والا۔

شنیدم آنچہ از پاکانِ امت
تُرا با شوخیٔ رندانہ گفتم

Marfat.com

اقبال پر صوفیائے کرام کے کلام و عقائد کے زبردست اثرات

علامہ اقبال کو حکماءِ مغرب کے خیالات سے ہزاروں درجہ زیادہ فقراء اسلام کی حکمت عالیہ اور صوفیائے کرام کے عقایدِ حقہ سے فیض پہنچا ہے۔ دراصل کلام و خطباتِ اقبال کا بہترین و بیشتر حصہ خالص اسلامی فقر و تصوف ہے۔ جسے علامہ نے کہیں تو شاعرانہ تیور کے ساتھ اور کہیں فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال نفسِ تصوف کے ہرگز خلاف نہ تھے۔ انہیں صرف "بعض" مسائل سے "کسی قدر" اختلاف تھا۔ جیساکہ بعض فروعی مسائل سے متعلق علماء کرام کے درمیان ہے۔ لیکن اس سے اسلام یا اسلامی فقر و تصوف کی تردید لازم نہیں آتی۔ علامہ ایک خط میں جو انہوں نے مہاراجہ سرکشن پرشاد کو لکھا تھا۔ لکھتے ہیں:۔

"میں نے اس سے پیشتر تصوف کے بعض مسائل سے کسی قدر اختلاف کیا تھا۔ لیکن وہ اختلاف ایک عرصہ سے صوفیائے اسلام میں چلا آتا ہے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر افسوس کہ بعض ناواقف لوگوں نے ان مضامین کو تصوف دشمنی پر محمول کیا۔" [1]

بعض حضرات نے جنہیں شاید کسی وجہ سے اسلامی فقر و تصوف اور صوفیائے کرام سے للّٰہی عناد تھا۔ فقر و تصوف کے اس سرسبز و شاداب باغ کو تو نظر انداز کردیا جو علامہ اقبال کے اعترافات، ذاتی حالات اور کلام و خطبات میں لہلہا رہا ہے۔ لیکن

---

[1] اقبال نامہ صفحات ۸، ۹۔

انہوں نے چند ایسے کانٹوں کو خوب اُچھالا جو بعض فردعات سے متعلق علامہ کے اختلاف کی صورت میں انہیں اس باغ میں نظر آئے۔ اور اس سے دنیا پر یہ ثابت کرنیکی کوشش کی کہ باغ تصوف میں کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ پھولوں کو نظر انداز کر کے کانٹوں سے کھیلنے والوں نے ان ماخذ کو بھی نظر انداز کر دیا جن سے تخم اور پودے لیکر علامہ نے اپنا باغ سجایا ہے یعنے ان سطح بینیوں نے معنویت کے اُن چشمہائے فیض کو فراموش کر دیا جن کے پانی سے علامہ نے مردِ مومن کے روحانی معنوی ارتقاء سے متعلق اپنے فکر و نظر کے باغ کو سینچا ہے۔

بہرحال ذیل کی چند سطور میں مختصراً یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ علامہ اکابر صوفیہ کے کس قدر معتقد تھے اور ان کے کلام و عقائد کا ان پر (علامہ اقبال) پر کتنا زبردست اثر تھا۔

سفر انگلستان کے سلسلے میں جب وہ لاہور سے دہلی پہنچے تو اپنے احباب کے ساتھ سب سے پہلے حضور محبوبِ الٰہی خواجہ نظامُ الدّین اولیاء قُدِّسَ سِرُّہٗ کے مزار مبارک پر حاضر ہوئے اور کچھ دیر تنہا سرہانے مؤدب بیٹھ کر اپنی ایک نظم "اِلتجائے مسافر" پڑھی اور پھر باہر آکر دوستوں کے اصرار پہ وہی نظم اِلحان کے ساتھ پڑھ کر سنائی۔ نظم کے چند ابتدائی اشعار یہ ہیں :-

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا
تیرے وجود سے روشن ہے راہ منزل شوق
دیارِ عشق کا مُصحف کلام ہے تیرا

Marfat.com

نہاں ہے تیری محبت میں رنگ محبوبی
بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا
خروش میکدۂ شوق ہے تیرے دم سے
طلب ہو فقر کو جس کی وہ جام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظام مہر کی صورت نظام ہے تیرا

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زارِ توام
دگر کشادہ جبینم گل بہارِ توام

ان اشعار کے بعد نظم کا بڑا حصہ ہے جو بخوفِ طوالت یہاں نقل نہیں کیا گیا۔ اسی میں ایک شعر یہ ہے :۔

مرے سفینے کو تو نے کنارہ بوس کیا
اماں نہ دیتا تھا جب بحرِ بے کراں مجھ کو

پوری نظم دلی عقیدت کا ایک گلدستہ ہے جسے علامہ نے تیار کر کے حضرت محبوبِ الٰہی کے حضور میں پیش کیا تھا۔[۱] انگلستان سے واپس آکر بھی مزار شریف پر حاضر ہوئے اور فاتحہ اور ایصال ثواب سے اپنے ایمان کو تازگی بخشی۔

نادر شاہ والئ افغانستان کی دعوت پر ۱۹۳۳ء میں وہ افغانستان تشریف لے گئے تو واپسی پر غزنی میں مشہور صوفی شاعر حکیم سنائی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی زیارت کی۔ ان تاثرات کو بھی انہوں نے ایک نظم میں ادا کیا ہے۔ نیز علامہ کے احساسات کو

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھو دیباچہ کلیاتِ اقبال۔ مرتبہ مولوی عبدالرزاق ایچ۔سی۔ایس سلطنت آصفیہ دکن ——— مطبوعہ عماد پریس حیدر آباد دکن۔

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی یوں بیان کرتے ہیں۔ کہ آپ نے فرمایا:۔

"سلطان محمودؒ اور حکیم سنائیؒ کے مزاروں پر بیٹھ کر میں نے دیر تک قرآن کریم کی تلاوت کی ہے۔ ان مزاروں کی زیارت سے رُوح کو ایک ایسی طمانیت اور بالیدگی نصیب ہوئی کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ بالخصوص حکیم سنائی کی قبر نے تو دل و دماغ کو انوار و تجلّیات سے روشن کر دیا ہے۔ وہیں ایک شخص نے بتایا کہ قصبے کے اندر وہ جگہ اب تک محفوظ ہے۔ جہاں حکیم موصوف مطب کیا کرتے تھے۔ میری طبیعت کو یہ جگہ دیکھے بغیر کیونکر آرام آ سکتا تھا۔ چنانچہ اُسی روز اُس شخص کی راہنمائی میں وہاں پہنچا.......... دیر تک عالم محویت میں اس چبوترے پر بیٹھا رہا۔ اور طبیعت نے سوز و گداز کی وہ نعمت پائی کہ اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔" ۱؎

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنے رہنما مُلّا قربان کی رہنمائی میں کچھ پیدل چل کر حضرت داتا گنج بخشؒ کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کی بھی زیارت کی۔ ۲؎ قندھار پہنچ کر "خرقہ شریف" کی زیارت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے "خرقہ شریف" کا ذکر نظم "مُسافر" کے اس شعر میں کیا ہے۔

خرقۂ آں برزخِ لَا یَبغِیَان
دیدمش در نکتۂ لِی خِرقَتَان

دوسرے مصرعہ میں اس حدیث شریف کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

۱؎ آثارِ اقبال

۲؎ اقبالِ کامل صفحہ ۳۶ بحوالہ سیاحت افغانستان مولفہ سید سلیمان ندویؒ۔

۹۸۷۶

Marfat.com

لِیْ حِرْفَتَانِ اَلْفَقْرُ وَالْجِہَادُ[1]

میرے دو حرفے ہیں۔ایک فقر دوسرا جہاد۔

بال جبریل میں وہ قطعہ موجود ہے جو علامہ نے حکیم سنائیؒ کے مزار کی زیارت کی یادگار کے طور پر حکیم موصوف ہی کے تتبع میں لکھا ہے۔اس کے ہر شعر سے جذبات کے طوفان اُمنڈ رہے ہیں۔اس کا آخری شعر یہ ہے :۔

"سنائیؒ کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا"

حکیم موصوف سے اقبال کے مرشد معنوی رومیؒ نے خود کسب فیض کیا ہے بلکہ ان کے ہم سلسلہ ہونے پر فخر کیا ہے۔

ما از پئے سنائیؒ و عطارؒ آمدیم

انہی کا اعتراف ہے۔حکیم موصوف سے اقبال کی عقیدت کی غالباً وجہ بھی یہی ہے۔ڈاکٹر سید عبداللہؒ لاہور لکھتے ہیں :۔

"مجھے یونیورسٹی لائبریری کی سابق ملازمت کے سلسلہ میں اس کا پورا علم ہے کہ علامہ اقبال اکثر حدیقہ اور اس کی شرحوں سے استفادہ کیا کرتے تھے۔بلکہ ان کا ارشاد تھا کہ حدیقہ کی تعلیم کو ہمارے نظام تربیت میں خاص جگہ ملنی چاہیئے۔"[2]

سنائی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں حَدِیْقَۃُ الْحَقِیْقَت اور طَرِیْقَۃ

---

[1] سیاحت افغانستان مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندویؒ۔

[2] آثار اقبال صفحہ ۲۸

Marfat.com

الْحَقِیْقَت ہیں۔ علامہ نے حضرت عطارؒ سے بہت کم استفادہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یا تو تصانیف کی کثرت ہے یا یہ ہے کہ سنائیؒ و عطارؒ دونوں مولانا رومیؒ کے سلسلۂ اساتذہ میں ہیں۔ اور ان کے تقریباً تمام خیالات کو رومیؒ نے اپنی مثنوی میں بیان کر دیا ہے۔

صوفی شعراء میں اقبال سب سے زیادہ عارف رومیؒ سے متاثر و مستفیض ہوئے۔ وہ رومیؒ کو اپنا مرشد اور ہادی سمجھتے ہیں۔ اور اس کا اعتراف اپنے کلام میں بار بار کرتے ہیں۔ زندگی کا راز اقبال نے رومیؒ ہی سے سمجھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ لاہور کی زبان سے چند جملے سُنئے۔ فرماتے ہیں:۔

"یہ مولانا جلال الدین رُومیؒ ہی ہیں جو اقبال کی نظر میں کلیم بھی ہیں اور حکیم بھی۔ مجدد بھی ہیں اور مُصلح بھی۔ شاعر بھی ہیں اور ساحر بھی۔ ولی بھی ہیں اور مجذوب بھی۔ طریقت کے دشوار گذار رستوں کے راہبر بھی ہیں اور حقیقت کے مرحلوں کے ہادی بھی۔ شریعت کے غوامض کے عقدہ کشا بھی ہیں اور حکمت کے دقائق کے شارح بھی۔ غرض اقبال کے نزدیک ہماری موجودہ "کرم خوردہ" ملت کے تمام روحانی و ذہنی امراض کو شفا بخشنے والا رومیؒ ہے۔ جس کی تعلیمات کو اقبال نے اپنے افکار میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ استغراق اس درجہ ہے کہ اقبال اپنے آپ کو "مثیل رومیؒ" قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عہد قدیم میں رومی ملت کے لئے پیغام حیات لائے تھے۔ اور اس پر آشوب دور حاضر میں وہ خود اس کے مبلغ و داعی ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنے مرشد معنوی کے نکات

Marfat.com

علم و حکمت کا ذکر اس کثرت سے اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ گویا عقاید رومی کی ترویج اُن کے مقاصد حیات میں شامل تھی۔

وہ مسلمانوں کو تاکید کرتے ہیں کہ وہ تعلیمات رومیؒ کا مطالعہ نہایت گہری نظر سے کریں[۵۱] علامہ اقبال نے ارشاد و ہدایت کے لئے جس برگزیدہ ہستی (مرشد رومی) کو منتخب کیا ہے وہ اس امر کا بجا استحقاق رکھتی ہے کہ عالم انسانیت، آفات و فتن کے اس نئے دور میں بھی اس کے تجویز کردہ نسخۂ شفا سے اپنے روحانی عوارض کا علاج کرے۔ موجودہ دور اپنے نتائج کے اعتبار سے ملتِ اسلامی اور مسلمانوں کے حق میں تاتاری دور سے کسی طرح کم نہیں جس کی دشواریوں اور پُر پیچ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے علامہ اقبال نے مرشد رومیؒ کے دامن سے تمسک کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ رومی کی حکمت عقلیت کی دشمن ہے اور دبستان دل کی طرف رہنمائی کرتی ہے........ رومیؒ کا سب سے بڑا امتیاز عشق کا جذب و سرور پیدا کرنا ہے۔ اور دور حاضر کے لئے سب سے زیادہ اسی کی ضرورت ہے[۵۲]...... آخر میں مَیں پھر اس کا اعادہ کردوں گا۔ کہ اقبال کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے نہ صرف رُومیؒ کو سمجھنا چاہیئے بلکہ

---

۵۱ اب تو یہ آسان بھی ہو گیا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے حکمت رومیؒ کو اپنی لاجواب کتاب "حکمت رومیؒ" میں بالوضاحت بیان کر دیا ہے۔ جو مثنوی کی ضخیم دفاتر کا عطر ہے۔ البتہ بعض فقرے ان کے قلم سے ایسے نکل گئے ہیں جنہیں من و عن قبول نہیں کیا جا سکتا۔

۵۲ عقل گو آستاں سے دور نہیں - اس کی تقدیر میں حضور نہیں ۱۲

اس کو مقبولِ عام بنانا چاہیئے اور حکمتِ رُومیؒ کے ایسے دبستان قائم کرنے چاہیئیں جن میں اسلامی حکمت و تصوف کے ماہرین فکر رُومیؒ کے قلزم زخار کی غواصی کریں۔ اور جو کچھ اس تلاش و جستجو سے حاصل ہو اُسے دنیا کے سامنے پیش کریں۔" ؎۱

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کی ذہنیت کو معراج کمال پر پہنچانے والے رومیؒ ہی ہیں۔ ان کی فکر و نظر میں جو وسعت پیدا ہوئی۔ ان کے کلام میں جو دقیق معنویت اور عمیق روحانیت ہے۔ وہ فارسی کے صوفی شعراء بالخصوص عارفِ رُومیؒ کی بدولت پیدا ہوئی ہے۔ موت و حیات کے رازوں سے آگاہی بھی انہی کی بخشی ہوئی نعمت ہے وہ خود فرماتے ہیں :۔

مرشد رُومیؒ حکیم پاک ذات
سرِّ مرگ و زندگی بر ما کُشاد

علامہ کو اپنے مرشد سے اس قدر محبت ہے۔ کہ انہوں نے اپنی مثنویوں (اسرار و رموز) کی بحر بھی وہی رکھی جو مثنوی کی ہے۔ اور اپنی شاعری میں فلسفہ و کلام کے دقیق نکات کا بیان اور دیگر علوم و فنون کا ذکر بھی انہی کے تتبع میں شامل کیا :۔

؎۱ آثارِ اقبال صفحات ۲۸۵ ، ۲۸۶

اسلامی حکمت و تصوف کے ہزارہا ماہرین اس قلزم زخار کی غواصی کر کے اپنی تلاش کا حاصل دنیا کے سامنے پہلے ہی رکھ چکے ہیں۔ ان کے دبستان حکمت اب بھی کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر دنیا ہی اس سے استفادہ نہ کرے۔ تو یہ اس کا قصور ہے۔

باز برخوانم زفیضِ پیرِ رُومؒ
دفترِ سربستۂ اسرارِ عُلوم

اسی طرح کثیر التعداد اخلاقی و روحانی نکتے ایسے ہیں جن کی بابت علامہ کا عقیدہ بھی وہی تھا۔ جو اکابر صوفیہ کا تھا۔ بالخصوص عارف رُومیؒ کا۔ (میں نے ان مضامین میں ان ہی نکات کی وضاحت کی ہے) اقبال کو مخالفِ تصوف ثابت کرنے والوں کو اس بات پر نظر رکھنی چاہیئے۔ کہ عارف رومیؒ کے عقائد وہی ہیں جو اکابر صوفیۂ قدیم کے تھے۔ اور قدماء کے عقائد قرآن وسنت سے ماخوذ تھے۔ پھر اقبال اپنے مرشد معنوی اور اُن کے اساتذہ طریقت کے خلاف کس طرح کوئی بات کہہ سکتے ہیں۔ اقبال تو خود کہتے ہیں:۔

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رُومیؒ

لیکن تعجب ہے کہ بعض "محققین" اقبال کو کسی دوسرے قافلے کا سالار ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر اقبال شروع شروع میں مسئلہ **وحدۃ الوجود** اور صوفی شعرا کے مخالف تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی یہ مخالفت کم ہوگئی۔ اس کی وجہ غالباً علماء ظاہر کی خشک صحبت، روحانیات سے بڑھتا ہوا شغف، فلسفۂ مغرب کی سرد مادیت اور اقبال کی ان تمام باتوں سے بیزاری تھی۔ حضرت ابن عربیؒ کو ۱۹۱۶ء میں وہ صرف محی الدین ابنِ عربی لکھتے تھے۔ ۲۲ء اور ۲۳ء کے مکتوبات میں وہ انہیں حضرت محی الدین ابن عربی لکھنے لگے[۱] اور ختم نبوت کے عنوان سے جو مکتوب انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے

۱؎ دیکھو "مجموعۂ مکاتیب اقبال" مرتبہ شیخ عطاء اللہ صاحب ایم۔اے۔ خط بنام حضرت مولانا پیر سید مہر علی شاہ صاحب قادری چشتی گولڑوی۔ مورخہ ۸ اگست ۱۹۳۳ء۔

Marfat.com

جواب میں لکھا ہے۔ اس میں ابن عربیؒ کو ہسپانیہ کا برگزیدہ اور عظیم الشان صوفی لکھا ہے[۱]

حضرت بایزیدؒ۔ حضرت جنیدؒ۔ امام غزالیؒ۔ عراقیؒ۔ سنائیؒ اور حضرت جامیؒ وغیرہ کی مدح سے ان کا کلام بھرا پڑا ہے۔ یہ سب حضرات مشہور وحدت الوجودی ہیں اور ہر دور میں علامہ کے ممدوح رہے ہیں۔ حضرت جامیؒ کا شمار حضرت ابن عربیؒ کے مشہور شارحین میں کیا جاتا ہے۔ ان بزرگوں کی مدح میں اقبال کے چند اشعار یہ ہیں:۔

عطا کن شورِ رُومیؒ سوزِ خسروؒ ۔۔۔ عطا کن صدق و اخلاصِ سنائیؒ

گہے شعرِ عراقیؒ را بخوانم ۔۔۔ گہے جامیؒ زند آتش بجانم

ندانم گرچہ آہنگِ عرب را ۔۔۔ شریکِ نغمہ ہائے ساربانم

کشتۂ اندازِ مُلّا جامیمؒ ۔۔۔ نظم و نثرِ اُو علاجِ خامیم

علامہ محمود شبستریؒ کی "گلشن راز" تصوف کی دقیق کتابوں میں سے ہے۔ اقبال نے اس کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ پھر اس کے پیغام کو نئے لباس میں ملبوس کر کے گلشنِ راز جدید کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اقبال اور شبستریؒ کی فکر کے مقاماتِ اتصال کیا ہیں۔ ان کی تصانیف میں کیا خاص علمی مسائل ہیں ان کا کچھ ذکر ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مضمون "اقبال اور شعرائے فارسی" میں کیا ہے۔ جو معارف کے کسی پرانے نمبر میں اور اس کے علاوہ رسالہ "پیغامِ حق" لاہور (۱۹۴۶ء) میں شائع ہو چکا ہے۔ لیکن ان پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔

ابتداء میں خواجہ حافظ شیرازیؒ پر علامہ اقبال نے سخت نکتہ چینی کی تھی جس کے باعث تمام ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ لیکن آخر میں انہوں نے حافظ ہی کے

---

[۱] نقد اقبال از حضرت میکشؔ اکبر آبادی

رنگ میں نہایت پُرجوش اور مستانہ غزلیں لکھیں۔ جو "پیامِ مشرق" کے تیسرے حصہ میں "مئے باقی" کے عنوان سے درج ہیں۔

اس کے بعد "زبورِ عجم" کے دوسرے حصہ میں ۵۷ غزلیں یا نغمے ہیں جو پہلے حصہ کی طرح جوش و مستی سے لبریز ہیں۔ مصنف اقبال کامل کی رائے ہے کہ اگر فارسی لٹریچر میں خواجہ حافظ کی جوشِ مستی کا کوئی جواب ہو سکتا ہے تو وہ ڈاکٹر صاحب کے یہی چند غزل نما ترانے ہیں۔"[۱]

مختصر یہ ہے کہ علامہ اقبال اکابر صوفیہ کے بے حد معتقد تھے۔ اور انہوں نے اپنے کلام و خطبات میں جو کچھ پیش کیا ہے زیادہ تر اکابر صوفیہ کے کلام و کتب کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے مضمون کا اقتباس جو گذشتہ صفحہ پر پیش کیا گیا ہے دوبارہ غور سے پڑھئے۔ انہوں نے نہایت صحیح رائے ظاہر فرمائی ہے۔ اور ہر وہ شخص جو کلامِ اقبالؒ اور رومیؒ کا مطالعہ عمیق نظر سے کرے گا۔ اسی نتیجہ پر پہنچے گا جس پر ڈاکٹر سید عبداللہ پہنچے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ لوگ بالعموم اقبال کو "مثیلِ رومیؒ" اور "حامیِ تصوف" ثابت کرنے کی بجائے "ناسخِ رومیؒ" اور "دشمنِ تصوف" ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دنیا پر یہ واضح کرتے ہیں کہ اقبال نے رومیؒ اور سنائیؒ کے فقر و تصوف کو تو مسترد کر دیا ہے۔ اور اس کی جگہ اپنے دماغ سے تراش کر کوئی نیا فقر اور "جدید تصوف" ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اقبال حضرات جنیدؒ و بایزیدؒ کا نام لے لے کر ان کا فقر و تصوف ہمارے سامنے نہ پیش کرتے۔ اور نہ حدیقۂ سنائیؒ کو ہمارے نظامِ تربیت میں خاص جگہ دینے کی سفارش کرتے۔ نہ عارف رومیؒ کو اپنا مرشدِ معنوی

---

[۱] اقبال کامل صفحہ ۱۰۱

Marfat.com

قرار دیتے اور نہ اُن کے عقاید و حکیمانہ نکتوں کو من و عن اپنے اشعار میں بیان فرماتے حقیقت یہ ہے کہ اکابر صوفیہ وجودیہ نے جن حقائق کا انکشاف کیا ہے۔ انہی حقائق کو علامہ اقبال نے نئے آب و رنگ کے ساتھ ہمارے سامنے بیان کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ کسی نئے فقر و تصوف کے مبلغ ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ "عالم انسانیت" آفات و فتن کے اس نئے دور میں بھی اس کے (یعنی رومیؒ کے) تجویز کردہ "نسخہ شفا" سے اپنے روحانی عوارض کا علاج کرے"۔ وہ یہ نہیں فرماتے کہ اس "نسخہ شفا" میں من مانے طور پر ردّ و بدل کر کے اس کا استعمال کیا جائے۔ نہ علامہ اقبال نے خود اشارۃً یا کنایۃً بھی کہیں ایسا خیال ظاہر کیا ہے۔ بلکہ انہوں نے تو صاف طور پر جاوید نامہ میں اپنے فرزند کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ اگر تجھے "صحبتِ مردِ خبیر" میسر نہ آئے تو پیر رومیؒ کو "رفیق راہ" بنانا۔ معلوم نہیں کہ ان حقائق کی موجودگی میں "بعض محققین" حضرات جنیدؒ و بایزیدؒ، حضرات عطارؒ و سنائیؒ، اقبال کے مرشد معنوی عارف رومیؒ اور دیگر صوفیائے کرام کے عقائد کو مسترد کر کے نئے عقائد بطور "نسخہ شفا" مسلمانوں کے ذہنی اور روحانی امراض کے علاج کے لئے علامہ اقبال کے نام سے کیوں پیش کرتے ہیں۔

ان بزرگوں نے دین کے اساسی اصول ہمارے سامنے رکھ دئیے ہیں۔

من ز قرآں برگزیدم مغز را　　استخواں پیشِ سگاں انداختم
جبہ و دستار و علم و قیل و قال　　جملہ در آبِ رواں انداختم

ان اصولوں میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فروع میں البتہ تبدیلی ہو سکتی ہے بشرطیکہ اصول سے انحراف نہ ہو۔

Marfat.com

اقبال نے جس "تصوف" پر نکتہ چینی کی ہے وہ بدھ مت اور شنکر کا تصوف ہے اور عیسائیوں کی رہبانیت و خانقاہیت ہے۔ اسلامی فقر و تصوف نہیں۔ رہ گئے نام نہاد مسلم "صوفیوں" کے حالات تو ان سے استدلال کر کے نفسِ تصوف کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ نہ علمی بحث میں یہ اصول قابل تسلیم ہو سکتا ہے

اگر اقبال نے "نام نہاد صوفیوں" پر نکتہ چینی کی ہے تو اس سے اکابر صوفیہ کی تنقیص ہرگز مقصود نہیں۔ ان پر تو اکابر صوفیہ خود ہی تنقید کر چکے ہیں۔ بہر حال ہر عمیق نظر اور انصاف پسند محقق یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہے۔ کہ اقبال اکابر صوفیہ کے معتقد ہی نہیں ان کے فقر و تصوف کے زبردست مبلغ تھے۔ زیادہ تر ان ہی کے عقائد سے انہوں نے اپنا نظریہ "خودی" و "قلندری" مرتب کیا ہے۔ اور دورِ حاضر کے مسلمانوں کے ذہنی و روحانی امراض کے علاج کے لئے انہی متقدمین صوفیا کرام، و اولیاء عظام کے عقائد نئے آب و رنگ کے ساتھ پیش کئے ہیں۔

لیکن واضح رہے کہ انہوں نے جو اپنے خطبات میں دقیق فلسفیانہ نکات بیان کئے ہیں وہ عام مسلمانوں کے لئے نہیں ہیں[1] بلکہ یورپ کے فلسفیوں اور دیگر فلسفہ پسند دماغوں کے لئے ہیں تاکہ انہیں فلسفہ کی راہ سے اللہ کی طرف بلایا جائے۔ وہ خود ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

---

[1] حکیم محسن علی صاحب عرشی کو خود اقبال نے یہ جواب دیا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ عام مسلمانوں کے لئے پنج ارکان اسلام کی تنظیم کافی ہے۔ دیکھو "اقبال کامل" ص۲۶۔ نیز میرا مضمون "خودی اور عمل" جو تالیف ہذا میں شامل ہے۔

Marfat.com

اس شعر سے متعلق بال جبریل میں جو حاشیہ ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

"جرمن کا مشہور مجذوب فلسفی نطشہ جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کرسکا اور اس لئے اس کے فلسفیانہ افکار نے اس کو غلط راستہ پر ڈال دیا"۔

فلسفہ کی صحت کی جانچ کے لئے دینی اصول کی مدد تو لے سکتے ہیں۔لیکن دینی اصولوں کی تردید کے لئے فلسفہ سے کام نہیں لیا جا سکتا۔

"اسرار خودی" سے متعلق ڈاکٹر نکلسن کو جو غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں اقبال نے خط لکھ کر دور کیں۔اور اپنا صحیح اسلامی نظریہ واضح کر دیا۔بعض مسلمانوں نے جب یہ خیال ظاہر کیا کہ "مثنوی اسرارِ خودی" اہل مغرب کے فلسفیانہ خیالات کا چربہ ہے تو اقبال نے حضور سرورِ کائنات سے فریاد کی اور ایک نظم میں ان خیالات کا اظہار کیا کہ مسلمان خود اپنی متاع کو نہیں پہچانتے۔میں نے تو انہیں قرآن حکیم سے زندگی کا راز بتایا ہے۔اور یہ مجھ پر الزام لگاتے ہیں کہ میں انہیں افسون فرنگ اور قانون فرنگ کی تعلیم دے رہا ہوں اگر ایسا ہو تو مجھے روز محشر خوار و رسوا فرمائیے اور پائے مبارک کے بوسہ سے محروم رکھئے۔(یہ اشعار بھی تالیف ہذا میں "خودی اور عمل" کے تحت ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں) کیا اقبال کے ان اعترافات کے باوجود یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ انسان کے روحانی ارتقاء کیلئے صوفی صد اولیاء اسلام کے عقائد کے مؤید ہیں۔

امور مندرجہ بالا کے پیش نظر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کا فلسفہ ان کے اشعار ان کی نثر ان کا اسلوب فکر اور طرزِ استدلال وغیرہ جو کچھ ہے سب اسلامی تصوف یعنی اسلام کی معنویت و روحانیت کو حق ثابت کرنے کے لئے ہے۔مخالفین کے غلط خیالات کی اصلاح کے لئے ہے۔معرفتِ حق تعالیٰ اور انسان کے روحانی ارتقاء کے سلسلے میں عقل

Marfat.com

استدلالی کوتاہیوں سے بچنے اور کشف والہام کی اہمیت جتانے کے لئے ہے۔ نیز فلسفہ وحکمت کی بجائے واردات دل اور مکاشفاتِ قلب کی مدد لینے کی تاکید کے لئے ہے۔ .... نہ اس لئے کہ ان کے برعکس راہ اختیار کی جائے۔ اور اقبال کو اولیائے اسلام اور ان کے مسلک کا مخالف ثابت کیا جائے۔

معاشی اور سیاسی اقتدار کی ضرورت اور اس کے لئے قوم کو بیدار کرنے کی کوشش اپنی جگہ بالکل حق ہے۔ کسی کو اس سے انکار نہیں لیکن "منزل ما کبریاست" کو پیام اقبال سے خارج رکھنا اور اس منزل کی طرف لے جانے بلکہ وہاں پہنچا دینے والے مسلکِ اولیاء کو غلط قرار دے کر اس کے مقابلہ میں علامہ اقبال کے نام سے کوئی نیا مسلک پیش کرنا یقیناً علامہ اقبالؒ صوفیائے کرام اور ملتِ اسلامیہ سب کے حق میں زبردست ظلم ہے۔ اقبال تو خود فرماتے ہیں :۔

شنیدم آں چہ از پاکانِ اُمّت
ترا با شوخیٔ رندانہ گفتم

خدارا اس "شوخیٔ رندانہ" کے "کیف وسرور" پر "پاکان امت" کے اصل پیغام کو قربان نہ کیجئے۔

Marfat.com

(۲)

تصوّف اور اقبال

[یہ مضمون رسالۂ اقبال لاہور کے دو شماروں (جلد ۷ شمارہ ۲ اور جلد ۷ شمارہ ۴) میں بالاقساط شائع ہو چکا ہے۔ اور اسے مجلس ترقی ادب' لاہور نے ۵۹-۵۸ء کا بہترین مقالہ قرار دیکر مبلغ پانصد روپے بطور انعام مقالہ نگار کو عطا فرمائے۔]

Marfat.com

٧٨٦

اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ (۸۴-۶)

اپنے پروردگار کی ملاقات کے لئے خوب محنت کر
پس تجھے ملنا ہے اُس سے ——————

حدیث شریف

"البتہ بعض علم دُرِّ مکنون کے مانند ہیں کوئی نہیں جانتا۔ ان کو عارفانِ خدا کے سوا۔ جب وہ عارف اس علم کو بیان کرتے ہیں۔ تو سوائے ان لوگوں کے جو اللہ تعالٰے کی نسبت دھوکا کھانے والے ہیں اور کوئی اس علم سے جاہل نہیں رہتا۔ پس جس عالم (عارف) کو خدا تعالٰی نے اس علم (معرفت حقیقت) میں سے حصہ دیا ہو اس کو حقیر مت جانو کیونکہ اللہ تعالٰی نے اسے حقیر نہیں کیا جب کہ اُسے وہ علم عطا فرمایا۔"

(از عبدالرحمٰن سلمی بروایت حضرت ابوہریرہؓ)

تو اے ناداں دل آگاہ دریاب — بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب
چساں مومن کند پوشیدہ را فاش — ز لا موجود الا اللہ دریاب

(اقبالؒ)

آتش درگیر زد در خس و خاشاک من — مرشد رومی کہ گفت منزل ما کبریاست

(اقبالؒ)

تصوّف اور اقبال

کلام اقبال کا سرسری مطالعہ کرنے والے عموماً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تصوف کے متعلق علامہ اقبال کے خیالات متضاد ہیں۔ یا اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ تصوف کے خلاف ہیں اسی طرح علامہ کے تبصرہ نگاروں اور ان کے کلام کی شرح کرنے والوں کے خیالات میں بھی اختلاف ہے۔ جس کی وجہ زیادہ تر وہی تضاد ہے جو علامہ کے کلام میں نظر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر مفکر کی طرح علامہ اقبال کے افکار و نظریات بھی تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ بالخصوص تصوف کے متعلق ان کے جو خیالات "اسرار و رموز" کی تصنیف سے پہلے تھے۔ وہ "اسرار و رموز" میں نہیں ملتے۔ اسی طرح "اسرار و رموز" میں "فقر و قلندری" کی بابت اظہار خیال نہیں کیا گیا۔ "فقر و قلندری" کی پرزور وکالت "اسرار و رموز" کے بعد شروع ہوئی۔ اور ایسا ہونا ضروری بھی تھا۔ کیونکہ تحقیق کے نئے نتائج کی روشنی میں ہر مفکر کی پرانی رائے کا بدلنا ضروری ہے۔ اب یہ تبصرہ نگار کا فرض ہے کہ وہ علامہ کے خیالات کا مطالعہ زمانۂ اظہار خیالات کے مطابق کرے۔ اور مسلّمہ اصول کے مطابق ان کی آخری رائے کو اہم ترین قرار دے۔

اسلام علمی، سیاسی، تمدنی، اخلاقی کسی قسم کی ترقی کو منع نہیں کرتا۔ لیکن وہی اسلام ہمارے سامنے یہ اصول بھی رکھتا ہے کہ ہمارا مرنا اور جینا سب کچھ اللہ کے لئے

ہونا چاہیئے۔ اور اسی اسلام نے ہم پر عبادت بھی فرض کی ہے جو "خدا تک پہنچنے" کا ایک خاص ذریعہ ہے۔ قرآن پاک میں سرکارِ دو جہاں صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جاتا ہے۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (۹۶ — ۱۹) سجدہ کر اور نزدیک ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّبَنُوْنَ — وہ دن جب نہ مال کام آئے گا نہ اولاد
اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ — مگر وہ جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آیا۔

(۲۶ — ۸۸ و ۸۹)

نیز ارشاد ہوتا ہے :۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ — بے شک اس نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس کو
قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا — پاکیزہ کیا اور بے شک وہ ناکام رہا جس نے اُسے بگاڑ دیا۔

(۹۱ — ۹ و ۱۰)

— ان صاف اور صریح احکام کے پیش نظر بعض مسلمانوں نے تزکیہ نفس، تطہیر قلب اور عبادت و ریاضت ہی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ جیسا کہ خود رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اصحابِ صفہ نے کیا تھا۔ چنانچہ اسلامی تصوف اس موضوع سے بطور خاص بحث کرتا ہے کہ تزکیۂ نفس، تطہیر قلب، اور عبادت کے ذریعہ انسان کس طرح خدا کا مقرب بن سکتا ہے۔ نیز وہ وضاحت کرتا ہے کہ اکابر صوفیہ اور اولیاء اللہ نے عبادت، قلب، تطہیر قلب۔ قرب و معیتِ الٰہی۔

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللّٰهِ تَعَالٰى

اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِيْنَ

وجود ہستی، فنا و بقاء اور ہجر و وصال وغیرہ سے کیا مراد لی ہے۔ اور قرب الٰہی حاصل کرنے کے کیا اصول و قواعد مقرر کئے ہیں۔

۔ اسلامی تصوف کے جو یا بعض اوقات فلسفیانہ موشگافیوں، حکمت الاشراق کی گتھیوں۔ توحید کے بعض اختلافی نظریوں۔ عجمی فلسفیوں سے مستعار لی ہوئی بعض اصطلاحوں اور ان کی غلط یا مبہم تشریحوں اور اسی قسم کی دیگر غلط فہمیوں میں کچھ اس طرح الجھ جاتے ہیں کہ اسلامی تصوف کی صحیح تعریف' اس کا اصل مقصد اور اس سے متعلق ضروری عقائد کا پتہ لگانا ان کے لئے نہ صرف محال ہو جاتا ہے بلکہ بعض اوقات وہ یہ غلط رائے قایم کر لیتے ہیں کہ تصوف اسلام کا حقیقی جزو نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ماخذ فلاطونی۔ نو فلاطونی اور ہندی فلسفے ہیں۔ یا اس میں سیاست مُدن۔ جنگ و جدل۔ تجارت و زراعت۔ صنعت و حرفت وغیرہ کے اصولوں اور طریقوں کا ذکر نہ پاکر اس پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ زندگی سے فرار یا رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ یہ تمام امور اس کے دائرۂ بحث ہی سے خارج ہیں وہ نہ ان امور سے بحث کرتا ہے۔ نہ ان کا مخالف ہے۔ تصوف سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ہمیں مذکورۂ بالا امور میں کامل بنادے گا ایسا ہی ہے جیسے کوئی آم کے درخت سے امرود پیدا کرنے یا ڈاکٹر سے تعلیم نجاری کی توقع رکھے۔

= اسلام "خلافت" اور "ملوکیت" میں امتیاز کرتا ہے۔ خلافت میں حاکمیت اور مالکیت اللہ تعالےٰ کی امانت سمجھی جاتی ہے۔ اور اسے خلق اللہ کی خدمت اور دین اللہ کے قیام کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ملوکیت کو ان امور سے کوئی واسطہ نہیں۔ آج کل اس نے عوام کو فریب دینے کے لئے جمہوریت، قومیت اور وطنیت کے نقاب چہرے پر ڈال رکھے ہیں "خلافت الٰہیہ" کی بنیاد "تقرّب الی اللہ" پر قائم رہتی ہے۔ اور انتظام حکومت ایسے افراد کے ہاتھوں

ہیں رہتا ہے۔ جو اللہ کے مقرب ہوتے ہیں۔ اس لئے خلافتِ راشدہ، واقعۂ کربلا کے بعد بلکہ اس سے پہلے ہی امام حسنؓ کی دست برداری کے وقت سے ختم ہوگئی۔ اس کے بعد "خلافت" کے نام سے دراصل دنیاوی امارت یا ملوکیت قائم رہی۔ کیونکہ نئی نئی فتوحات، باہمی رقابت اور نفس پرستی و نفسانیت کی شدت نے لوگوں کو رجوع الی اللہ کا موقع نہیں دیا۔ علامہ اقبال ملوکیت کے خلاف اور "خلافت فی الارض" کے حامی ہیں۔ لیکن خلافتِ راشدہ کی ہم رنگ حکومت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک ملت میں ایسے افراد کی کثرت نہ ہو۔ جنہوں نے سلوک و طریقت کی عملی تربیت کے ذریعہ نفس پر قابو حاصل کر لیا ہو۔ اور جن کا مقصدِ حیات صرف اللہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تعلیم و تربیت کے ذریعہ شخصیتیں ہی تیار کی تھیں۔ اور خلافتِ راشدہ کی کامیابی انہی مایۂ ناز اصحابِ رسولؐ کے حُسنِ انتظام اور خلوصِ عمل کا نتیجہ تھی۔ اور اس کی بربادی ان افراد کے ہاتھوں ہوئی۔ جن کے قلب و نظر پر دنیا غالب آچکی تھی۔

اسی طرح "رہبانیت" یا "خانقاہیت" اور "اسلامی اعتکاف و تقوی" میں فرق ہے زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے خود زندگی سے فرار کا اصول بطور مذہب اختیار کرنے کا نام رہبانیت ہے۔ اور وہ عیسائیت کا ایک جزو ہے (اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ البتہ اعتکاف یا عارضی گوشہ نشینی ہے وہ چند روزہ ہوتی ہے تاکہ کسی برائی کے استیصال کے لئے ضروری تیاری کی جائے۔ اور پاکیزہ تر اور قوی تر نفس کے ساتھ زندگی کی برائیوں کا مقابلہ کیا جائے یا کبھی اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سکونِ قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور اللہ کی طرف پوری توجہ مرکوز رکھنے کی عادت پڑ جائے اس طرح روح کو بہت جلد بلندی نصیب ہوتی ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا غارِ حرا میں معتکف و مراقب رہنا۔ ماہِ رمضان میں مسلمانوں کا معتکف ہونا۔ عبادت کے لئے مساجد اور دیگر خاموش اور پاکیزہ مقامات کا استعمال۔ یا امتحانات اور اہم منصوبوں کی تیاری کے لئے تنہائی اختیار کرنا وغیرہ وغیرہ اسی ضمن میں آتا ہے۔ ان امور پر "زندگی سے فرار" کا ٹھپہ نہیں لگایا جا سکتا۔ حتیٰ کہ معاشرے کے اخلاق سوز عناصر یا ماحول سے شریف، متقی اور پرہیزگار اشخاص کی کنارہ کشی کو بھی ہم زندگی سے فرار یا رہبانیت نہیں کہہ سکتے۔ رہبانیت دراصل ایک مذہبی عقیدہ ہے جس میں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ جنگل میں زندگی بسر کرنے سے زندگی کی مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ نیز یہ کہ راہب ہی خدا کا مقرب ہوتا ہے۔ لیکن اسلامی تصوف کو اس عقیدے سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ صوفیائے کرام کی خانقاہیں روحانی تعلیم و تربیت کے مراکز اور کامل توجہ کے ساتھ عبادت الٰہی کرنے کے لئے پر سکون ماحول رکھنے والے مقامات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اب پاکستان اور ہندوستان میں بعض خانقاہیں ختم ہو چکی ہیں۔ اور بعض کی حالت ایسی ہے جیسے اصل صاحب خانہ یا مخلص منتظم کے نہ ہونے سے لاپروا کرایہ داروں یا نااہل منتظموں کے ہاتھوں کسی عمارت، ادارے یا مدرسہ کی ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض خانقاہیں اب بھی رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہیں جہاں سے طالبانِ حق یقیناً فیض یاب ہوتے ہیں۔

اسی طرح غیر مسلموں کی باطنیت یا سریت اور اسلامی باطنیت و روحانیت (تصوف) میں بھی بڑا فرق ہے۔ غیر مسلموں کی باطنیت یا سریت کو عموماً MYSTICISM کہتے ہیں۔ لیکن اسلامی تصوف تو شریعت، طریقت، معرفت اور حقیقت کا مجموعہ ہے اور لفظ MYSTICISM سے یہ خصوصیت واضح نہیں ہوتی۔ مستشرقین نے ہر جگہ اسلام

Marfat.com

اور اسلامی تصوف کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس کی وجہ لاعلمی سے زیادہ ان کا فطری تعصب ہے۔ بہرحال انگلش مسٹی سزم اور ہمارا تصوف ہرگز ایک چیز نہیں ہے کیونکہ غیر مسلموں کی باطنیت میں شریعت اسلامی اور شارع اسلام علیہ السلام پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے اور رہبانیت اس کا بنیادی عقیدہ ہے۔ لیکن یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسلامی تصوف میں رہبانیت نہیں ہے۔ اور اس کی بنیاد قرآن و سنت پر قائم ہے۔ دونوں کو خلط ملط نہ کرنا چاہیئے۔ انگریزی میں اسلام اور اسلامی تصوف کے مترادف الفاظ نہیں ہیں۔ اسی طرح ہماری سینکڑوں اصطلاحات کے لئے انگریزی میں موزوں الفاظ نہیں ہیں اور نہ ترجمہ سے ان کا صحیح مفہوم ادا ہوتا ہے۔ انگریزوں کے پاس ایک لفظ MYSTICISM تھا (جس کے معنے سریت کے ہیں) اور اسی سے انہوں نے ہمارے تصوف کا تصور قائم کیا اور جس طرح انہوں نے اسلام کو CHRISTIANITY کی طرز پر MOHAMMADNISM کہا تھا اسی طرح وہ اسلامی تصوف کو بھی اپنی باطنیت یا سریت سمجھ بیٹھے۔ غضب یہ ہوا کہ ہمارے مترجمین نے بھی تصوف کا ترجمہ مسٹی سزم کر دیا اور جتنے اعتراضات غیر مسلموں بالخصوص عیسائیوں کی باطنیت یا سریت یا رہبانیت پر ہو سکتے تھے وہ سب اسلامی تصوف کے سر منڈھ دیئے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ بعض مسلم مفکرین، اور بلند پایہ مسلم مصنفین کی کتابوں میں بھی ابھی تک لفظِ تصوف عیسائی باطنیت کے معنوں میں لکھا جاتا اور بلا تحقیق دونوں کو ایک ہی سمجھا جاتا ہے وجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ اس لئے مستشرقین یورپ کی ہر بات کو صحیح اور اپنے علماء و محققین کی ہر بات کو غلط سمجھتے ہیں۔ ورنہ صحیح عقیدہ اس امر کا متقضی ہے کہ جن معنے میں تورات، زبور اور انجیل کے آسمانی کتب ہونے کے باوجود قرآن پاک کو تمام کتب و صحائف سماوی

Marfat.com

کا اور اسلام کو جملہ ادیان کا ناسخ سمجھا جاتا ہے۔ انہی معنوں میں اسلامی روحانیت یا تصوف کو بھی جو اسلام کا حُسن و جمال ہے بلکہ اس کا کمال ہے۔ غیر اسلامی باطنیت کا ناسخ سمجھا جائے۔

یہ ضرور ہے کہ اسلامی تصوف اور دیگر اقوام کے تصوف میں بعض اصطلاحات مشترک ہیں لیکن ضروری نہیں کہ دونوں کا مفہوم بھی ایک ہو۔ مثلاً مسجد اور گرجا دونوں عبادت گاہیں ہیں۔ اور دونوں جگہ عبادت کی جاتی ہے۔ روزے بھی متعدد اقوام میں رکھے جاتے ہیں۔ لیکن ہماری نظر میں جو مفہوم مسجد، عبادت (نماز) اور روزے کا بلحاظِ اسلام ہے۔ وہ گرجا، اس میں ہونے والی عبادت اور دیگر اقوام کے روزوں کا ہرگز نہیں لہٰذا جہاں تک اسلامی تصوف اور اس کی اصطلاحات کا تعلق ہے۔ ان کا مفہوم وہی لینا چاہیئے جو اکابر صوفیہ نے معین کیا ہے۔ مخالفین اسلام کے اصطلاحی الفاظ، معانی یا اعتراضات کو ذہن میں رکھ کر اسلامی تصوف پر اعتراضات کرنا زبردست اصولی غلطی ہے۔

عیسائی مبلغین تو بالعموم یہی کہتے ہیں۔ کہ اسلام اور اسلامی تصوف کے سرچشمے عیسائیت اور فلاطونیت ہیں۔ لیکن یہ غلط پروپیگنڈا بھی اسلام اور اسلامی تصوف کی قدر و قیمت گھٹانے کی نیت سے کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی نظر کم از کم مندرجہ ذیل دو آیات قرآنی پر رہنا چاہیئے۔ تاکہ وہ دشمنانِ اسلام کے پروپیگنڈے اور اس کے فریب سے محفوظ رہیں۔

(۱) اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط (پ ۶ ۔ سورۃ مائدہ)

ترجمہ :۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمت

Marfat.com

پوری کر دی۔ اور میں نے تمہارے لئے مذہب اسلام پسند کیا۔

(۲) وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ط (لقمان)

ترجمہ :۔ اور پوری کر دیں ہم نے تم پر اپنی ظاہری و باطنی نعمتیں،

اسلام کی تکمیل بنی نوع انسان کے لئے ایک نعمت تھی۔ اس کا ذکر آیت ۱ میں کیا گیا ہے۔ اور نعمتوں کی دو بڑی قسمیں (ظاہری و باطنی) آیت ۲ میں مذکور ہیں اسلامی تصوف باطنی نعمتوں کے حصول کے طریقے بتاتا ہے اور ظاہری نعمتوں سے بحث نہیں کرتا۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ باطنی نعمتوں کے متعلق بھی ضروری تفصیلات معلوم کرے۔ اور انہیں حاصل کرے۔ اس کے لئے اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ وہی اس گرانقدر علم و فن کے اصل ماہر اور ان نعمتوں کی لذتوں سے عملی طور پر مستفیض ہوتے ہیں۔

یہ نکتہ ملحوظ رہے۔ کہ باطنی نعمتیں حاصل کرنے کا مطلب ظاہری نعمتوں کی مخالفت نہیں ہے۔ لیکن جب تک فضائلِ قلبی حاصل نہ ہوں۔ انسان ظاہری نعمتوں کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اس لئے پہلے باطن کی اصلاح اشد ضروری ہے۔

صوفیائے کرام کے عقیدے کے مطابق دین اللہ کے دو رُخ ہیں۔ ایک انسان کے ظاہری اعمال سے متعلق ہے۔ جسے شریعت کہتے ہیں۔ اور دوسرا انسان کے باطن اور اس کے باطنی اعمال سے متعلق ہے۔ جو طریقت، معرفت اور حقیقت کا مجموعہ ہے دین اللہ کی یہ شق شریعت ظاہری کا باطن ہے۔ اس کے خلاف نہیں (جیسا کہ بعض اوقات غلطی سے سمجھا جاتا ہے) اور دونوں کا سرچشمہ قرآن و سنت اور علماءِ حق کا اجماع ہے۔

Marfat.com

لیکن ظاہر پرست مسلمان دین اللہ کے باطنی پہلو، اسرار و رموز کے منکر ہیں۔ ان کی آگاہی کے لئے مختصراً عرض ہے۔ کہ ہمارے دین میں ابتداء سے انتہا تک ظاہر و باطن کے جلوے موجود ہیں۔ مثلاً ایمان لانے کے سلسلے میں اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ کے ساتھ تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ کی شرط ہے۔ طہارتِ ظاہری کے ساتھ قلب کو کفر و نفاق اور شرک سے پاک کرنا ضروری ہے۔ آیات قرآنی کے معنے ظاہری بھی ہیں[۱] باطنی بھی۔ مثنوی میں تو ایک سے زیادہ بطنِ معنے کا ذکر ہے۔ قرآن پاک باطنی نعمتوں کی تصدیق کرتا ہے۔ "سورۂ لقمان" کی آیت ۲۰ پہلے مذکور ہو چکی ہے۔ اولیاء کرام نے تمام ارکان اسلام کے باطنی معانی و نکات بیان کرنے کے سلسلے میں متعدد رسائل تحریر کئے ہیں۔

صحابہ کرامؓ میں جو اسرارِ دین ایک کو تعلیم ہوئے دوسرے کو نہیں ہوئے۔ (کیونکہ اسرار دین حسب استطاعت تعلیم کئے جاتے ہیں) حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کو اسرار دین کی تعلیم کی بناء پر ہی سرکارِ دو جہاں صلے اللہ علیہ وسلم نے "بَابِ عِلْم" فرمایا اور اسرارِ دین کی بناء پر ہی حضرت حُذیفہؓ کو صاحبِ سِرّ رسول اللہ کہا جاتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا قول ہے۔

(۱) قُلُوْبُ الْاَبْرَارِ قُبُوْرُ الْاَسْرَارِ

یعنی اولیاء اللہ کے قلوب اسرارِ الٰہی کی قبریں ہیں۔

نبوت ظاہر اور ولایت راز ہے۔

---

[۱] اِنَّ لِلْقُرْآنِ ظَاهِرًا وَّبَاطِنًا وَّحَدًّا وَّمُطَّلَعًا ۔
یعنے قرآن شریف کا ایک ظاہر ہے، ایک باطن اور ایک نہایت مقام ترقی ہے۔
(ابن حبان — بروایت ابن مسعود)

Marfat.com

(۲) اَوْلِیَائِیْ تَحْتَ قَبَائِیْ لَا یَعْرِفُہُمْ غَیْرِیْ

اولیاء میری چادرِ قباء کے نیچے مستور ہیں۔ انہیں میرے سوا کوئی نہیں پہچان سکتا۔ شاہد ہے۔

قرآن پاک میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام اور حضرتِ خضر کا قصہ موجود ہے۔ جس میں الفاظ وَعَلَّمْنَاہُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا[1] استعمال ہوئے ہیں۔

مسائل معرفت و حقیقت سب اسرار کے ضمن میں آتے ہیں۔ حضرت امام زین العابدینؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان تک دو علم پہنچے۔ ایک وہ جو ظاہر کیا گیا۔ دوسرا وہ جس کے اظہار پر یہ اندیشہ تھا کہ جہلاء انہیں قتل کر دیں گے۔ یہ اسرار ہی تھے۔ حضرت سُہیل تستریؒ کا قول ہے۔ کہ عالِم یعنی عارف کو تین علم عنایت ہوئے ہیں۔ (۱) علم ظاہر یعنی شریعت کہ عوام کو تعلیم ہوتا ہے۔ دوم علمِ باطن یعنی طریقت جو صرف انہیں تعلیم کیا جاتا ہے جو اللہ کے طالب اور اس کے اہل ہوں۔ سوم علم معرفت (تصوفِ اسلامی کا اعلیٰ و افضل مرتبہ) ہے۔ اسی کو فقر و غنا بھی کہتے ہیں۔ یہ رازِ الٰہی ہے۔ اس کے بغیر حکم خاص کی تلقین نہیں کر سکتا۔[2]

علامہ اقبالؒ بھی خودی کا سرِ نہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہہ کر "اَنَا" کی تربیت پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔ "بالِ جبریل" میں ایک جگہ فرماتے ہیں:-

---

[1] سورۂ کہف آیت ۶۵ اور جسے ہم نے اپنا خاص علم سکھایا
یہ یاد رہے کہ یہ علم حضرت موسیٰؑ سے زیادہ، حضرت خضر کو عطا ہوا تھا۔ جیسا کہ اس قصہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

[2] یہ قول متعدد کتب تصوف میں موجود ہے

Marfat.com

حکیمی نامسلمانی خودی کی

کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی

اس کے علاوہ پچاسوں اشعار میں اسرارِ دین کا ذکر مختلف صورتوں میں موجود ہے۔ فلسفۂ خودی پر سب سے زیادہ مشہور مثنوی کا نام ہی "اسرارِ خودی" رکھا اور انسان کی بابت فرماتے ہیں :-

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خُدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن
زمانہ روزِ ازل سے رہا ہے محوِ خرام
مگر یہ اس کی تگ و دَو سے ہو سکا نہ کہُن
اگر نہ ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ آدم نہ روح ہے نہ بدن

دین ہی پر کیا موقوف ہے۔ انسان کا ہر فعل اور دنیا کا ہر انقلاب پہلے باطن میں واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔ جو ظاہر سے زیادہ قوت، گہرائی اور اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح شریعت کا بھی ایک باطن ہے جسے طریقت کہتے ہیں۔ ان معنے میں شریعت جسم ہے اور طریقت جان، شریعت قلعہ ہے اور طریقت خزانہ۔ قلعہ کے بغیر خزانہ کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ اس سے ایک کی کمتری اور دوسرے کی برتری ہرگز مقصود نہیں۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ دونوں کی باہمی نسبت اور اہمیت کیا ہے۔

طریقت میں خاص طور پر وجودِ حقیقی۔ حقیقت انسانیہ اس کے عروج اور حصولِ

قربِ الٰہی وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ اور شروع سے آخر تک اس کا تعلق حقیقتِ محمدیؐ اور تعلیمات محمدیؐ سے قائم رہتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوجائے گا۔ کہ ہمارے تصوف کا تعلق الف سے یٰ تک اسلام سے ہے[1]۔ اور عیسائی راہبوں کی باطنیت کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ جو محققین وحی الٰہی اور سرکارِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔ ان کی رائے ہمارے تصوف کے بارے میں قابلِ قبول نہیں ہوسکتی ہے۔ اس معاملہ میں قرآن پاک ہماری تائید یوں کرتا ہے۔

(۱) إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ط[1]

بے شک حق کی تلاش میں ظن و تخمین سے کام نہیں چلتا۔ سورۂ نجم۔ آیت ۲۸

(۲) فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ ج

پس جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ (پ ۸)

لہذا ثابت ہوا کہ ہدایت وہی ہے جو فضل ایزدی، اسلام اور شرح صدر پر مشتمل ہو۔ جو منکرین۔ خدا، رسول اور اسلام پر ایمان نہ لائے ہوں۔ اور شریعتِ اسلامیہ کے پابند نہ ہوں۔ انہیں نہ ہم ہدایت یافتہ سمجھ سکتے ہیں۔ نہ ان کی وجدانیات کے قائل ہوسکتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ معاملہ۔ تلاش حق اور اسلام سے متعلق ہے۔ اسی لئے اس میں غیر مسلموں کے انکشافات اور الہامات اور ہمارے صوفیائے کرامؒ و اولیائے عظامؒ کے مکاشفات و مشاہدات میں فرق کرنا ضروری ہے۔

---

[1] نرے فلسفیانہ خیالات جن کی تائید قرآن، سنت اور اجماع سے نہ ہو۔ اسی زمرے میں آتے ہیں۔ سورۂ نجم کی آیت ۲۳ بھی پڑھیے۔

اب اسلامی تصوف اور فقر و طریقت کی دیگر ضروری تفصیلات بیان کیجاتی ہیں۔

تصوف کی لفظی تحقیق میں ضرور اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے معنی و منشاء کے تعین میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام کے متعدد شعبے ایسے ہیں جن کا معنوی وجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ضرور تھا لیکن وہ نہ مدون ہوئے تھے نہ اس وقت تک ان کے لئے یا ان سے متعلقہ مسائل و امور کے لئے اصطلاحی الفاظ تجویز ہوئے تھے۔ مثلاً الفاظِ حافظ۔ قاری۔ محدّث۔ فقیہ یا علم تجوید۔ حدیث اور فقہ سے متعلق تمام اصطلاحات یہ سب بعد کی ایجادات ہیں۔ اسی طرح فقر و تصوف موجود تو تھے لیکن الفاظ صوفی اور تصوف کا تعین کچھ عرصہ بعد ہوا جب کہ اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔

آنحضرت صلعم کے زمانہ میں لفظ صحابیؓ ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے بعد تابعینؓ، پھر تبع تابعینؓ کا دور رہا۔ ان کے بعد جب فتنہ و فساد کا زور زیادہ ہوا۔ اور دنیا پرست مسلمانوں کی کثرت ہوگئی تو متقیوں۔ پرہیز گاروں اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والوں کو لوگ "صوفی" کے لقب سے یاد کرنے لگے۔ تاکہ حق پرستوں اور دنیا پرستوں میں امتیاز پیدا ہو جائے۔ تصوف کی تعریف اور اس کی امتیازی خصوصیات کے متعلق قدیم و جدید اکابر صوفیاء کی کتابوں میں بے شمار اقوال موجود ہیں۔ جنکے اعادہ کی اس مختصر مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ لیکن ان سب کا خلاصہ یہی ہے۔ کہ تزکیۂ نفس اور تطہیر قلب کے ذریعہ قُربِ الٰہی حاصل کرنے کا نام تصوف ہے۔ حصولِ قُرب کی کوشش اس تعریف سے خارج نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اسے علم باطن یا علمِ قُرب بھی کہتے ہیں۔

Marfat.com

(۱) تزکیۂ نفس سے مراد نفس کو اخلاق ذمیمہ سے پاک کرنا ہے۔ (یہ معاشرہ کے درمیان نیک نفس انسان بن کر رہنے سے متعلق ہے)

(۲) تطہیر قلب سے مراد یہ ہے کہ قلب کو کفر و نفاق اور ہر قسم کے فسق و فجور سے پاک کیا جائے۔ اور اسے ایمان بِالغَیب[۱] اور صحیح توحید سے آراستہ کیا جائے (یہ اللہ اور دین اللہ کے حقوق ادا کرنے سے متعلق ہے)

(۳) حصول قُرب سے مراد قلب کو غیر اللہ کے وہم سے خالی کرنا اور اُسے توحید ذاتی سے آراستہ کرنا ہے۔ تاکہ ہم صحیح معنوں میں "مُوحّد" بن کر قُرب الٰہی کی اعلیٰ منزل پر فائز ہو سکیں۔ اس منزل میں "صوفی فانی بخویش باقی بحق" ہو جاتا ہے۔ اسی کو فقر کہتے ہیں۔ اور اسی پر حضور اکرمؐ نے فخر کیا ہے۔ (اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ۔ تفصیل آگے ملیگی)

مومن کا ارتقائے روحانی انہی مراحل سے گزرتا ہے۔ اس میں معاشرے کو ترک نہیں کیا جاتا۔ (ناموافق حالات سے بچنا بے شک جائز بلکہ ضروری ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ) اسلامی تصوف میں افراد معاشرہ کو اسلامی اصولوں کے مطابق تزکیۂ نفس اور تطہیر قلب کی تربیت دے کر "خلیفۃ اللہ فی الارض[۲]" (نفس پرست حاکم فی الارض نہیں) اور بشرط طلب و ہمت مقرب الٰہی بننے کے قابل بنایا جاتا ہے۔ شوق و طلب میں آگے بڑھنا۔ اور ہمت سے کام لے کر منزل مقصود تک پہنچنا خود سالک و طالب کا کام ہے۔

اگر ہمارا یہ عقیدہ صحیح ہے (اور یقیناً صحیح ہے) کہ جملہ انبیاء کرامؑ نے اللہ تعالیٰ

---

[۱] تصوف میں غیب و شہادت سے عموماً عالم تنزیہ اور عالم تشبیہ مراد ہوتے ہیں۔

[۲] تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

Marfat.com

کے بندوں کو اسلام (بمعنی توحید[1] وحصولِ اخلاقِ الٰہیہ) ہی کی دعوت دی ہے جس کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہوئی تو یہ دعویٰ بھی صحیح ہے۔ کہ تصوف اسلامی کا وجود شروع زمانۂ بعثت انبیاء سے دنیا میں موجود ہے۔ اور وہ بھی اسلام کے ساتھ ساتھ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔ اور جب ہم قرآن پاک کی آیت وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (اور تمام اقوام کے لئے ہادی ہیں۔) (سورۂ رعد۔ آیت ۷) پر ایمان رکھتے ہیں تو اس بات پر بھی کیوں ایمان نہیں رکھتے کہ ان میں بھی توحیدِ الٰہی۔ اخلاق و روحانیت و صفائے باطن کی تعلیم کے کچھ نقوش ضرور باقی ہوں گے۔ لہذا اگر ہمارے مذہب و مسلک (اسلام و تصوف) سے ملتے جلتے بعض خیالات وعقائد دیگر ممالک یا اقوام میں نظر آئیں۔ تو ہم خود اپنے اسلام یا تصوف سے بدظن کیوں ہو جائیں۔ اور اس پر ویدانتی تعلیم۔ فلاطونیت اور عجمیت کا لیبل لگا کر اُسے مسترد کیوں کریں؟ کیا اسلام میں ایسے احکام نہیں ہیں جن میں دیگر مذاہب کے احکام سے مماثلت و مشابہت پائی جاتی ہے۔ تو کیا اس بناء پر آپ اُسے بحیثیت مجموعی مسترد کرنے یا اس امر کا اعتراف کرنے کے لئے تیار ہیں۔ کہ وہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ الہامی و منفرد مذہب نہیں۔ بلکہ مختلف اقوام یا ممالک کے چند احکام کا مجموعہ ہے۔ یہ تو اس طالب علم کی مثال ہوئی جو حصولِ علم کی تکلیف سے بچنے کے لئے ایسے بہانے تراشتا ہے۔ جو

---

[1] توحید باری تعالیٰ نہایت نازک مسئلہ ہے۔ اس میں ذراسی لغزش کفر و شرک تک پہنچا سکتی ہے۔ اس لئے صوفیائے کرام نے اس کی جانب پوری توجہ کی ہے۔ اور کامل تحقیق سے کام لیا ہے۔ ان کی مدد کے بغیر مسئلہ توحید اچھی طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ آئندہ صفحات میں ایک جگہ اس کی قسمیں مع مختصر تعریف بیان کی گئی ہیں۔ دراصل اسی مسئلہ کی تحقیق و تشریح اسلامی تصوف کی جان ہے۔

Marfat.com

معقول نہ ہوں۔ بہر حال یہ نظریہ کہ اسلامی تصوف میں بعض یا تمیں بظاہر[1] ویدانتی، فلاطونی، نوفلاطونی۔ احکام یا نظریات کے متماثل ہیں۔ اس لئے اسے اسلام ہی سے کوئی تعلق نہیں ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اس موضوع پر مزید روشنی آئندہ سطور میں بھی مناسب مواقع پر ڈالی گئی ہے۔

مکارم اخلاق کی بابت سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :۔

إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ

مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔

اور قرآن پاک میں ہے :۔

يُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (سورۂ جمعہ آیت ۲)

وہ تمہارے نفوس کا تزکیہ کرتا اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

صوفیائے کرام نے "کتاب" سے یہاں احکام "شریعت" اور "حکمت" سے علم قرب الٰہی مراد لیا ہے۔ اس کی تائید دیگر آیاتِ قرآنی اور احادیث نبویؐ سے ہوتی ہے۔ لیکن تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔

قرب و حصولِ قرب کے ثبوت کے لئے آیت وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (سجدہ کرو اور نزدیک ہو جاؤ سورۂ علق آیت ۱۹) کافی ہے۔

مزید ثبوت کے لئے سورۂ واقعہ ملاحظہ ہو جس میں تین جماعتوں کا ذکر ہے :۔

---

[1] بظاہر اس لئے کہ اس میں حقیقتاً ہر بنیادی حکم و عقیدہ قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔ یا اُسے علمائے حق (اولیاء اللہ) کے اجماع کی تائید حاصل ہے۔ ترجموں میں بعض الفاظ مشترک ملتے ہیں۔ اس لئے معنوی مماثلت کا دھوکا ہوتا ہے۔

Marfat.com

(۱) اصحاب یمین ۔ (۲) اصحاب شمال اور (۳) مقربین

علم دین کی پیروی یعنے اعمالِ صالحہ اور معاصی کے لحاظ سے پہلی دو جماعتیں ہیں۔ اور ذاتِ الٰہی وحصول قرب کے لحاظ سے تیسری جماعت یعنے مقربین کا ذکر ہے۔ اصحاب یمین کو جو احکامِ الٰہی کے پابند ہوں گے ۔ فَسَلَامٌ لَّکَ (پس سلام ہے تجھ پر پ۲۷ ۔ ع۱۶) کی خوشخبری سنائی گئی ہے ۔ اصحاب شمال کو جن کی زندگی ضلالت اور گمراہی میں گزری ہوگی ۔ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ (پس ان کی مہمانی گرم پانی سے ہوگی ۔ اور وہ جہنم میں داخل کئے جائیں گے ۔ ۲۷/۱۶) کی وعید موجود ہے۔ اور مقربین کے لئے روح و ریحان وجنتِ نعیم (پ۲۷) یعنے راحت، روزی اور آزادی کی بشارت دی گئی ہے ۔ ظاہر ہے کہ عشاقِ الٰہی کو دیدار الٰہی کی نعمت سے زیادہ راحت اور کس چیز سے مل سکتی ہے ۔ لقاءِ حبیب ہی ان کا رزق ہوگا ۔ اور نہایت آزادی کے ساتھ وہ اُن نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے ۔

صوفیائے کرام کے بیانات سے واضح ہوتا ہے ۔ کہ تصوف کے چار درجے ہیں ۔ شریعت ۔ طریقت ۔ حقیقت اور معرفت ۔ حضرت امام غزالیؒ نے اس کی تشبیہ اخروٹ سے دی ہے ۔ یعنے جس طرح اخروٹ میں پوست ۔ استخواں ۔ مغز اور روغن ہوتا ہے جو ایک دوسرے کے لئے لازم اور ملزوم ہیں ۔ اور جن میں روغن اہم ترین ہے ۔ اسی طرح شریعت ۔ طریقت ۔ حقیقت اور معرفت کا حال ہے ۔ چاروں ایک دوسرے سے مربوط ہیں ۔ اور ان میں جادہ و منزل دونوں موجود ہیں ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ پ۲۷ ع۳

اور نہیں پیدا کیا ہم نے جن وانس کو مگر عبادت کے لئے ۔

Marfat.com

عُرفاء کہتے ہیں کہ یہاں "عبادت" سے مراد معرفت ہے۔ جس کا پھیلاؤ عرفانِ نفس سے عرفانِ الٰہی تک ہے۔ بلکہ آخر الذکر کا دار و مدار اول الذکر پر ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کا قول مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کافی مشہور ہے۔ اور اس پر صوفیائے کرام کا ایمان ہے۔ ان کے عقیدے کے بموجب "معرفت" یہ ہے۔ کہ توحید وجودی سالک کا حال بن جائے۔ اور وہ "ہمہ اوست" "ہمہ از دست" "ہمہ در دست" وغیرہ سب پر حاوی ہے۔ بلکہ حقیقت و معرفت کی منزل میں "ہمہ" کا خیال بھی غلط ہے اس منزل میں فقط "ھُوْ" ہے۔ چنانچہ حضرت منصور حلّاج کے بارے میں ایک شاعر کہتا ہے :۔

حضرتِ منصورؒ کہتے ہیں انا بھی حق کے ساتھ
دار تک تشریف لے جائیں جو اتنا ہوش ہے

اور حضرتِ اقبال بھی اس کے قائل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

مٹا دیا میرے ساقی نے عالَمِ مَن و تُو
پلا کے مجھ کو مئے لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوْ

ایک جگہ یہ ارشاد ہوتا ہے :۔

جہانِ دل جہانِ رنگ و بُو نیست
در او پست و بلند و کاخ و کُو نیست
زمین و آسمان و چار سُو نیست
دریں عالم بجز اللہ ھُو نیست

واضح رہے کہ اس منزل میں "عبد"۔ اللہ نہیں بن جاتا۔ بلکہ "عبد" رہتا ہی نہیں

Marfat.com

اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے۔ ان معنے ہیں کہ صفاتِ عبدی صفاتِ حق میں محو ہوجاتی ہیں
آیاتِ قرآنی۔ مثلاً فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ[1] — وَمَا رَمَيْتَ
اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى اور يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ[2] سے ثابت
ہوتا ہے۔

نیز حدیثِ قدسی ہے۔ (ترجمہ پیش کیا جاتا ہے)
"حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ کہ میرا بندہ ہمیشہ نفلوں کے ذریعہ قرب حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اسے اپنا محبوب بنا لیتا ہوں۔ تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اس کی آنکھ بن جاتا ہوں۔ جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اس کی زبان بن جاتا ہوں جس کے ذریعہ وہ بولتا ہے۔ اور اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں۔ کہ وہ ان کے ساتھ چلتا ہے۔ پس وہ میرے ساتھ سنتا۔ دیکھتا اور چلتا ہے۔ اور سب کچھ کرتا ہے۔"[3]

غور سے دیکھا جائے تو اسلامی تصوف میں تزکیۂ نفس صفائے باطن اور

---

[1] الانفال آیت ۱۷ (اے رسول! آپ نے انہیں قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا — اور جب آپ نے ریت پھینکی تھی تو آپ نے نہیں اللہ نے پھینکی تھی۔

[2] سورۂ فتح آیت ۱۰ (بے شک وہ لوگ جو تجھ سے بیعت کرتے ہیں دراصل اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔) بیعت لینے والے کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔ جو بیعت کرتے ہیں۔ واقعۂ مذکور الصدر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک بیعت کرنے والوں کے ہاتھ پر تھا۔ اسے اللہ پاک خود اپنا ہاتھ فرما رہا ہے۔

[3] بخاری۔

Marfat.com

عبادات ظاہری و باطنی کا اصل مدعا یہی ہے۔ کہ غیریت مٹ جائے اور حق ہی حق رہ جائے

جہاد فی سبیل اللہ دشمن حق[1] کو مٹانے اور حق کے استحکام کے لئے ہے۔ فتوحات ملکی اصل غرض نہیں ہے " فنا فی اللہ اور " بقا باللہ" کا مطلب بھی اسی یقین کا حصول ہے۔ کہ حق کے سوا کوئی وجود (غیر حق) موجود نہیں ہے۔ اسی کو تصوف میں "حق الیقین" کہا گیا ہے ظاہر ہے، کہ "حق" کے مقابلہ میں "باطل" ہی ہوگا۔ اگر باطل کو "واقعی موجود" مانا جائے۔ تو یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ اسے حق نے پیدا کیا ہے۔ جو صریحاً از روئے نص قرآنی غلط ہے۔ (آیات قرآنی آئندہ صفحات میں مذکور ہیں)

"حق الیقین" کا درجہ عشقِ رسولؐ میں فنا ہونے کے بعد ملتا ہے کیونکہ عشق و اتباع رسولؐ ہی عشق و اتباع خدا ہے۔ قرآن پاک میں شروع سے آخر تک یہی

---

[1] دشمنِ حق انسان بھی ہو سکتا ہے۔ اور خود اپنا نفس، خیال، ارادہ اور فعل بھی۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ جہاں حق نہ ہو وہی شر ہے۔ یا جس حد تک حق نہ ہو۔ اس حد تک شر ہے۔ اور ان تمام صورتوں میں جہاد و جہاد لازم ہے۔ انسان کی شکل بعض آئینوں میں ٹیڑھی ترچھی نظر آتی ہے۔ قصور یا نقص آئینوں میں ہے۔ نہ اُس شخص میں جو آئینہ کے مقابل ہے۔ نہ اس کی اصل صورت میں ہے۔ نہ دیکھنے والے کی نظر میں ہے۔ اسی طرح وجود حق تعالیٰ ہر نقص سے پاک ہے۔ نقص یا شر کا تعلق فانی ذوات اشیاء یا تعین و تجسم یا آثار و افعال وغیرہ سے ہوتا ہے۔ جو حسب استعداد ذاتی حق کا آئینہ ہوتے ہیں۔ انسان میں شر یا باطل پر غالب آنے کی استعداد سب سے زیادہ ہے۔ اِس لئے وہ قابل مواخذہ ہے۔ اولیاء اللہ میں یہ استعداد بہت قوی ہوتی ہے۔ اور اس میں بھی درجات ہوتے ہیں۔

Marfat.com

حقیقت واضح کی گئی ہے۔ عشق رسول ؐ میں فنائیت کا مطلب یہی ہے کہ ظاہری و باطنی نعمتوں کے حصول کے لئے آپ ؐ کی اتباع پورے خلوص کے ساتھ کی جائے۔

اسلامی تصوف میں خدا اور رسول ؐ کی محبت کے چار درجے بتائے جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر طالب مولیٰ کو مولیٰ تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے اسی سیڑھی سے کام لینا پڑتا ہے جس کا پہلا زینہ شریعت دوسرا طریقت۔ تیسرا حقیقت اور چوتھا معرفت ہے۔ اور اس کے بعد بھی وہ اپنی اہلیت اور فیضان قدس کے مطابق ہی درجۂ قرب و کمال پر فائز ہو سکتا ہے۔

چنانچہ تصوف کے زینۂ اول (شریعت) میں سالک کو پہلے توحید شریعت کی بابت اپنا ایمان درست کرنا پڑتا ہے۔ جو یہ ہے کہ وہ نہ صرف زبان سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کہے بلکہ قلب سے بھی یہ تصدیق کرے کہ بجز ذات الٰہی نہ کوئی معبود ہے، نہ مقصود، نہ محبوب نہ موجود۔ اس توحید پر قائم ہو جانے کے بعد ہی نظام شریعت کے دیگر شعبہ جات یعنی اوامر و نواہی کی تکمیل۔ سیاست مُدن۔ انتظامِ مملکت۔ معاشیات۔ بیت المال وغیرہ کا انتظام خدمت خلق اللہ۔ عبادات و مکارم اخلاق کا نمبر آتا ہے۔ یعنی جب تک عقیدۂ توحید درست نہ ہو۔ مندرجہ بالا تمام امور غیر اسلامی رہیں گے۔ (خواہ ان کے انجام دینے والے نام نہاد اور برخود غلط "مسلمان" ہی کیوں نہ ہوں) کیونکہ اسلام کا بنیادی عقیدہ۔ عقیدۂ توحید ہے۔

غرضیکہ استقامت بالتوحید کے بغیر صوفیائے کرام کے نزدیک۔ زندگی کے یہ تمام شعبے یا مشغلے غیر اسلامی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا تمام امور ہمارے تصوف کے پہلے مرحلے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس اولین مرحلے میں بھی تصوف ہی ایک مُسلم کو خواہش نفس یا محبت دنیا کو اپنا معبود بنا لینے سے باز رکھتا ہے۔ اور اس کے دل کو صرف معبود حقیقی کی سچی محبت سے پُر کرتا ہے۔

Marfat.com

خواہ زندگی کے کسی شعبے سے اس کا تعلق ہو۔ اسی لحاظ سے بغیر "صوفی" بنے کوئی شخص حقیقی معنوں میں "مسلم" ہی نہیں بن سکتا۔ "نائب حق" بننا تو بہت دور ہے۔

جو شخص بہ پابندئ ہوش و حواس شریعت مطہرہ سے روگردانی کرے وہ اکابر صوفیہ کے نزدیک مردود ہے۔ اسی طرح جو باطن کو فراموش کر کے صرف ظاہر میں الجھا رہے۔ وہ بھی جانوروں سے زیادہ گمراہ ہے۔ اس کی تصدیق قرآن پاک یوں کرتا ہے:۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ (پ ۹ ۔ ع ۱۲)

ترجمہ:۔ ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں۔ ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ اور ان کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ ڈھوروں کی مانند ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

یہاں دیکھنا، سننا اور سمجھنا باطن کی نسبت سے ہے۔ ورنہ ظاہر کے لئے تو کان، آنکھ اور دل ڈھوروں کی طرح ان کے پاس بھی ہیں۔ لیکن وہ ان سے حقیقت رسی میں مدد نہیں لیتے۔ (جو اُن کا فرض تھا) اس لئے انہیں ڈھوروں سے زیادہ گمراہ کہا گیا۔

صوفیائے کرام نے توحید کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔

اول:۔ توحیدِ شریعت اور اس کی ضد شرک شریعت ہے۔ جو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالےٰ کی ذات و صفات اور افعال میں کسی کو شریک کرنا۔ جب قلب اس شرک سے خالی ہو جاتا ہے تو توحیدِ شرعی قائم ہو جاتی ہے۔ مشرک کو اللہ نہیں بخشتا۔ باقی جس گناہ کو چاہے گا بخش دے گا۔ عامۃ المسلمین کے لئے یہی توحید کفایت کرتی ہے۔

Marfat.com

دوم :۔ شرکِ طریقت ہے۔ خدا و رسولؐ، عبد و معبود۔ خالق و مخلوق کا ثابت کرنا (بلحاظ وجود حقیقی) شرک جلی ہے۔ اور اس کے برعکس توحید طریقت ہے۔

سوم :۔ شرک حقیقت ہے۔ صفات کو غیر ذات سمجھنا ہے۔ اس کے برعکس توحید حقیقت ہے۔

چہارم :۔ شرک معرفت۔ اسم و مسمی میں تمیز کرنا۔ یہ شرک اخفی ہے۔ اس کے برعکس توحید معرفت ہے۔

پس ان چار قسموں کے شرک کی باز پرس ان چار مراتب والوں سے ہوگی۔[۱]

اوپر مذکور ہوچکا ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے (یا ایمان کے ادنیٰ درجہ میں) توحیدِ شریعت ہی کافی ہے۔ بشرطیکہ وہ اسے اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور اس پر عامل بھی ہوجائیں لیکن اسلامی تصوف انسان کو بلند تر سطح پر لے جاتا ہے اور توحید کی باقی تین اقسام سے بطور خاص بحث کرتا ہے۔ ان اقسام توحید کا تعلق انسان کے باطن اور اعمال باطنی سے ہے۔ توحید کی مذکورہ اقسام کی باریکیوں کو "اسرار" کا نام دیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ عام مسلمانوں کے لئے نہیں ہیں۔ صرف خاص بلکہ اخص مومنین کے لئے ہیں۔ ایمان اور انسانیت کی عام سطح سے بلند و بالاتر ہوکر ہی انسان بلند تر توحید (طریقت، حقیقت و معرفت) کا رنگ (صِبْغَۃُ اللّٰہ) اختیار کرسکتا ہے۔ اسی حالت کو "باطنی معراج" "قربِ الی اللہ" یا وصل الی اللہ وغیرہ کہتے ہیں۔ یہ نعمت باطنی اسی دنیا میں رہکر حقوق العباد ادا کرتے ہوئے حاصل ہوتی ہے۔ البتہ یہ حالت ذوقی، وجدانی اور انفرادی ہوتی ہے۔ اسے اسلامی تصوف میں حال اور معرفت کہتے ہیں۔ جس کا بیان محال ہے۔ جو بیان کیا

۱؎ تعلیم غوثیہ صفحہ ۵۹

Marfat.com

جاتا ہے۔ وہ علم معرفت ہے۔ معرفت نہیں۔ اس کا مزید ذکر آئندہ صفحات میں "وحدت الوجود" اور حقیقت انسانیہ وغیرہ کے تحت ملے گا۔ اس سے پہلے "خلافت فی الارض" کے متعلق کچھ عرض کر دینا ضروری ہے۔

واضح رہے کہ اقبال نے "اسرار و رموز" میں نیابتِ الٰہی اور نائب حق کے الفاظ زیادہ استعمال کئے ہیں۔ اس سے اُن کی مراد اسلامی حکومت ہے۔ صوفیائے کرام کے عقیدے کے مطابق وہی شخص "نائب حق" کہلا سکتا ہے جسے قرب و ولایت کی نعمتیں بھی حاصل ہوں لیکن انہوں نے اپنی مذکورہ نظموں میں "ولایت" اور "اولیاء اللہ" کا ذکر (سیاسی مصالح کی بناء پر) نہیں کیا لیکن بعد میں فقر و قلندری کے تحت انہی امور کا ذکر پرزور الفاظ میں کیا ہے۔ اور آخر تک ان کے کلام میں قلندری کی پرزور وکالت ملتی ہے۔ کتب تصوف میں ظاہری نعمتوں سے استغناء اور باطنی نعمتوں یعنی توحید، حقیقت و معرفت میں استغراق کو قلندری کہا گیا ہے۔ علامہ کا قلندر بھی انہی صفات کا حامل ہے۔

بہرحال صوفیائے کرام کے عقیدے کے بموجب اس موضوع کا خلاصہ یہ ہے کہ جب مومن امانت الٰہیہ کا استعمال کائنات کے مقابلہ میں کرتا ہے تو وہ "خلیفۃ اللہ فی الارض" کہلاتا ہے اور جب خالص خدا کے لئے کرتا ہے تو "ولی" کہلاتا ہے۔ کبھی ایک حالت کا غلبہ ہوتا ہے۔ کبھی دوسری کا۔ لیکن آخر میں یہی ہوتا ہے کہ اللہ کی محبت سب پر غالب آجاتی ہے اور صوفی مقام ولایت کی مسرتوں میں زیادہ سے زیادہ مستغرق رہنے لگتا ہے۔ اس وقت وہ "انسان کامل" کہلاتا ہے اور بے پناہ قوتوں کا حامل ہوتا ہے۔

ان خصوصیات کے پیش نظر "امامت"، "خلافت"، "اسلامی حکومت" اور "مسلم مملکت" چاروں میں فرق ہے۔ امامت اور خلافت میں ولایت کی نسبت مقدم ہے۔ اسلامی حکومت کی

Marfat.com

بنیاد ظاہری احکام شریعت پر قایم رہتی ہے۔ جیساکہ دورِ خلافتِ راشدہ میں تھا۔ لیکن "اربابِ خلافت" کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اہل ولایت بھی ہوں۔ مسلم مملکت میں مسلمانوں کی حکومت ہوتی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ وہ سو فی صد اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔ چاروں میں بیعت ضروری ہے۔ حالانکہ چاروں میں بیعت کی غرض اور صورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ان الفاظ کو اکثر ان کے صحیح مفہوم پر نظر رکھتے ہوئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ جس کے باعث خلطِ مبحث ہوتا اور غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔

اقبال نے "خلافت فی الارض" یعنے ایسی حکومت کے قیام کی جانب پوری قوت سے توجہ دلائی ہے۔ جو اسلامی احکام پر قایم ہو۔ اور جس کے باعث اخلاق و روحانیت کو فروغ حاصل ہو۔ ان کا اولین مقصد یہ تھا۔ کہ بلحاظ اقتدار ملتِ اسلامیہ دنیا کی کسی قوم سے پیچھے نہ رہے۔ اور داخلی طور پر وہ اسلامی اصولوں پر عمل کرے۔

صوفیائے کرام نے فقر و ولایت کی جانب پوری توجہ کی اور سیاسی غلبہ و اقتدار اور معاشی فارغ البالی وغیرہ کی طرف نسبتاً کم۔ کیونکہ سیاسی وجوہ کے علاوہ اُن کے عقیدے کے مطابق جب تک ان چیزوں کی بنیاد اخلاق و روحانیت پر قائم نہ ہو۔ انسان انسان کہلانے کا مستحق نہیں بنتا۔ نہ انسانیت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اقبال کو بھی اس نظریہ سے اختلاف نہ تھا۔ چنانچہ لاہور ریڈیو سٹیشن نے ان کا ایک پیغام ان کے انتقال سے چند روز قبل "نوروز" کے موقعہ پر نشر کیا تھا۔ اس میں وہ فرماتے ہیں :۔

"دورِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقیات پر بہت فخر و ناز ہے اور یہ فخر و ناز بلاشبہ حق بجانب ہے۔ ...... لیکن ان تمام ترقیات کے باوجود ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، فسطائیت اور

خدا جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے گوشوں میں "قدرِ حریت" اور شرف انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا........

یاد رکھو! انسان کی بقاء کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرتکز نہ کر دیں گی۔ یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل، زبان، رنگ اور قوم سے بالاتر ہے[1]۔"

تاریخ شاہد ہے۔ کہ صوفیائے کرام نے ہمیشہ ملوکیت کے جبر و استبداد کو چیلنج کیا ہے اور قدرِ حریت و احترام انسانیت کی تبلیغ اپنی عملی زندگی کے ذریعہ کی ہے۔ دنیا میں خونریزی فتنہ و فساد، ظلم و جور اور معاصی کبیرہ کی مرتکب وہی جماعتیں اور قومیں ہوئی ہیں۔ اور آئندہ بھی ہوتی رہیں گی۔ جن کے نفس اور قلب میں فساد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس پاکیزہ نفس اور طاہر قلب رکھنے والے افراد ہمیشہ امن و امان کے ضامن اور مبلغ رہتے ہیں۔ وہ خلق اللہ کی خدمت کرتے اور انسان کو اللہ سے سرکشی اور اس کی نافرمانی کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس لحاظ سے انسانیت کو فروغ دینے کے سلسلے میں تصوف اور صوفیۂ کرام کی خدمات ہی صف اول میں نظر آتی ہیں۔

صوفیۂ کرام کے دلوں میں عامۃ الناس سے (بلا لحاظِ مذہب و ملت) ہمدردی،

---

[1] مطبوعہ آثار اقبال صنہ ۲۱، صہ ۲۱۱

ہونے کی ایک زبردست وجہ یہ ہے کہ ان کے عقیدے کے مطابق کائنات کا ذرہ ذرہ معشوقِ حقیقی کے جمال کا آئینہ ہے۔ اور انسان میں اس کا ظہور بدرجۂ اتم ہو رہا ہے۔ چنانچہ یہ عقیدہ ہی اس بات کا ضامن ہے۔ کہ صوفیہ کرام کا مسلک وہ واحد مسلک ہے جو اقبال کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر سکتا ہے جو وحدتِ انسانیہ کو پیش نظر رکھتا اور "نسل و زبان اور رنگ و قوم سے بالاتر ہے"۔

غرض یہ کہ "خلیفۃ اللہ" یا "نائب حق" بننے کے لئے حق سے تعلق ضروری ہے۔ جہاں حق سے تعلق نہ ہو۔ وہیں ملوکیت اور چنگیزیت ہے۔ جس کی مخالفت تو صوفیہ کرام تو شروع ہی سے کر رہے ہیں۔ اور اقبال نے ہمارے زمانے میں کی ہے۔

اسلامی تصوف کا کام یہ ہے کہ وہ نیابت و خلافت کے لئے افراد تیار کرے تاکہ ان افراد کے کاندھوں پر جب کبھی انتظامِ مملکت کی ذمہ داری رکھی جائے۔ تو وہ احکامِ قرآن و سنت کے مطابق اپنے فرائض بخلوص نیت ادا کر سکیں۔ جیسا کہ خلافت راشدہ کے دور میں ہوا لیکن اس کا اصل مقصود نہ حصول مملکت ہے۔ نہ اسکی جد و جہد، بلکہ عبادت ہے اسی لئے کہا جاتا ہے۔ کہ ولایت حقہ کا درجہ دیگر تمام نعمتوں سے اعلیٰ ہے کیونکہ اس میں اماناتِ الٰہیہ کا استعمال محض خدا کے لئے ہوتا ہے۔

توحید شریعت اور امور خلافت کے بعد (یا اس کے ساتھ ساتھ) توحید حقیقت اور توحید طریقت کی منزلیں آتی ہیں۔ یہ اسلامی تصوف کی اعلیٰ ترین منزلیں ہیں۔ اس سلسلے میں وحدت الوجود یا "حقیقت انسانیہ" "رجوع الی اللہ" اور "حصول قرب" کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ موضوعات ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے۔

اسلامی تصوف کے ماہرین اکابر صوفیہ اور اولیاء اللہ رضوان اللہ عنہم اجمعین

نے بھی شہادت دی ہے۔ کہ اسلامی تصوف کا اہم ترین حصہ جو "وحدت الوجود" انسان اور کائنات کی حقیقت، عروج الی اللہ اور قرب و حضور سے بحث کرتا ہے۔ براہ راست قرآن پاک و احادیث نبوی، سیرت حسنۂ نبوی اور اجماع علماء حق سے ماخوذ ہے[1]

چنانچہ تقریباً تمام اکابر صوفیہ اور اولیاء اللہ کا مسلک "توحید وجودی" پر قائم تھا۔ صرف بعض حضرات نے اس کی "تعبیر"[2] سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن اول تو یہ اختلافِ تعبیر محض لفظی ہے۔ دوم تعبیر کے اختلاف سے اصل موضوع باطل نہیں ہوتا۔ جیساکہ قرآن پاک کی بعض آیات کی تعبیر و تفسیر کے اختلاف کے باوجود قرآن پاک اپنی جگہ حق ہے ؎

دو صد آئینہ یک روئے مقابل
اگر صد رو نماید لیک یک روست

اقبال کے آخری حصۂ عمر کے کلام و خیالات سے واضح ہوتا ہے۔ کہ وہ بھی "توحید وجودی" کے قائل ہو گئے تھے۔ چنانچہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی شرح ارمغان حجاز میں کہتے ہیں :۔

"۱۹۳۰ء کا ذکر ہے میں نے ایک ملاقات کے دوراں علامہ اقبال سے عرض کی کہ مجھے مسئلہ "وحدت الوجود" سمجھا دیجئے۔ اس پر انہوں نے جواب

---

[1] عروج الی اللہ اور قرب و حضور ایسے امور ہیں جو باطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ انکے متعلق صوفیہ کرام، علمائے طریقت کی رائے کو مستند مانتے ہیں۔ محض ظاہر پرستی میں اُلجھے رہنے والوں کو ان کی اصطلاح میں "علماء سُوء" اور آج کل کی اصطلاح میں "مُلّا" کہا جاتا ہے۔

[2] "بنیادی اختلاف سے شرک ذاتی لازم آئے گا"

دیا۔ کہ دراصل یہ مسئلہ قال سے تعلق نہیں رکھتا۔ جب تک تم پر یہ حالت طاری نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا وجود نہیں ہے۔ اس وقت تک تم یہ مسئلہ کما حقہٗ سمجھ نہیں سکتے۔ علاوہ بریں اس کی تعبیر بذریعہ الفاظ بہت دشوار ہے۔ بلکہ اس قدر نازک ہے کہ اگر بیان کرنے والے سے معمولی فروگذاشت ہو جائے۔ یا سننے والا غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے۔ تو دونوں صورتوں میں کفر یا الحاد لازم آجاتا ہے۔ اس لئے تم بطور خود اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ...... جب میں نے حضرت حکیم مولانا برکات احمد ٹونکیؒ کے رسالہ "وحدت الوجود" کا مطالعہ کیا تو میں نے بھی یہی مسلک اختیار کر لیا کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللہُ اور مجھے خوشی ہے کہ آخر عمر میں حضرت اقبال بھی وجودی ہو گئے تھے۔"

تحقیق کی نظر سے یہ نکات بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتے کہ توحیدِ وجودی کی بنیاد نفی خودی کی بجائے استحکام خودی[1] پر، فنا کی بجائے بقاء پر، زوال کی بجائے لانہایہ عروج روحانی پر اور اس جہاں کو ہیچ یا معدوم تصور کرنے کی بجائے اسے ہر طرح حق سمجھنے اور حق دیکھنے پر قائم ہے۔ دراصل مذکورہ نوعیت کے جتنے الزامات اس پر عاید کئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غلطی سے دیگر اقوام کے غیر اسلامی فلسفوں اور نظریوں کو بعض مشترک اصطلاحات و الفاظ کے استعمال کی بناء پر اسلامی توحید سمجھ لیا جاتا ہے[2]۔ اور صحیح اسلامی توحید (ذاتی و

---

[1] اس سے صوفیاء کرام کی مراد "انائے باطلہ" کی نفی کر کے "انائے حقہ" کا اثبات ہے۔ کیونکہ شرک فی الذات کا استیصال اسی طرح ہو سکتا ہے۔

[2] تفصیلات کے لئے نقد اقبال از حضرت میکش اکبر آبادی کا مطالعہ کیا جائے۔

صفاتی) کے متعلق اکابر توحید کی توضیحات کا مطالعہ نظر غائر سے نہیں کیا جاتا۔ اس غلط فہمی کی ایک وجہ اور غالباً سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ "سیکھنے اور سمجھنے" سے بلند و بالا بھی ایک چیز ہے اور وہ چشم حال سے توحید وجودی کا مشاہدہ ہے۔ جب تک کوئی اس بلند مرتبہ پر خود فائز نہ ہو وہ حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ اور نہ فقر و تصوف کو سمجھ سکتا ہے۔ اسی لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ علم کے عام ذرائع پر شرح صدر[1] (کشف و الہام مومنین) کو اور سب پر وحی الٰہی کو برتری حاصل ہے۔ لیکن سمجھنے سمجھانے کے لئے بھی مشائخ کبار نے کافی لٹریچر مہیا کر دیا ہے۔ اگر تلاش حق کی نیت سے اس کا مطالعہ کیا جائے تو اسلامی تصوف و توحید سے متعلق تمام غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ "اَصْدَقُ[2] كَلِمَةٍ قَالَهَا الشَّاعِرُ قَوْلُ لَبِيْدٍ۔

اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهِ بَاطِلٌ

یعنی سچا کلمہ جو شاعر لبید نے کہا ہے وہ لبید کا یہ قول ہے کہ:۔
سن لو! کہ جو شئی ماسوی اللہ ہے وہ باطل ہے" یعنی فی الحال معدوم ہے۔"
قرآن پاک میں ہے۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهُ[3] یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات

---

[1] فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔ پ ۸ (الانعام ۱۲۶)
ترجمہ:۔ جس کو اللہ تعالیٰ چاہے کہ ہدایت کرے اس کی۔ تو وہ کھول دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے۔

[2] اس حدیث کو بخاری و مسلم نے بروایت ابو ہریرہؓ نقل کیا ہے۔

[3] سورۂ قصص آیت ۸۸

Marfat.com

کے سوا تمام اشیاء فانی ہیں۔ (فی الحال فانی ہیں۔ نہ کہ مستقبل میں فانی ہوں گی)

آیت كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ۝ (الرحمٰن ۲۶، ۲۷)

آیت میں "وجہ" سے مراد ذات ہے۔ اور ذات و وجودِ حق ایک دوسرے کے عین ہیں۔

حدیث صحیح ہے کَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهٗ شَيْءٌ (بخاری) یعنے تھا اللہ اور نہ تھی ساتھ اُس کے کوئی شئے۔ اور اَلْاٰنَ كَمَا كَانَ بھی اسی کی شان ہے۔ یعنے وہ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔ (یعنے اس کے ساتھ اب بھی کوئی شئے موجود نہیں ہے) ذوات اشیاء تو ہیں لیکن وہ حق تعالیٰ کی ذات کی طرح حقیقی نہیں ہیں۔ ان کا "ہونا" یعنے ان کا وجود اعتباری ہے۔ قرآن پاک میں ہے هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (سورۂ حدید آیت ۳) یعنے وہی اول ہے۔ وہی آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے۔

ایک جگہ ہے ۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۔ پ ۲۳۔ ع ۔

یعنے (اے محمدؐ!) تحقیق تو اور وہ سب میّت ہیں اور معدوم (یہاں بھی یہی سمجھا جائے گا کہ فی الحال میت ہیں نہ کہ زمانۂ آئندہ میں ۔

ظاہر ہے کہ اس آیت میں ہر شخص اور ہر شئے کے تعین ظاہری ہی کو باطل قرار دیا گیا ہے نہ کہ اس کی حقیقت کو۔ ورنہ کم سے کم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو زندہ موجود اور مخاطب بھی تھے "میت" نہ کہا جاتا۔

یہاں شاید یہ اعتراض کیا جائے کہ قرآن پاک میں تو یہ آیت موجود ہے :۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ط (پ ۲۳ ۔ ع ۱۲) یعنے "اور نہیں پیدا کیا ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے باطل۔ لیکن

Marfat.com

مذکورہ بالا حدیث (اَصْدَقُ کَلِمَۃٍ ...... الخ) نیز قرآن پاک کی اس آیت (اِنَّکَ مَیِّتٌ .... الآیۃ) میں سب کو میت، معدوم اور باطل قرار دیا جارہا ہے۔ در آنحالیکہ سب موجود ہیں۔ لیکن ذرا غور کرنے سے یہ اشتباہ رفع ہوجائے گا۔ اور واضح ہوجائے گا کہ حدیث مذکور میں غَیْرِاللّٰہ کو باطل قرار دیا گیا ہے۔ اور آیۂ بالا میں جُملہ موجُوداتِ عالم کو "حق" کہا جارہا ہے۔ ("باطل نہیں بنایا" لہذا اس کی ضد "حق" ہی ہوسکتی ہے تیسری کوئی صورت نہیں) پس معلوم ہوا کہ موجودات عالم حق ہیں اور غیر حق، باطل و معدوم اور میت ہے۔ اس لئے اہل تصوف غیر حق کو (بلحاظ حقیقت نہ کہ بلحاظ تعین و تجسّم) معدوم و باطل مانتے ہیں۔ ورنہ حق کے مقابلہ میں باطل کو موجود اور اللہ کو اس کا خالق ماننا پڑے گا۔ جو قطعاً غلط اور نصوص قرآنی کے خلاف ہے۔ چند اثباتی آیات یہ ہیں۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ — پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ۔

(پ۱۴ - ع۱۵)

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَہُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ (پ۲۶ - ع۱) — نہیں پیدا کیا ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور جو کچھ درمیان ان کے ہے۔ مگر ساتھ حق کے اور وقت مقرر کے۔

۳۔ پس حق تعالیٰ کو موجود حقیقی سمجھتے ہوئے دیگر اشیاء کو بھی اسی طرح موجود ماننا شرک فی الذات ہے۔ تصوف اسی شرک سے دل کو پاک کرتا ہے۔ اور اسی کو حقیقی توحید قرار دیتا ہے۔ اس باب میں اکابر صوفیہ کے عقیدے کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ غیر اللہ موجود نہیں۔ وہی ایک ذات جو ہر اسم کی مسمّیٰ۔ ہر مظہر کی اصل اور ہر تعین کی حقیقت ہے۔ ہر وقت، ہر حال میں، ہر مسمّیٰ، ہر مظہر اور ہر تعین میں وارد ہو کر گاہ بصفتِ جلالی

Marfat.com

(جس کا کام مٹانا یا پردہ غیب میں چھپانا ہے) اور گاہ بصفتِ جمالی (جس کا کام بنانا یا ظہور میں لانا ہے) ظاہر ہو رہی ہے۔ یا بالفاظِ دگر "حق تعالیٰ ہی بحالِہٖ وَبحدِّ ذاتِہٖ جیسا کہ تھا و یسا رہ کر بلا تغیر و تکثر، بغیر حلول و اتحاد و تجزّی و تقسیم صفت نور کے ذریعہ صُوَرِ معلومات سے خود ظاہر ہو رہے ہیں۔ صُوَرِ علمیہ کی کثرت[۱۵] اُن کا تعین و تجیّز حق تعالیٰ کی وحدت ذاتیہ اور تنیزیہ میں کوئی فرق نہیں پیدا کر سکتا"[۵۲]

انہی معنوں میں اکابر صوفیہ کا قول ہے کہ تمام اشیاء باعتبارِ حقیقت موجودِ حقیقی کی عین اور باعتبار تعین اس کی غیر ہیں۔ لیکن یہ غیریت اعتباری ہے۔ ہمارے اپنے خیالات کو ہمارے وجود سے جو نسبت حاصل ہے اس کے سمجھ لینے پر اس جملہ کا مفہوم بھی بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔

تجلّی کے معنے ظہور ہیں۔ اور صورت یا تعین کے بغیر ظہور ناممکن ہے۔ یہی مفہوم تمثل

---

۵۱ ممکنات عالم صُوَرِ علمیہ حق ہیں۔ حق تعالیٰ کے علم سے باہر وہ معدوم ہیں۔ بقول حضرت ابن عربیؒ ان صورتوں نے وجود کی بُو بھی نہیں سونگھی۔ ان کی کثرت سے وجود حقیقی کی وحدت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جس طرح ہمارے خیالات کی کثرت اور ذہنی دنیا سے ہمارے اپنے وجود کی وحدت متاثر نہیں ہوتی۔ عالم میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ حق تعالیٰ کے علم کا مظاہرہ ہے۔ اور یہ مظاہرہ بھی اس کے علم ہی میں ہو رہا ہے۔ ہم خود اور جو کچھ ہم اس عالم کو سمجھ رہے ہیں وہ بھی سب کچھ اس کے علم کے اندر ہی ہے لیکن اُسکا علم بھی عین ذات ہے۔ کیونکہ اُس کی ذات سے اُسے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

۵۲ قرآن و تصوف از ڈاکٹر میر ولی الدین۔

Marfat.com

کا ہے۔ چنانچہ ذاتِ منزہ حق کا بصورتِ تشبیہ تجلی (ظہور) فرمانا خود کلامِ الٰہی اور احادیث نبویؐ سے ثابت ہے۔ "وادی ایمن" میں ایک درخت پر اس کا نور جلوہ گر ہوا تھا۔ اسی نے اِنِّی اَنَا اللّٰهُ کا نعرہ لگایا تھا۔ نہ کہ درخت نے۔ متعدد احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالتِ بیداری اللہ تعالےٰ کو صورتِ مثالی میں دیکھا اس سے اس کی شانِ تنزیہی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی بصورت دحیہ کلبیؓ ظاہر ہونے یا حضرتِ عزرائیل علیہ السلام کے وقت واحد میں مختلف صورتوں کے ساتھ متعدد مقامات پر پہنچ کر روح قبض کرنے سے ان کی "حقیقت جبرئیلی" یا "عزرائیلی" میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا۔ صرف صورت تعین یا تجسم ہے جو ٹوٹتا اور بنتا رہتا ہے۔ اسلامی تصوف میں شریعت کی حد تک ذواتِ اشیاء سے افلاطونی فلسفہ کی طرح انکار نہیں کیا جاتا۔ شریعت کا تعلق ہی "ظاہر" سے ہے۔ اور انسان کے ظاہری افعال و اعمال پر ہی احکام شرعیہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ پس شریعت میں "ظاہر" سے مراد ظاہری آثار و صفاتِ اشیاء بلالحاظِ حقیقت کے اور طریقت میں "الظاہر" سے مراد ذاتِ منزہ حق کا بصورتِ تشبیہ تجلی فرمانا ہے۔ اس فرق کا ملحوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ حقیقت میں حق تعالیٰ ہی "الظاہر" ہے اور وہی "الباطن" بھی ہے۔ یعنے وہ تنزیہ و تشبیہ دونوں کا جامع ہے۔ لہذا ہر چیز سے پہلے اہل دل کی نظر اللہ پر پڑنا بھی صحیح ہے۔ اور ہر شئے میں اللہ کا جلوہ دیکھنا بھی صحیح ہے۔ اسی لئے تصوف یا طریقت میں باطل، فانی یا معدوم حقیقت شئے کو نہیں بلکہ صرف تعینات یا اعتبارات کو کہا جاتا ہے۔ حقیقت ایک ہی ہے۔ جو ازلی، ابدی اور لافانی ہے۔ اور وہی ممکناتِ عالم کے آئینہ میں جلوہ گر ہے۔ اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (پ۱۔ آیت ۱۱۵) طریقت یہ ہے کہ ہر شئی میں اسی

"حقیقت" کا مشاہدہ کیا جائے۔ اگر مشاہدہ ہے تو ہم مسمیٰ کو دیکھیں گے۔ ورنہ صرف اسم کا خیال رہے گا۔ حدیث میں اسی کو "احسان" کہا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایکبار حضرت جبرائیل علیہ السلام کے سوال کے جواب میں فرمایا تھا (یہ حدیث متفق علیہ ہے):۔

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّكَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاكَ۔

یعنے تو اللہ کی عبادت یوں کر گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکے کہ تو اُسے دیکھے۔ تو البتہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

عرفاء کہتے ہیں کہ اس میں دو قسم کے عبادت گذاروں کا ذکر ہے۔ (۱) خاص الخاص اور (۲) خاص۔ صورتِ اول میں "مشاہدہ" ہے جسے "معراج" کہتے ہیں (اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ میں اسی طرف اشارہ ہے) اور دوسری صورت مراقبہ کی ہے جو پہلی سے ادنیٰ ہے۔ عوام کی عبادت دونوں صورتوں سے خالی ہوتی ہے۔

فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلٰوتِہِمْ سَاھُوْنَ ؕ

پس وائے ہے۔ ان نمازیوں پر جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ (ماعون ۴-۵) انہی کے لئے کہا گیا ہے۔

امیر المؤمنین حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرماتے ہیں:۔

مَارَاَیْتُ شَیْئًا اِلَّا رَاَیْتُ اللّٰہَ فِیْہِ اَوْ قَبْلَہٗ اَوْ بَعْدَہٗ اَوْ مَعَہٗ اَوْ فَقَطْ (یعنی نہیں دیکھا میں نے کسی شے کو مگر دیکھا میں نے اللہ کو اسی شئے میں یا اس سے پہلے۔ یا اس کے بعد یا اس کے ساتھ یا فقط اللہ کو)

اسی طرح مشاہدہ کے لحاظ سے سالک کے مختلف مراتب مقرر کئے گئے ہیں جس کی

Marfat.com

شرح کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ غرض یہ کہ صوفیاءِ کرامؒ نے اس موضوع (احسان) کی بابت نہایت مفصل اور مدلل بحث کی ہے۔ البتہ تصوف میں اس اصول کی پابندی سختی سے کی جاتی ہے۔ کہ جو الفاظ شانِ تنزیہی کے لئے موزوں ہوں ان کا استعمال شانِ تشبیہی کے لئے اور اسی طرح اس کے برعکس نہ کرنا چاہیئے۔ مولانا جامیؒ فرماتے ہیں۔

ہر مرتبہ از وجودِ حکمے دارد
گر حفظ مراتب نہ کنی زندیقی

مثلاً برگ و بار بلکہ پورا درخت ایک ہی تخم کا ظہور ہوتا ہے۔ لیکن پھول پتوں کو تخم اور تخم کو پھول پتہ نہیں کہتے۔ اسی طرح بندہ کو خدا یا خدا کو بندہ نہیں کہہ سکتے۔ اقبال کے اشعار اور خطبات میں تقریباً یہ تمام نکات مذکور ہیں۔ لیکن عدم گنجائش کے باعث صرف چند مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے۔ مثلاً اقبال کائنات کی ہر چیز کو "باطل" قرار دیتے ہیں۔ اور صرف "ذات اللہ کی حقیقی موجودگی" کے قائل ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا
فریبِ سود و زیاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ (ضربِ کلیم)

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بُت خانۂ چشم و گوش — جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

Marfat.com

خودی کی یہ ہے منزل اوّلیں مسافر[۱] یہ تیرا نشیمن نہیں

اسی طرح وہ عالم کی نفی کرنے کے بعد صوفیوں کی طرح اثبات حق بھی علمی طور پر نہیں بلکہ قلب کے حوالے سے یوں کرتے ہیں :-

جہانِ دل جہانِ رنگ و بو نیست

درو پست و بلند و کاخ و کو نیست

زمین و آسمان و چار سو نیست

دریں عالم بجز اللہ ھو نیست

یا مٹا دیا میرے ساقی نے عالم من و تو پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو

یا مثلاً مذکورۂ بالا اشعار جن کی ردیف لا الہ الا اللہ ہے۔ اقبال اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ "جمال ذات کے عاشق کا" مرتبہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :-

ہر کہ عاشق شد جمال ذات را

اوست سید جملہ موجودات را (جاوید نامہ)

اقبال نے جس قدر اعتراضات "نفی خودی" یا "خودی کو فراموش کر دینے" کے متعلق کئے ہیں۔ وہ اسلامی تصوف پر عاید نہیں ہو سکتے کیونکہ اس میں خودی باطلہ اور عالم کے وجودِ باطلہ کی نفی کی جاتی ہے۔ اور مندرجہ بالا مثالوں سے ثابت ہے کہ اقبال بھی کسی وجودِ باطل کے قائل نہیں ہیں۔

صوفیاء کرام کی طرح اقبال بھی ذاتِ منزہ حق تعالےٰ کا بصورت تشبیہ تجلی فرمانا

۱۔ تصوف میں مسافر کے لئے سالک اور سفر کے لئے عُروج الی اللہ ہے جس کی کچھ تفصیل آگے عروج الی اللہ کے تحت ملے گی۔

Marfat.com

بیان کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ "نزول" یا "تنزل" کا مترادف "اترنا" ایک جگہ استعمال کیا ہے (تنزلات ستہ اسلامی تصوف کی خاص اصطلاح ہے) البتہ اشعار ذیل میں فلاسفروں کی تقلید میں انہوں نے وجود حقیقی کے لئے لفظِ زندگی استعمال کیا ہے۔ مثلاً "بالِ جبرئیل" کے "ساقی نامہ" میں ہے :۔

"اتر کر جہانِ مکافات میں — رہی "زندگی" موت کی گھات میں!
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج — اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

پھر آگے چل کر "خودی" کے اوصاف یوں بیان کرتے ہیں۔

خودی کیا ہے؟ رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے؟ بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں — یہ بے رنگ[1] ہے ڈوب کر رنگ[2] میں

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

ان اشعار میں وہی باتیں بطور اشارات مذکور ہیں۔ جنہیں اکابر صوفیہ نے "تنزلاتِ وجود" کے پردہ میں مرتبۂ احدیت (بے رنگی) سے مرتبۂ انسان تک بیان کیا ہے۔ اسلامی تصوف میں "تنزلات" کا بیان نہایت مدلل، مفصل اور باقاعدہ

---

[1] اسلامی تصوف اسے مرتبۂ احدیت یا تنزیہہ کہتے ہیں۔
[2] اسلامی تصوف میں اسے تشبیہ کہتے ہیں۔

Marfat.com

قرآن و حدیث کے حوالوں کے ساتھ موجود ہے۔ یہ جامعیت اور اتنی تفصیلات مع اسناد اقبال کے فرمودات میں موجود نہیں۔

اقبال کے خطبات میں فلسفیانہ طرز استدلال ہے جس سے غیر مسلم مفکرین کو اسلامی نظریات کے قریب لانا مقصود ہے۔ لیکن ان کے فلسفیانہ استدلال سے بھی وجود حقیقی کی وحدت ہی ثابت ہوتی ہے[1]۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مولانا عبدالسلام خانؒ کے ایک قابل قدر مقالہ[1] کی چند سطریں ملاحظہ ہوں۔

"مخلوق یا کائنات کی حیثیت بھی اقبال کے زاویۂ نظر سے "انائے کامل" کے فعل سے زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ خالق بھی یہی فعلیت مطلقہ ہے۔ جس میں اس کی تکاثفی اور اندرونی حیثیت کا اعتبار ہے۔ لہذا خلق، مخلوق اور خالق ان سب میں ذات اور حقیقت کے اعتبار سے فرق نہیں۔ فعلیت مطلقہ ہمیشہ سے سرگرم ظہور ہے۔ اس میں نہ کبھی تعطل تھا اور نہ ہو سکتا ہے یہ شیون افعال ہیں اور ہر فعل ایک تاثیر، یا تخلق یا ظہور ہے۔ وجود حیات کا سمندر مسلسل جاری ہے۔ ہماری عقل و فکر اپنی مخصوص نوعیت و طرز کی بناء پر اس کو منقطع اور منفرد افعال کی شکل میں ہمارے سامنے لاتی ہے[2]۔ فعلیت مطلقہ کی شان ہی اظہار ہے۔ مظاہرہ اور خود نمائی وجود حیات کا ذاتی تقاضا

---

[1] دیکھئے "اقبال کی الٰہیات کا مجمل خاکہ" مطبوعہ "اقبال پر ایک نظر" مؤلفہ سید محمد شاہ صاحب ایم۔ اے۔

[2] حکماء کے مشاہدات اور ان کے نظریے اپنی جگہ حق ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بدلتے رہتے ہیں اور صرف حقیقت کے اجزاء کو پاتے ہیں۔ اسلامی تصوف ان سے ارفع (باقی صفحہ پر)

Marfat.com

ہے۔ اور حیاتِ مطلقہ اور وجود مطلق کے اظہار ہی کا نام کائنات یا خلق ہے۔ اگر اظہار نہ ہو تو فعلیت اور وجود مطلق کے کوئی معنے نہیں۔ گویا کائنات ذات کی صفت حیات اور وجود کی نمائش ہے۔ بلکہ خود ذات کی اپنی ذاتی صفت ہے۔

چشم او روشن شود از کائنات،
تا بہ بیند ذات را اندر صفات[لـه]

اس وقت کے ارتقائی سلسلہ کا آخری حلقہ انسان ہے....... اپنی قوتوں کے اعتبار سے انسان "انائے کامل" یعنے خدا سے سب سے زیادہ قریب[لـه۲] ہے۔ مکاں، زماں اور مادہ تینوں ہمارے ذہنی و فکری عوارض ہیں، جن کو ہمارا تفکر فعلیت یا تخلیقی حرکت کے سر منڈھ دیتا ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۴:۔ اور بلند چیز پیش کرتا ہے۔ وہ اجزا سے نکال کر کل تک پہنچاتا ہے۔ جس کے لئے استدلال عقلی سے زیادہ وجدان یا کشف صدر کی ضرورت ہے۔ کشف صدر سے جو حقیقت دریافت ہوتی ہے۔ اس کا بیان الفاظ میں نہیں ہو سکتا۔ اسلامی تصوف میں اسی کو "معرفت" کہتے ہیں۔

لـه یہ طرزِ بیان فلسفیانہ ہے۔ لیکن باتیں تقریباً وہی بیان ہو رہی ہیں۔ جو صوفیہ کرام "وحدت وجود" کے تحت اپنے مخصوص اصطلاحات میں بیان کرتے ہیں۔

لـه۲ اس کی تفصیل اسلامی تصوف میں "حقیقتِ انسانیہ" اور اس کے عروج کے تحت ملتی ہے زیر نظر مجموعہ مضامین میں اسے کئی جگہ بیان کیا گیا ہے۔ خصوصاً "حقیقت انسانیہ اور اس کے عروج" کے تحت۔

Marfat.com

خرد ہوئی ہے زمان و مکان کی زناری[1]

نہ ہے زماں نہ مکاں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اس کے (یعنے فعلیت مطلقہ کے) ذاتی وجود کے مرتبے میں کسی دوسری چیز کا وجود نہیں۔ (اسلامی تصوف میں یہ "مراتب وجود" کا پہلا مرتبہ ہے۔ جسے احدیت یا لاتعین کہتے ہیں یہاں کسی دوسری چیز کا وجود کیا انسان کے وہم و گمان کی بھی رسائی نہیں ہو سکتی۔ مؤلف)۔ اس لئے یہ انائے مطلق یا کامل ہے۔ (اسلامی تصوف یہ بتاتا ہے کہ وہ انائے مطلق ہر وقت اور ہر لحاظ سے کامل ہے۔ مؤلف) دوسرے انا جو اس فعلیت مطلقہ کے افعال ہیں۔ اضافی انا یا اضافی انفرادیتیں ہیں ......" (اسلامی تصوف بھی صاف الفاظ میں یہی کہتا ہے کہ وجود حقیقی صرف ایک ہے۔ باقی اشیاء کے وجود سب اضافی یا اعتباری

---

[1] جس طرح ہم اپنے خیال میں ایک دنیا آباد کر لیں اور اس کی مخلوق کو چلتا پھرتا ہنستا بولتا دیکھیں۔ باغ۔ باغیچے۔ ندی، نالے۔ اور پہاڑ و آبشار وغیرہ۔ غرض یہ کہ جو چاہیں اور جب چاہیں ارادہ کرتے ہی بنالیں جب چاہیں ارادہ کرتے ہی، توجہ ہٹاتے ہی آناً فاناً بگاڑ دیں۔ ہم ہی اپنی اس دنیا کے خالق اور ہم ہی رب ہوئے۔ اس خیالی دنیا اور اس کی ہر چیز کی فنا و بقا ہمارے اختیار میں ہے۔ ہم سے وہ باہر نہیں۔ بلکہ اتنی قریب ہے جتنا ہم خود اپنے آپ سے ہیں۔ اس کے تغیر و تکثر سے ہماری حقیقت (وجود یا ذات) میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم جیسے تھے۔ ویسے ہی رہ کر اپنے افعال و صفات کو اپنی بنائی ہوئی خیالی دنیا کے آئینے میں دیکھ رہے ہیں۔

اسی طرح بعض حضرات نے حق تعالیٰ اور اس کی بنائی ہوئی دنیا کی باہمی ربانی صفحے پر

Marfat.com

ہیں۔ مؤلف)

بہر حال یہاں تک اسلامی تصوف اور علامہ اقبال کے خیالات میں مطابقت و مماثلت ثابت ہو چکی - اب ضروری ہے کہ "حقیقت انسانیہ" اور اس کے عروج کے متعلق بھی دونوں کا نقطۂ نظر معلوم کیا جائے۔

حقیقتِ انسانیہ

قرآن پاک "حقیقت انسانیہ" کے پورے نظام سے بحث کرتا ہے۔ پورے نظام سے میری مراد وہ نظام ہے۔ جو ابتداء سے انتہاء تک حقیقت انسانیہ اور انسان کو اللہ اور کائنات دونوں کی نسبت سے بیان کرتا ہے۔ اسے کم و بیش مندرجہ ذیل عنوانات میں

بقیہ حاشیہ ۷۶:- نسبت کو سمجھایا ہے۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ ہماری خیالی دنیا کی "ذی حیات" (چلتی پھرتی ہنستی بولتی) مخلوق کو احساس حیات نہیں ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی مخلوق کو حیات کا احساس شعور ہے۔ اور وہ اپنے وجود کو حقیقی بھی سمجھتی ہے۔

له مولانا نے مقالے کے آخر میں" انا کی خود اپنی مثبت حیثیت" کی بابت چند سوالات کئے ہیں اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جب تک ان کے سوالات کے جواب علامہ اقبال کے خطبات سے نہ دئے جائیں اَنا کی اپنی مثبت حیثیت کا پتہ نہیں چلتا" تاہم مقالہ مذکور سے اتنا ضرور معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ دلائل "وحدت وجود" پر ہی منتج ہوتے ہیں۔ یعنے صرف ایک "انائے کامل" کا حقیقی وجود ثابت ہوتا ہے۔ مولانا صاحب خود اپنے مقالے میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔ اقبال کے پورے نظام پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ ایک قسم کے "وحدت وجود" کے قائل ہیں۔ (اقبال پر ایک نظر صفحہ ۱۰۶) (باقی صفحہ ۷۸)

Marfat.com

تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یعنے حقیقتِ آدم، تخلیقِ آدم، عظمتِ آدم (آدم کو فرشتوں کا سجدہ) عالمِ حس و شہادت میں اس کا نزول۔ حضرت آدم صفی اللہ۔ قرآن میں انسان کی تعریف اس کے علوی و سفلی صفات، نیک و بد راہ عمل اختیار کرنے کا اختیار، اعمال کی جزا و سزا، حیاتِ انسانی کا اصل مقصد [(۱) معاشرے اور کائنات کی نسبت سے (۲) خدا کی نسبت سے] حقیقتِ حیات (وسیع معنے میں) موت [(۱) ارادی معنوی جس کا حکم حدیث مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا میں موجود ہے۔ (۲) طبعی جسمانی] حشر و نشر اور لقائے الٰہی وغیرہ۔

انسان کے متعلق قرآن پاک مذکورہ بالا تمام شقوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اور علمائے طریقت نے ان تمام نکات کے ظاہری مفہوم کے علاوہ ان کا حقیقی باطنی مطلب بھی بیان کیا ہے۔ اور اسے قرآن پاک و حدیث اور ارشاداتِ اولیاء اللہ سے صحیح ثابت کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ ان کے سینوں کو اسلام کے لئے کھول دیتا ہے[۹] اور شرح

بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۷: جناب پروفیسر یوسف سلیم صاحب چشتی کی رائے بھی مقالہ ہذا کے صفحہ ۹۴ پر درج ہو چکی ہے۔ ۱۲

۹ فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (۶-۱۲۶) (پس جب ارادہ فرماتا ہے اللہ کہ ہدایت فرمائے کسی کی تو کھول دیتا ہے۔ اس کا سینہ اسلام کیلئے) اولیاء کرام کے ہدایت یافتہ ہونے کے بارے میں خود قرآن پاک شاہد ہے۔ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (۳۹-۲۲) کیا جس شخص کا سینہ کشادہ کیا ہے۔ اللہ نے واسطے اسلام کے۔ پس وہ ہوتا ہے اوپر نور کے۔ اپنے پروردگار کی طرف سے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا۔ کہ وہی کشف قابلِ اعتبار ہے جس کا تعلق اللہ اور اسلام سے ہو۔

صدر کی بدولت حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔[1]

اس طرح ان کے ارشادات کی بنیاد علم کتابی پر نہیں۔ بلکہ تائیدایزدی۔ شرح صدر اور مشاہدہ پر قائم رہتی ہے۔ اسی لئے اسلامی تصوف میں ملفوظات اولیاءاللہ کا درجہ "کتابی علم" معمولی انسان کے "غور و فکر" اور ان کی رائے سے زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی حقیقت کو "علم" کے مقابلہ میں "عشق" کی اصطلاح سے واضح کیا ہے۔ اور "علم سراپا[2] حجاب اور عشق سراپا حضور" اور "علم مقام صفات عشق تماشائے ذات" کہہ کر علم پر عشق کی فضیلت ثابت کی ہے۔ اسلامی تصوف میں علم کے مقابلے میں "عرفان" کی اصطلاح ہے۔ عشق سے یہاں علامہ کی مراد "عرفان" ہی ہے۔ چنانچہ اپنے پہلے خطبے میں انہوں نے علم کا مقابلہ عرفان سے کیا ہے۔ اور عرفان ہی کی فضیلت ثابت کی ہے۔

اکابر صوفیہ وجود حقیقی کی پہلی تجلی کو "حقیقت محمدی" اور آخری تجلی کو "حقیقت انسانیہ" قرار دیتے ہیں جو تمام مراتب کی جامع ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ انسان بلحاظ وجود حق کا عین ہے اور بلحاظ تعین اس کا غیر ہے۔ اور یہ غیریت اعتباری و اضافی ہے۔[3] "اعتبار" کی مثال یہ ہے کہ اگر ہم ایک رسی کے ٹکڑے کو جس کے ایک سرے پر ایک آتشیں گیند

---

[1] فلسفۂ جدید بھی اب یہ تسلیم کرتا ہے۔ کہ حقیقت تک عقل و خرد کے ذریعہ نہیں۔ بلکہ وجدان کے ذریعہ ہی رسائی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے۔ کہ عقل حقیقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھتی ہے۔ اور وجدان بیک وقت کل حقیقت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ (خطبات اقبال)

[2] دیکھو نظم "علم و عشق" ضرب کلیم۔

[3] ملاحظہ ہو تحفۂ مرسلہ مؤلفہ حضرت ابوسعید علیہ الرحمۃ شیخ طریقت محبوب سبحانی حضور غوث اعظم قدس سرہ العزیز

بندھی ہو۔ ہاتھ میں لے کر زور سے گھمائیں تو ایک آتشیں دائرہ نظر آئے گا۔ یہ دائرہ حقیقی نہیں اعتباری ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ تمام اعداد و کسور ایک (۱) سے بنتے ہیں۔ ہم ایک کو نصف کا دوگنا کہیں یا دو کا نصف یا تین کا ایک تہائی لیکن ایک کی حقیقت میں ان "اضافات" سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمام کسور و اعداد اسی ایک میں مندمج ہیں اور اسی سے نمود پاتے ہیں۔ حالانکہ یہ مثالیں صحیح صورت حال کو پوری طرح واضح نہیں کرتیں تاہم غنیمت ہیں۔

بہرحال اسلامی تصوف میں "شے" کا ظاہری تعین اضافی اور اعتباری ہے۔ حقیقتِ شیٔ نہیں۔ نظر بریں اسلامی تصوف کے بموجب انسان چھوٹا سا جسم نہیں بلکہ اس کے اندر عالم امر اور عالم کون دونوں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ رُوح اللہ بھی اس میں موجود ہے لہذا وہ بلحاظ صورت مجملاً عالم صغیر ہے۔ اور آفاق جو اس کی تفصیل ہے۔ عالم کبیر ہے لیکن بلحاظ معنی یا مرتبہ انسان عالم کبیر اور آفاق عالم صغیر ہے۔ اسلامی تصوف ہی انسان کو اس قابل بناتا ہے۔ کہ وہ اپنے صحیح مقام و مرتبہ کو پہچانے اور آفاق میں گم ہو کر نہ رہ جائے اقبال بھی انہی معنوں میں کہتے ہیں :۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

قرآن پاک سے ثابت ہے کہ ملائکہ کا سجدہ حقیقت آدم یعنی رُوح اللہ یا ذات کو تھا۔ اسی لئے وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ[1] کے بعد فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ[2] فرمایا۔ اس کے علاوہ فضیلت آدم کے سلسلہ میں متعدد آیات و احادیث موجود ہیں۔ جن کے

---

[1] اور جب پھونک دوں اس میں اپنی روح۔ (۱۵-۲۹)
[2] تو گر پڑو اس کے آگے سجدے میں۔ (۱۵-۲۹)

اعادہ کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اپنے جگر گوشوں کو تعلیم فرمایا تھا:۔

ترجمہ:۔ "اے فرزند! تیری فکر تجھ میں تیرے لئے کافی ہے۔ کیونکہ کوئی شئ تجھ سے خارج نہیں۔ تیری دوا تجھ میں ہے۔ لیکن تو نہیں دیکھتا۔ تجھ کو گمان ہے کہ تو چھوٹا سا جسم ہے۔ حالانکہ تیرے اندر ایک عالم اکبر لپیٹا ہوا ہے۔ وغیرہ وغیرہ [1]

اور حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ فرماتے ہیں:۔

تو بمعنے جانِ جملہ عالمے
ہر دو عالم خود توئی بنگر دمے

درحقیقت خود توئی اُمُّ الکتاب!
خود زخود آیاتِ حق را باز یاب

تو بمعنی برتری از اِنس وجاں
ہرچہ بینی خود توئی بنگر بداں

ہرچہ موجود است در عالم توئی
وآنچہ توجویائی آنی ہم توئی

حضرت عطارؒ کی یہ نظم (طویل) اور اس کے علاوہ دیگر اکابر صوفیہ کے ہزاروں اشعار و ارشادات کتب تصوف میں مذکور ہیں۔ جنہیں شوق ہو ان میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ کیا حقیقت انسانیہ کی مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں یہ الزام غلط اور بے بنیاد

[1] دیکھو تعلیم غوثیہ صہ ۲۵۵، صہ ۲۵۶

نہیں کہ اسلامی تصوف نفی خودی کی تعلیم دیتا ہے۔ جن کا یہ قول ہے انہیں دراصل اسلامی تصوف کی ہوا بھی نہیں لگی۔ نہ انہوں نے صوفیائے کرام کی "فنا" و "بقا" کے متعلق صحیح معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ بس مستشرقین یورپ کی تقلید میں الزام عائد کر دیا۔

عروج الی اللہ یا حصولِ قرب:۔

انسان سے متعلق مذکورہ بالا امور پر بحیثیت مجموعی نظر رکھتے ہوئے قرآن پاک میں انسان کو بلحاظِ مرتبہ ایک ایسی حقیقت جسے ملائکہ بھی سجدہ کریں۔ بلحاظ نفس چار قسموں (نفس امارہ۔ نفس لوامہ۔ نفس ملہمہ۔ نفس مطمئنہ) میں اور بلحاظ اعمال تین گروہوں (اصحاب مشئمہ۔ اصحاب یمین اور مقربین) میں منقسم بتایا گیا ہے اور ہر ایک کے اوصاف خصوصی اور جزا و سزا کا ذکر بھی اسی میں موجود[۵] ہے۔

اسلامی تصوف میں انہی حقائق کو کہیں "عبد کے چار اعتبارات" (فقر، امانت، خلافت ولایت[۶]) کے تحت۔ کہیں شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے عنوانات سے۔ کہیں نزول و عروج کی اصطلاحات کے پردہ میں۔ کہیں فنا، بقا، کہیں حضور و قرب اور وصال و فراق کہیں وحدت وجود اور وحدت شہود، کہیں صدق و احسان اور کہیں خلافت و ولایت وغیرہ کے تحت بیان کیا جاتا ہے۔ اور علامہ اقبال نے انہی حقائق کو خودی اور قلندری کے تحت بیان کیا ہے۔ لیکن ماحصل سب کا قریب قریب ایک ہے

---

[۵] دیکھو سورۂ واقعہ

[۶] تفصیل کے لئے دیکھو "تصوف اور قرآن" از ڈاکٹر میر ولی الدین۔

Marfat.com

سرکارِ دوجہاںؐ[1] صلے اللہ علیہ وسلم کا نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ حضور فرائضِ نبوت کی ادائیگی کے علاوہ اپنی شانِ ولایت کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

لِی مَعَ اللّٰہِ وَقْتٌ لَا یَسَعُنِیْ فِیْہِ نَبِیٌّ مُّرْسَلٌ وَمَلَکٌ مُّقَرَّبٌ

(یعنے مجھے اللہ تعالےٰ کے ساتھ ایسا وقت نصیب ہوتا ہے۔ جس میں نہ کوئی نبی مرسل بار پا سکتا ہے اور نہ کوئی مقرب فرشتہ)۔

غور کیجیے حضورؐ کے مقامِ عروج پر۔ اور اس بلند و برتر مقام پر آپ اسی جسم و تعین کے ساتھ جو آپ ہی کے لئے مخصوص تھا، فائز ہوا کرتے تھے۔

(صوفیائے کرام بھی سرکار دوجہاںؐ کا مکمل اتباع کرتے ہیں اور ظاہری و باطنی نعمتوں سے حسب استطاعت اسی طرح مستفیض ہوتے ہیں)

مذکورۂ بالا حدیث شریف کے علاوہ معراج شریف کے واقعہ سے کس مسلمان کو انکار ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حدیث لِی مَعَ اللّٰہِ ..... اور معراج نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کے واقعہ سے متعدد باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً

(۱) نبی کی ولایت (حصولِ قرب یا عروج الی اللہ) وصال بحق ہے۔ اور احکامِ الٰہی کا مخلوق تک پہنچانا امر نبوت ہے۔ امرِ نبوت امرِ ولایت کے مقابلے میں ایک قسم کا نزول یا فراق ہے۔ اسی لحاظ سے نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہوتی ہے۔

(۲) نبی بنایا ہی جاتا ہے۔ ایسا شخص جو پہلے اللہ تعالےٰ کے فضل سے اس کا مقرب خاص بن چکا ہو (یعنے کسب علم سے منصب نبوت حاصل نہیں ہوتا) ولایت کا دروازہ البتہ سب کے لئے کھلا ہوا ہے اور بالعموم اس کا انحصار مجاہدہ پر ہے۔ بشرطیکہ اللہ

---

[1] دوجہاں سے اقالیم نبوت و ولایت مراد ہیں۔

Marfat.com

بھی اُسے قبول فرمالے۔

(۳) سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو جو مقامِ قرب حاصل تھا۔ وہاں کوئی دوسرا نبی، ولی یا ملکِ مقرب نہیں پہنچ سکتا۔

(۴) یہ عروج اسی دنیا کی زندگی ہیں حاصل تھا اور عاشقانِ رسولؐ کے لئے جو آپؐ کے طریق (ظاہری و باطنی) پر بخلوص تمام عمل پیرا ہوں گے اس عروج الی اللہ کا دروازہ تا قیامت کھلا رہے گا۔ اور وہ بقدرِ توفیق و اہلیت مختلف مراتبِ ولایت پر فائز ہوتے رہیں گے۔

(۵) نائب حق، نائب رسولؐ ہی ہو سکتا ہے (منکر یا غافل نہیں) اس کے لئے شریعت اور طریقت دونوں کا اتباع ضروری ہے۔

(۶) جو انسان پہلے مقرب حق نہ بنے وہ ہرگز نائب حق یا "خلیفۃ اللہ فی الارض" نہیں ہو سکتا۔

(۷) محض تبلیغ احکام سے (جیسا زاہدان خشک یا علمائے سوء کرتے ہیں) یا محض معقول انتظام مملکت سے (جیسا کہ بعض خدا فراموش انسان بھی کر سکتے ہیں) سرکار دوجہاںؐ کی مکمل پیروی کا حق ادا نہیں ہوتا۔ کیونکہ کامل پیروی تو یہ ہے کہ قُرب الی اللہ حاصل کرنے کے لئے بھی آپ کا اتباع کیا جائے۔

(۸) حصولِ قربِ الٰہی زندگی کے تمام امور اور تمام ترقیوں سے اشرف و افضل ہے۔ اس کے لئے علمِ معرفت ضروری ہے۔ جس کی توصیف خود سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح فرماتے ہیں:۔

اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ عِلْمٌ عَلَى اللِّسَانِ فَذَالِكَ حُجَّةُ اللّٰهِ

تَعَالٰی عَلٰی اِبْنِ اٰدَمَ وَعِلْمٌ فِی الْقَلْبِ فَذٰلِكَ الْعِلْمُ نَافِعٌ

یعنے علم دو ہیں ایک علم زبان پر ہے۔ سو یہ اللہ تعالیٰ کی حجت ہے (علمِ شریعت) اولادِ آدم پر۔ اور ایک علم دل کے اندر ہے۔ پس یہی علم نافع ہے (دوسرا علم جس کا تعلق قلب سے ہے وہی علم توحید و معرفت ہے)

ایک دوسری حدیث[1] اس سے زیادہ واضح ہے۔ قَالَ عَلَیْهِ السَّلَامُ :-

اِنَّ مِنَ الْعِلْمِ کَهَیْئَةِ الْمَکْنُوْنِ لَا یَعْلَمُهٗ اِلَّا اَهْلُ الْمَعْرِفَةِ بِاللّٰهِ تَعَالٰی فَلَا تُحَقِّرُوْا عَالِمًا اٰتَاهُ اللّٰهُ عِلْمًا مِنْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ لَمْ یُحَقِّرْهُ اِذْ اٰتَاهُ اِیَّاهُ۔

یعنے " البتہ بعض علم درِ مکنون کی مانند ہیں۔ کوئی نہیں جانتا ان کو عارفانِ خدا کے سوا۔ جب وہ عارف اس علم کو بیان کرتے ہیں۔ تو سوائے ان لوگوں کے جو اللہ کی نسبت دھوکا کھانے والے ہیں اور کوئی اس علم سے جاہل نہیں رہتا۔ پس جس عالم کو (مراد عارف ہے) خدائے تعالیٰ نے اس علم (معرفت) میں سے حصہ دیا ہو اس کو حقیر مت جانو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُسے حقیر نہیں کیا جب کہ اُسے وہ علم عطا فرمایا۔"

اسلامی تصوف کا خاص الخاص شعبہ یہی ہے کہ وہ مسلم و مومن کو عروج الی اللہ اور قربِ حق کے حصول کے طریقے تعلیم کرتا اور اس کی عملی تربیت دیتا ہے۔ اس کے تمام اصول قرآن و سنت[2] سے ماخوذ ہیں۔ اولیاء کرام نے اپنے اپنے زمانے کے حالات

---

[1] اسے عبدالرحمن سلمی رضؓ نے حضرت ابو ہریرہ رضؓ سے روایت کیا ہے۔

[2] جو امور قرآن و سنت سے ثابت نہ ہوں وہ اسلامی تصوف سے خارج ہیں۔ (باقی صفحہ ۸۶ پر)

Marfat.com

کے مطابق حسب ضرورت طریقوں (یا تصوف کی جزوی تعریف) میں فروعی تغیر و تبدل کر دیا لیکن اصل حقیقت کو اپنی جگہ برقرار رکھا۔ ان "تبدیلیوں" کی حیثیت زیادہ سے زیادہ وہی ہے جو شریعت میں فقہی احکام کی ہے۔ بعض حضرات نے ان "فروعی تبدیلیوں" کو اصل کی تبدیلیاں سمجھ کر کہہ دیا۔ کہ یہ "عجمیت" [۵] ہے۔ یا اسلامی تصوف کی "تاریخ" مدوّن کرنے کے چکر میں پھنس گئے (جس طرح صرف فقہی احکام کی "تاریخ" اسلام کی تاریخ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح باطنی احکام اسلام میں صرف فقہی تبدیلیوں کو "تاریخ تصوف" نہیں کہہ سکتے) تعجب ہے کہ فقہی اور فروعی تبدیلیوں یا اضافوں کی وجہ سے اسلام کو "عربی اسلام" اور "عجمی اسلام" میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔ لیکن اسلام کی حقیقی رُوح اور اس کے حُسن و جمال (یعنے اسلامی تصوف) کو خواہ مخواہ "عربی" اور "عجمی تصوف" میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔

بہر حال ذکر عروج الی اللہ اور حصول قرب کا تھا۔ اس کا ثبوت واقعۂ معراج النبی صلے اللہ علیہ وسلم اور حدیث لِیْ مَعَ اللّٰہ ..... کے حوالوں سے دیا جا چکا ہے۔ ذیل میں چند آیاتِ قرآنی بھی پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں "اللہ سے ملاقات کرنے" اور "اس کی طرف رجوع کرنے کا ذکر موجود ہے۔ مثلاً

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (۲-۱۵۶) ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف پھر جائیں گے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۵ :۔ لیکن فیصلہ کرتے وقت یہ بھی ضرور ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ عُلمائے طریقت کا اجتہاد اور ان کا عمل بھی جزو اسلام ہے کیونکہ جب کسی امر کی ممانعت صریح کسی نص قطعی یا حدیث صحیح سے ثابت نہ ہو تو وہ مباحات میں داخل ہوتا ہے۔ ۱۲

[۵] پہلے علامہ اقبال کا بھی یہی خیال تھا لیکن رفتہ رفتہ اس خیال کی اصلاح ہو گئی۔ ملاحظہ ہو نقد اقبال۔ از حضرت میکش اکبر آبادی۔ اس سلسلے میں "عجمیت" کے تحت چند سطور آئندہ صفحات میں ملاحظہ ہوں۔

Marfat.com

وَإِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْأُمُوْرُ — اور تمام امور اللہ کی طرف پھیرے جاتے ہیں۔

(۲-۲۱۰) یا

وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنْتَهَىٰ — اور یہ کہ تیرے پروردگار کی طرف انتہا ہے۔

(۵۳-۴۲) یا

إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيْهِ — اپنے رب کی ملاقات کے لئے خوب محنت

(۸۴-۶) — کر۔ پس ملنا ہے تجھے اُس سے۔

اور عبادات و مراقبہ کی تعلیم (بلکہ حکم) آیۂ ذیل میں کسی قدر صاف و صریح الفاظ میں موجود ہے۔ حکم ہوتا ہے :۔

وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ط — اور ہر طرف سے منقطع ہو کر اسی کی (یعنے

(۷۳-۸) — اللہ کی) طرف متوجہ ہو جا۔

اور آیاتِ ذیل تو تمام نکاتِ تصوف کی جامع ہیں۔ مگر اُن کے لئے جو غور کرتے ہیں

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ — اے نفسِ مطمئنہ چلا آ اپنے رب کی طرف۔

ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً — تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی پس شامل

مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِي فِي — ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری

عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ — جنت میں۔ (۹۰ - ۲۷ تا ۳۰)

خط کشیدہ الفاظ کی شرح اسلامی تصوف کی شرح ہو گی۔ ایک دریا کوزے میں بند ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی "معراج" قرب و دیدارِ حق۔ اور حق سے کلام حق کرنے

لے اس آیت کے معنے یا مفہوم میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔

Marfat.com

کی نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ حد تک بہرہ یاب ہونے کی داستان ہے۔ عوام اسی بحث میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ وہ "روحانی" تھی یا "جسمانی"۔ لیکن عرفاء جانتے ہیں کہ وہ "قرب ذاتی کی انتہا تھی۔ (جس میں قربِ دیدار و مشاہدہ اور کلام کی وہی نوعیت تھی۔ جو عرفاء نے بیان کی ہے[۱]۔ حدیث شریف ہے۔

اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ چنانچہ عرفاء کے نزدیک جس صلوٰۃ میں معراج (قرب و مشاہدۂ حق) نہ ہو وہ "صلوٰۃ" نہیں ہوتی۔ بعض حضرات اب صلوٰۃ کے بھی نئے نئے معنے بیان کرتے ہیں۔ لیکن

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ط یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ط اور الفاظ "صلی اللہ علیہ وسلم" کے پیش نظر "صلوٰۃ" کے معنے "مادی سیاسی ترقی" نہیں ہو سکتے۔ اور مذکورۂ بالا حدیث (الصلوٰۃ معراج المؤمنین) میں لفظ معراج کے مسلمہ خصوصی معنے کے ساتھ "صلوٰۃ" کے معنے بھی وہی ہو سکتے جن پر آج تک علمائے اسلام کا اتفاق رہا ہے[۲]۔

---

[۱] قرب حق "حقیقت انسانیہ" کو نصیب ہوتا ہے۔ پھر "حقیقتِ محمدیؐ" کے قرب کے کیا کہنے۔ اگر حضور محبوب خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے "جسم و جان" ہی کی حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو یہ بحث کہ آپ کی معراج جسمانی تھی یا روحانی پیدا ہی نہ ہو۔

[۲] سلطان العارفین مرشدنا و مولانا قبلہ شاہ نیاز احمد بریلوی قدس سرہٗ العزیز فرماتے ہیں:۔ "صلوٰۃ ہرگاہ کہ منسوب بحق تعالےٰ می شود۔ معنی او رحمت می باشد و ہرگاہ بسوئے ملائکہ منسوب مے شود۔ معنی او استغفار می باشد و ہرگاہ منسوب بسوئے وحوش و طیور منسوب می شود معنی او تسبیح می باشد و ہرگاہ بسوئے انسان منسوب مے شود معنی او دعا می باشد۔" (شمس العین شریف)

Marfat.com

حدیث احسان مشہور حدیث ہے حضورؐ فرماتے ہیں کہ تو عبادت اس طرح کر کہ گویا تو خدا کو دیکھ رہا ہے نیز قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ بھی آپؐ ہی کا ارشاد گرامی ہے (یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے) آنکھوں کی ٹھنڈک اور مشاہدہ حق کا تعلق ظاہر ہے حضورؐ کے لئے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ یعنی سجدہ کر اور قریب ہو (۹۶-۱۹) اور خود حضورؐ کا ارشاد ہے۔

لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ۔ نماز نہیں ہوتی جب تک حضور قلب نہ ہو۔

معلوم ہوا کہ حضور قلب ہی "معراج المومنین" ہے اور اسی کے لئے واقترب آیا ہے۔

قرآن پاک میں یہ آیت بھی ہے:۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ط

یعنے اللہ دوست ہے ایمان والوں کا وہ انہیں "تاریکی" سے نکال کر "نور" میں داخل کرتا ہے (۲-۲۵۷)

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ یہاں "ظلمات" سے مراد شریعت میں معصیت اور طریقت میں وہم غیریت ہے اور "نور" سے مراد نور توحید یا نور ذات ہے اور فرماتے ہیں کہ جب مومن کو حق تعالیٰ اپنے فضل سے نور توحید یا (نور ذات) میں داخل کر لیتا ہے تو اس کی نظر ہر وقت حق پر ہی پڑ سکتی ہے اور وہ کہہ اٹھتا ہے۔

کجا غیر و کو غیر و کو نقش غیر ھو اللہ و اللہ ما فی الوجود

قرآن پاک بھی یہی شہادت دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ (۲-۱۱۵)

(یعنے تم جس طرف بھی رخ کرو گے پس دیکھو گے اللہ کو)

اولیاء کرام نے "وجہ اللہ" کے معنی اللہ کی ذات ہی لئے ہیں۔ یہیں ایک نکتہ یہ بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ جب تک نعمت "مشاہدہ" میسر نہ ہو وہ شہادت جو کلمہ شہادت کے ذریعہ دی جاتی ہے جھوٹی رہتی ہے۔ کیونکہ شہادت بلا مشاہدہ نہ شریعت میں قابل قبول ہے نہ طریقت میں۔

Marfat.com

اسلامی تصوف ہی اس شہادت کو بامشاہدہ بناتا ہے "عروج الی اللہ" اور "مشاہدہ ذات" کے علاوہ مرتبہ ولایت میں "دوام ذکر" بھی ہے جس کی تاکید قرآن پاک میں اس طرح ہوتی ہے۔

فَاِذَا قَضَیْتُمُ الصَّلٰوۃَ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِکُمْ (۴ - ۱۰۳)

یعنی جب تم پڑھ چکو نماز تو ذکر کرو اللہ کا کھڑے۔ بیٹھے اور لیٹے۔ ذکر اللہ کی تائید میں اور بھی کئی آیات و احادیث موجود ہیں جن کا اعادہ بخوف طوالت نہیں کیا جاتا۔

مذکورۂ بالا آیت ہی سے ثابت ہو جاتا ہے کہ نماز کے علاوہ "ذکر دوام" کا حکم دیا جارہا ہے۔ چنانچہ اس کے طریقے بھی صوفیائے کرام ہی نے مقرر کئے ہیں۔ جن پر عمل کر کے ہم کھڑے، بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر "اللہ کا ذکر کر سکتے ہیں۔ اس کے لئے بھی ہمیں عیسائی راہبوں، بدھ مت کے بھکشوؤں اور ہندو سنیاسیوں کی طرح بستی چھوڑ کر ویرانہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اسی معاشرے میں رہ کر مذکورۂ بالا حکم الٰہی کی تعمیل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم ان سے اس کے طریقے سیکھ لیں جنہیں قرآن پاک میں "اہل الذکر"[1] کہا گیا ہے اور پھر اپنے قلب و نظر کی تربیت کر لیں۔ اس قسم کی "تعلیم و تربیت" بھی اسلامی قرآنی تصوف ہی کے دائرے میں آتی ہے اور وہی "دل بیار۔ دست بکار" کے اصول پر صوفی کی تربیت کر کے اسے راہب یا جوگی بننے سے روکتا ہے۔ ہمارے تصوف پر رہبانیت سکھانے کا الزام بہتان عظیم اور خود اپنی لاعلمی کا بیّن ثبوت ہے۔

بعض حضرات "ذکر اللہ" سے اعمال صالحہ مراد لیتے ہیں۔ زبان یا قلب سے حق تعالیٰ کی حمد و ثنا ان کی نظر میں "ذکر" نہیں ہے۔ لیکن اس نئی تاویل سے عبادت الٰہی (بالخصوص نماز) ان کے "اعمال صالحہ" کی فہرست سے خارج ہو جاتی ہے۔ قرآن میں ہے۔

---

[1] فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (پس دریافت کرو اہل ذکر سے اگر تم نہیں جانتے ۱۶ - ۴۳) قرآن پاک، احادیث نبوی ہی سے یہ بھی ثابت ہے۔ کہ انبیاء اولیاء اور عباد الصالحین ہی "اہل ذکر" ہیں۔

Marfat.com

فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ (۲ - ۱۵۲)

یعنے تم یاد کرو مجھ کو میں یاد رکھوں گا تم کو یا تم ذکر کرو میرا، میں ذکر کروں گا تمہارا حدیث میں آیا ہے کہ اس حال میں مرو کہ یاد اللہ سے زبان تر ہو۔ صوفیائے کرام نے ذکر کے معنے یاد الٰہی کئے ہیں اور ہر وہ فعل یا حالت بھی جس سے یاد الٰہی تازہ ہو اور طالب و مطلوب کے درمیان رابطہ بڑھے "وہ ذکر" کی پانچ قسمیں بتاتے ہیں، لسانی، قلبی، روحی، سرّی اور خفی وہ ہر ایک کے مختلف طریقے بھی تعلیم کرتے ہیں۔ بعض نے ذکر کی دو قسمیں بتائی ہیں (۱) جہری (۲) سری

فاضل مترجم قرآن عبداللہ یوسف علی نے بھی اپنے ترجمہ میں مذکورہ بالا آیت کے تحت ان تمام اقسام کا ذکر کیا ہے اور لفظ "ذکر" کا ترجمہ بھی وہی کیا ہے۔ جو صوفیائے کرام کرتے ہیں۔

صوفیائے کرام کے نزدیک "یاد الٰہی" ہی "زندگی" ہے اس کے برعکس غفلت ہے جسے وہ "دنیا" اور "موت" سے تعبیر کرتے ہیں اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اسلامی تصوّف ہر وقت گوشہ نشینی اور صرف تسبیح خوانی کو "زندگی" کہتا ہے جیسا کہ مخالفین تصوف اور نام نہاد "صوفی" عموماً سمجھ لیتے ہیں پہلے ہی مذکور ہو چکا ہے کہ اسلامی تصوّف "دل بیار دست بکار" کے اصول پر انسان کی تربیت کرکے اسے "نیابت الٰہی" کے قابل بناتا ہے وہ اسے کسی مشغلۂ زندگی سے نہیں روکتا بشرطیکہ دل یاد الٰہی سے غافل نہ ہو اور وہ مشغلۂ زندگی "منشا الٰہی کے خلاف (یعنی گناہ) نہ ہو منشا الٰہی کے خلاف اور یاد اللہ سے خالی جو زندگی ہو اسی کو وہ "موت" "غفلت" یا "دنیا" قرار دیتے ہیں۔ حضرت مولانائے رُومؒ کا یہ شعر ثبوت کے لئے کافی ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

یہ ضروری ہے کہ صوفی کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب کہ وہ "یاد الٰہی"

Marfat.com

کے نشے میں کچھ اس طرح مست و مستغرق ہو جاتا ہے کہ پھر اسے کوئی دوسرا مشغلہ اچھا ہی نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن اس صورتِ حال پر کسی کو اعتراض کا حق حاصل نہیں ہے۔ بقول شخصے ؎

مجھے تو ہے مرغوب مجنوں کو لیلیٰ
پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی

اور اللہ سے بہتر اللہ کے طالب کے لئے کونسی چیز ہو سکتی ہے۔ جس سے اس کا دل قرار پکڑے۔ یا جو اس کے لئے موجب راحت ہو۔

علامہ اقبال مذکورۂ بالا کسی امر کے خلاف نہیں۔ وہ بھی "خلافت فی الارض" یا "نیابت الٰہی" پر کافی زور دینے کے بعد "عروج الی اللہ" (ولایت) کی دعوت دیتے ہیں چنانچہ "اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" کے بعد اسی کی پُرزور وکالت کی گئی ہے۔ اور وہ "قلندری" کی تبلیغ پر ختم ہوتی ہے۔ قلّتِ گنجائش کے باعث صرف چند مثالیں دی جاتی ہیں "ساقی نامہ" (بالِ جبریل) میں ہے۔

یہ عالم یہ ہنگامہ رنگ و صوت	یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش	جہاں "زندگی" ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں	مسافر[۱] یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں	جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر	طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر[۲]

۱؎ صوفیائے کرام لفظ "سالک" استعمال کرتے ہیں جس کے لغوی معنے یہی ہیں۔ میرا مضمون موت و حیات بھی دیکھو۔

۲؎ "طلسم زمان و مکاں اور اس خاکداں کے کوہ گراں کو توڑ کر آگے بڑھ جانے" کے طریقے ہمیں فرمودات اقبال میں نہیں ملتے نہ کہیں وہ دینی، نفسی باریکیاں نظر آتی ہیں جو "آگے بڑھنے والے" (بقیہ صفحہ آئندہ)

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود[11]

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں[12] — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا — ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
انہی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

ہر اک مقام[13] سے آگے مقام ہے تیرا — حیات ذوقِ سفر[14] کے سوا کچھ اور نہیں

مقامِ بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر — زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی — نہ تیرہ خاک لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں[15] بروں جستند
طلسمِ مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

حاشیہ صفحہ ماقبل :۔ کو کفر و الحاد سے محفوظ رکھیں ! اس زبردست کمی کو " اسلامی تصوف " ہی پورا کرتا ہے۔

[11] یعنے یہ ظاہر نہیں ہیں۔ لیکن " ضمیرِ وجود " کے اندر موجود ہیں " وجودی تصوف " کے نظریۂ تنزلات سے مقابلہ کیجئے۔ مرکزی خیال مشترک ہے۔

[12] یعنے اس عالمِ حس و شہادت سے آگے دوسرے جہاں بھی ہیں۔ اقبال ان کی تفصیل نہیں بتاتے۔ اسلامی تصوف میں انہیں " عالمِ مثال " " عالمِ ارواح " " عالمِ ملکوت " وغیرہ یا ملکوت ، جبروت ، لاہوت وغیرہ کہتے ہیں۔ سالک اگر صوفیائے کرام کے مقررہ طریقوں پر حاوی ہو جائے تو ان جہانوں کی سیر بھی کرتا اور ان پر متصرف بھی ہوتا ہے۔

[13] یہ الفاظ وسیع معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اور ان کا تعلق " حقیقتِ انسانیہ " اور ان عالموں سے ہے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یہاں سفر سے مراد " سفر فی البلاد " نہیں بلکہ (باقی صفحہ آئندہ)

Marfat.com

جاوید نامہ میں علامہ نے ایک جگہ رومی کی زبانی "عشق" اور "معراج" کے اسرار بیان کئے ہیں۔ بخوف طوالت یہاں وہ اشعار درج نہیں کئے گئے لیکن اس سلسلہ میں تین باتیں نہایت اہم ہیں۔

اوّل :۔ بعض مغلوب الحال صوفیائے کرام کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ مثلاً اَنَا الحَق کی طرح ایسے اشعار مثلاً :

مرد مومن در نساز و باصفات
مصطفٰےؐ راضی نہ شد اِلّا بذات

وغیرہ کے معنے بھی دو پہلو رکھتے ہیں ایک سے "دوئی" یعنے : دو مستقل وجودوں کی موجودگی اور دوسرے سے "توحید" یعنے وجود حقیقی کی وحدت مستحکم ہوتی ہے۔ ایسی وحدت جس میں یہ نہ کہنا چاہئے کہ بندہ خدا ہوگیا۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ خدا ہی خدا ہے بندہ کچھ نہیں کیونکہ اس منزل پر پہنچ کر صفات عبدی صفات حق میں خود مضمحل ہو جاتی ہیں اسی کی تصدیق سرکار دوجہاںؐ کو مخاطب کر کے خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی[1] سے اور سرکار دو عالمؐ نے حدیث قدسی (قرب نوافل) بِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ[2] ۔۔۔ الخ سے فرمائی ہے توحید کی یہ صورت الفاظ میں ناقابلِ تشریح ہے اس میں بظاہر تو رسول اللہؐ کا ہاتھ (بوقت بیعت) لوگوں کے ہاتھوں پر تھا۔ لیکن اسے اللہ پاک نے اپنا ہاتھ فرمایا یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ

حاشیہ صفحہ ما قبل :۔ وہ سفر" مراد ہے جسے اسلامی تصوف میں "عروج الی اللہ" کہتے ہیں "سیر فی اللہ" اور سیر عن اللہ باللہ" اسی کی اصطلاحات ہیں اور "مقام" بھی۔

ملے مراد "مادیات" جو اصل مقصود حیات مقرر کر لی جائیں اس کے باعث انسان قلب و روح کے عروج سے محروم رہ جاتا ہے مضمون "موت و حیات" بھی دیکھو۔

[1] اور [2] کا ترجمہ صفحہ ۵۴ پر دیکھو۔

(۴۸-۱۰) اللہ خود اپنے "محبوب بندے" کی زبان، آنکھ اور اس کے ہاتھ پاؤں بن جاتا ہے۔ درآنحالیکہ بظاہر عبد مذکور کے مذکورہ اعضائے جسم ہر انسان کے فنا پذیر اعضائے جسم کے مانند ہی رہتے ہیں۔ دوسری مثالیں تمثّل و تجلّی کے بیان میں کسی گزشتہ صفحہ پر گزر چکی ہے۔

غرض یہ کہ اس منزل میں صوفیائے کرام کا مسلک ظاہر بینی کی بجائے حقیقت پرستی ہے اور وہ بلحاظ "وجود حقیقی" ہرگز ایسے قول، اصول یا نظریے کو قبول نہیں کرسکتے جس سے دوئی مستحکم ہوتی ہو کیونکہ اسلام میں دو مستقل وجودوں کی موجودگی کا عقیدہ رکھنا ہی شرک فی الذات ہے۔ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ۔

دوم جہاں تک معراج نبوی صلعم کا تعلق ہے صوفیائے کرام اسے صرف "انقلاب اندر شعور" نہیں سمجھتے جیسا کہ اقبال نے ایک جگہ مذکورہ اشعار میں بیان کیا ہے نہ ایسا قرآن و حدیث ہی سے ثابت ہوتا ہے "معراج" تو دراصل "تقرب حق" ہے جو خود حق تعالیٰ عطا فرماتا ہے اسمیں ذات عبد کو خود ذاتِ حق اپنے اس قدر قریب کرلیتی ہے یا خود اس کے قریب ہوجاتی ہے) کہ عبد و حق میں تمیز و امتیاز مشکل ہوجاتا ہے خود علامہ اقبال جاوید نامہ میں فرماتے ہیں

عبدہٗ از فہم تو بالاتر است
زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
عبدہٗ صورت گرِ تقدیر ہا
اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
لا الٰہ تیغ و دمِ او عبدہٗ
فاش تر خواہی بگو ھو عبدہٗ

اس "محبوب عبد" کا انتخاب بھی ذات حق کرتی ہے اور پھر اسے اپنے قرب کی نعمتوں سے

لہ اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اگر نماز حقیقی معنے میں ہو تو اس سے مومن کو معراج حاصل ہوتی ہے۔

Marfat.com

جس حد تک چاہتی ہے نوازتی ہے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر ان نعمتوں کی حد کمال کو پہنچ گئی)۔

اگر معراج محض "انقلاب اندر شعور" ہوتا تو وہ ہر عامی، عالم اور حکیم کو بھی حاصل ہوتا رہتا ہے خواہ وہ خداؐ ورسولؐ کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔ کافر و مشرک کے شعوری انقلاب کو اسلامی نقطۂ نظر سے "معراج" نہیں کہہ سکتے

سوم:۔ یہ کہ مذکورہ اشعار میں جن معجزات وکرامات کی جانب اشارے کئے گئے ہیں وہ انبیاء کرام اور اولیاء اسلام ہی کی ذات سے منسوب ہیں انہیں عوام کی تگ و دو اہل فلسفہ وسائنس یا اہل سیاست کی زبان میں عملی کارناموں کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے۔ اس لحاظ سے "معراج" اور "اسرارِ معراج" کے وہی معنی لئے جائیں گے۔ جو اولیا اللہ نے بیان کئے ہیں اس کے خلاف دوسرے معنے لینے سے "معراج النبی" صلی اللہ علیہ وسلم اور اسرار معراج کے متعلق ہونے چودہ سو برس کے تمام علماء کرام و اولیاء اسلام کے عقائد "معاذ اللہ" غلط ثابت ہوں گے اور علامہ اقبال کو دنیائے اسلام میں "معراج نبویؐ" کی مسلمہ تعبیر وتشریح کا منکر کہا جائیگا۔

حضورِ قلب

سرکار دو جہاں صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی لَا صَلٰوۃَ اِلَّا بِحُضُوْرِ الْقَلْبِ اور اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ کا حوالہ پہلے گذر چکا ہے اور یہ بھی مذکور ہو چکا ہے کہ عروج قلب کا ہوتا ہے یہاں تک کہ نعمت حضوری نصیب ہو جائے اسی کو "حال" کہتے ہیں۔ جو اسلامی تصوّف کا اصل مقصود ہے۔ اقبال کہتے ہیں:۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں   اس کی تقدیر میں حضور نہیں

اور ایک خطبے میں فرماتے ہیں :۔

" فلسفہ کا کام اشیاء کا علمی مطالعہ ہے۔ اور اس حیثیت سے وہ ایک ایسے تصور سے آگے بڑھنے کی فکر نہیں کرتا جو تجربے کی گوناگوں انواع کو ایک نظام میں منسلک کر دیتا ہے۔ گویا وہ حقیقت کا مشاہدہ دور سے کرتا ہے اس کے برعکس مکاشفۂ قلبی حقیقت کو قریب سے دیکھتا ہے۔ اول الذکر محض نظریہ ہے۔ لیکن آخر الذکر (مکاشفہ) ایک زندہ تجربہ، حقیقت کے ساتھ ایک رابطہ اور اس کے قرب کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ قرب حاصل کرنے کے لئے فکر کو اپنی سطح سے بلند ہونا چاہیئے اور اپنی تکمیل قلب کے اس رجحان کی شکل میں کرنا چاہیئے ۔جسے مذہب کی زبان میں عبادت کہتے ہیں۔ اور یہی لفظ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلنے والے آخری الفاظ میں سے ایک تھا۔"

غرض یہ کہ عقلی دلائل سے حضوری نصیب نہیں ہوتی۔ فرماتے ہیں :۔

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت کہاں حجابِ دلیل

اور صوفیائے کرام تو بہت پہلے فرما چکے ہیں :۔

گر باستدلال کارِ دیں بُدے
فخر رازی رازدارِ دیں بُدے

علامہ اقبال کے خطبات سے اور زیادہ اقتباسات دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اختصار مدِ نظر ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

تو اے ناداں دلِ آگاہ دریاب
بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب

Marfat.com

چساں مومن کند پوشیدہ رافاش
زلا موجود الا اللہ دریاب

"حضور قلب" کی مزید تشریح کی یہاں گنجائش نہیں۔ حضرت شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے جبرئیل کی زبان سے کہلایا تھا:۔

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

علامہ اقبال بھی "ساقی نامہ" میں عروج کا ذکر کرتے ہوئے آخیر میں فرماتے ہیں

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمع نفس
مگر تاب گفتار کہتی ہے بس
"اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم"

لیکن پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ کہ یہ منزل "قال" کی نہیں "حال" کی ہے۔ صوفیائے کرام کے عقائد کے بموجب بیعت و اطاعتِ مرشد کے بغیر "حال" کی نعمت نصیب نہیں ہوتی۔ مولانا رومیؒ کا ایک شعر دونوں باتوں کے لئے کافی ہے۔ فرماتے ہیں۔

قال را بگذار و مردِ حال شو
پیشِ مردِ کاملے پامال شو

اور خود علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے

Marfat.com

حتیٰ کہ دنیاوی حکومت کے سلسلے میں بھی جمہوریت کی مخالفت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

اور اجتہاد فی الدین کی بابت فرماتے ہیں :-

زِ اجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

چنانچہ اولیاء اللہ کے مسلک میں بھی جو خدا تک پہنچا دینے کا ضامن ہے۔ اور جس میں "عالمانِ کم نظر" کے "اجتہاد" کی گنجائش نہیں ہے "اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر" اور "غلامِ پختہ کارے شو" ہی کے اصول بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تک پہنچنے کی راہ جمہوریت یا عالمانہ قیل و قال سے کہیں زیادہ نازک اور دشوار گزار ہے۔

فراق و وصال

طالب و مطلوب کے درمیان "فراق" و "وصال" کا معاملہ بھی عجیب نوعیت رکھتا ہے۔ اس کی بابت مولانا رومؒ فرماتے ہیں :-

خدایا ایں چہ بوالعجبی است!
کہ با دوستاں خود می کنی وقتیکہ ترا می جوئیم
خود را می یابیم و وقتیکہ خود را می جوئیم
ترا می یابیم (فیہ ما فیہ)

اور علامہ اقبال فرماتے ہیں :-

کرا جوئی؟ چرا در پیچ و تابی؟
کہ او پیداست تو زیرِ نقابی!

Marfat.com

تلاشِ اُو کنی جز خود نہ بینی
تلاشِ خود کنی جز اُو نیابی

اسی قسم کے اقوال دیگر اکابر صوفیہ کے بھی ملتے ہیں[1] صوفی اپنے ظاہری وجود کو جو باطل ہے "فنا" کر کے (یعنے اپنی توجہ اس کی جانب سے ہٹا کر) جب اپنے حقیقی وجود کو پالیتا ہے تو "تلاشِ خود کنی جز او نیابی" کی منزل پر پہنچ جاتا ہے اور اس وقت "مردِ حال" کہلاتا ہے۔

اسلامی تصوف کا ایک اجمالی خاکہ ہمارے سامنے آچکا اور اس کے ہر جزو سے علامہ اقبال کی موافقت و تائید بھی ثابت ہو چکی۔ ضمناً بعض غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کر دیا گیا۔ لیکن ابھی دو ایک غلط فہمیاں اور ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے مثلاً

مراجعت

اسلامی تصوف میں عروج الی اللہ کے بعد عالم ناسوت کی طرف مراجعت ضروری ہے۔ بشرطیکہ استغراق فی الحق میں سالک کے ہوش و حواس بکلی زائل نہ ہو گئے ہوں یا اس کی جان نہ پرواز کر گئی ہو جیسا کہ بعض اوقات ہوتا ہے۔ یہ "عروج" و "نزول" اور "آمد و رفت" برابر جاری رہتی ہے۔ یہاں تک کہ سالک اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ "خلق کو حق میں اور حق کو خلق میں" ہمیشہ دیکھنے لگے۔

بعض یورپین فلاسفروں نے وجدان کے ذریعہ حقیقت رسی کا نظریہ پیش کر کے

---

[1] پس ثابت ہوا کہ اقبال کی خودی (اَنَا) اور "فراق" و "وصال" کا مفہوم بھی وہی ہے جو صوفیائے کرام نے پیش کیا ہے۔ "فراق" و "وصال" سے متعلق مزید بحث مقالہ "موت و حیات" میں دیکھو۔

Marfat.com

انسان کو عقل کی غلامی سے نکال کر روحانیت کی ڈیوڑھی تک تو پہنچا دیا ہے۔ لیکن ابھی وہ صوفی کے واردات قلبی کو نتائجیت (PRAGMATISM) کی کسوٹی پر کس رہے ہیں چونکہ صوفی اور اسلامی تصوف کے متعلق ان کا تصور خالص عیسائیت اور عیسائی رہبانیت پر مبنی ہے (اسلام اور اسلامی تصوف پر نہیں)۔ اس لئے وہ ان پر کچھ اس قسم کی تنقید کرتے ہیں کہ "ایک صوفی اپنے واردات قلبی کی تجرد گاہ سے واپس آکر مخلوق کو اپنے واردات قلبی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ لیکن ایک نبی اس مقام سے واپس آکر انقلاب عظیم برپا کر دیتا ہے۔ لہذا صوفی کا مسلک دوسروں کے لئے بے کار ہے وغیرہ وغیرہ....."

اس قسم کا اعتراض عیسائی یا ہندو راہبوں پر تو کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک مسلم صوفی پر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اول الذکر کے پاس شریعت اسلامیہ جیسا کوئی عملی نظام حیات نہیں ہے۔ جسے وہ اپنی تجرد گاہ واردات قلبی" سے واپس آکر دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ لیکن آخر الذکر یعنے مسلم صوفی ہر لحاظ سے جانشین رسولؐ اور اس کا مسلک شریعت، طریقت اور حقیقت و معرفت کا جامع ہوتا ہے۔ وہ اپنے "واردات قلبی کی تجرد گاہ" سے مراجعت کر کے ہر وقت دنیا کے سامنے شریعت مطہرہ و طریقت اسلامیہ کا نظام حیات پیش کرتا ہے جس سے بہتر نظام حیات کوئی دوسرا مذہب نہیں پیش کرتا۔ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ امر ولایت رجوع الی اللہ ہے۔ اور امر نبوت اللہ کے حکم سے اس کے احکام مخلوق تک پہنچانا یعنے رجوع الی الخلق۔ چنانچہ نبی دونوں امور میں مصروف رہتا ہے۔ اور اسی طرح صوفیائے کرام بھی جو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل متبعین و جانشین ہوتے ہیں۔ دونوں امور میں مصروف رہتے ہیں۔ اور اپنے متبعین کو اسی کی نظری و عملی تعلیم دیتے ہیں۔

واردات یا مکاشفات البتہ منتقل نہیں ہو سکتے۔ ہر چیز کی طرح واردات قلبی کی لذت چکھنے ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ دوسرا شخص اپنا ذائقہ ہمیں الفاظ میں نہیں سمجھا

Marfat.com

سکتا۔ شیرینی کا ذائقہ تو منتقل نہیں ہو سکتا۔ البتہ شیرینی آپ کو دی جا سکتی ہے۔ دیگر مذاہب کے مفکرین کے پاس نہ شریعت اسلامیہ جیسی کوئی چیز ہے۔ نہ اسلامی تصوف ہے۔ اسی لئے وہ ذہنی انتشار میں مبتلا ہیں اور مذکورہ بالا نوعیت کے اعتراضات خود اپنے مذہب و مسلک کے پیش نظر کرتے ہیں۔ یہ انتشار ذہنی اسی وقت رفع ہو سکتا ہے۔ جب وہ اسلام اور اسلامی تصوف کو اختیار کر لیں۔

ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ تصوف میں عجمی امور داخل ہو گئے ہیں۔ آئیے اس پر بھی غور کر لیں۔

عجمیت

پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ اکثر احکام میں جن کا تعلق اسلام کے ظاہر و باطن سے ہے رفتہ رفتہ فقہی و فروعی امور کا اضافہ ہوتا رہا ہے۔ اصولاً وہ اضافہ بھی شریعت و طریقت اسلامیہ ہی کا جزو سمجھا جائے گا۔ آئندہ بھی ان میں ضروریاتِ زمانہ کے لحاظ سے تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ اصل اصول میں فرق نہ پڑتا ہو۔ اس قسم کے فقہی اور فروعی اضافوں کو "عجمیت" نہیں کہہ سکتے ہیں۔

ابتداً اسلام میں سادگی تھی۔ لیکن جب عربوں نے فلسفۂ یونان کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کیا تو انہیں فلسفے سے اپنے عقائد کے لئے خطرہ محسوس ہوا۔ لہٰذا اس کے رد میں کتابیں لکھیں جس سے علم کلام ایجاد ہوا۔ اس طرح اسلام کی سادگی ختم اور اس کی حیثیت علمی ہو گئی۔ یہی صورت اسلامی تصوف کی بھی ہوئی۔ لیکن یہ عجمیت قابل اعتراض نہیں ہو سکتی۔

یہ خیال بھی غلط ہے کہ تصوف کے اوراد و اشغال ہندو جوگیوں سے لئے گئے ہیں۔ یا "مراقبہ" عجمی طریقہ ہے۔ اوراد و اشغال میں جن الفاظ و فقرات کی تکرار کی جاتی

Marfat.com

ہے۔ وہ تقریباً سب کے سب قرآن پاک سے ماخوذ ہیں۔ ہندوستان میں غالباً حضرت بابا فریدالدین گنج شکر قدس سرّہ نے سب سے پہلے بعض مریدوں کو بعض اشغال کا ترجمہ ہندی زبان میں تعلیم فرمایا تھا۔ اسی طرح آج بھی ایسے اشخاص کو جو عربی تلفظ ادا نہ کرسکتے ہوں اور عربی الفاظ کا مطلب نہ سمجھتے ہوں عربی الفاظ کے ساتھ یا محض ترجمہ بتا دینا "عجمیت" نہیں ہے۔ بغیر مطلب سمجھے طوطے کی طرح الفاظ دُہراتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اوراد و اشغال یاد الٰہی سے قلب کو بیدار رکھنے کا اہم اسلامی ذریعہ ہیں۔ اس معاملے میں ہم ہندوؤں یا یونانیوں کے ہرگز مرہونِ منت نہیں ہیں۔

ہماری عبادت اور ذکر اللہ کے طریقے سب اسلامی ہیں۔ البتہ ان میں جو طریقے غیر اسلامی ثابت ہو جائیں اور ان میں کوئی شرعی قباحت لازم آتی ہو۔ ان پر اصرار بھی نہ کرنا چاہیئے:۔

مراقبہ

اللہ تبارک و تعالیٰ سے متعلق کسی مخصوص خیال کو پختہ کرنا اسلامی تصوف کی اصطلاح میں "جمعیت خیال" کہلاتا ہے۔ اس پختگی کے لئے یکسوئی کے ساتھ اس مخصوص خیال پر توجہ مرکوز رکھنے کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ تاکہ رفتہ رفتہ جمعیت حاصل ہو جائے اور دنیا کا کوئی کام یا کسی قسم کا شور و غل صوفی کی توجہ کو خدا کی یاد سے نہ ہٹا سکے۔ اور بحالت مجبوری اگر ہٹ جائے تو جلدی اپنے مرکز پر واپس آ جائے۔ اس میں بھی کوئی عجمیت نہیں ہے۔ بلکہ قرآن پاک کے الفاظ :۔

وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ط (۷۳ - ۸)

(اور ہر طرف سے توجہ ہٹا کر اس کی طرف یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہو جا)

Marfat.com

میں تو صاف طور پر مراقبے کا حکم موجود ہے۔ مراقبہ کرکے جب تک جمعیت خیال کی عادت نہ ڈالی جائے۔ نماز میں ہرگز حضور قلب حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور حضور قلب کے بغیر نماز پڑھنا اسے رائیگاں کرنا ہے ؎

بر زبان تسبیح در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

قرآن پاک میں بھی فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (۱۰۷-۴، ۵) (پس ویل ہے۔ ان نمازیوں کے لئے جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں) انہی نمازیوں اور نمازوں کے لئے آیا ہے جو حضورؐ کی نعمت سے معرّیٰ اور محروم ہوں۔

پس اتنی اہم اور ضروری چیز کو "عجمی" کہہ کر کس طرح مسترد کیا جاسکتا ہے۔[1] "عجمیت" کی تشریح کرتے ہوئے بعض حضرات یہ کہتے ہیں۔ کہ ایرانی زنادقہ نے فتح ایران کے وقت بظاہر تو اسلام قبول کر لیا۔ لیکن در پردہ اپنے ہی عقائد کی تبلیغ کرتے رہے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے نام سے مستقل کتابیں تصنیف کر ڈالیں جن کے ذریعے غلط عقائد کی تبلیغ میں انہیں مدد ملی وغیرہ وغیرہ۔

لیکن ہمارے علماء طریقت نے بال کی کھال نکال کر رکھ دی ہے جس سے زندقہ، الحاد منافقت، مشائیت، اشراقیت، کفر اور شرک وغیرہ کی شکلیں آئینے کی طرح صاف صاف نظر آتی ہیں۔ ان کی تحریروں کے آفتاب کے سامنے منافقوں، ملحدوں، زندیقوں، کافروں

---

[1] بعض دریدہ دہن اوراد و وظائف پڑھنے والوں کو "مُلّا" اور مراقبات میں مصروف رہنے کو "اشراقیون" کہتے ہیں۔ مشرکین عرب بھی اسلام کو سحر اور حضورؐ اقدس کو ساحر کہا کرتے تھے۔ کفار ہند بھی مسلمانوں کو ملیچھ یا ملکش (ناپاک، گندے) اور ارتداد کو شدھی (پاک کرنا) کہتے ہیں۔ ایسی گمراہ کن مقلوب ذہنیت کا کوئی علاج نہیں۔ حقیقت تو یہی ہے کہ اسلام میں کثرتِ عبادت گناہ نہیں۔ البتہ اس سے غافل رہنا "گناہ کبیرہ" ہے۔

Marfat.com

مشرکوں، مفسدوں، نیچریوں، اور دہریوں کا چراغ نہیں چل سکتا۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ فتح ایران کے بعد جتنے اکابر علماء دین بالخصوص اولیاء اللہ اور فقراء عظام گذرے انہوں نے تحقیق کا حق ادا نہیں کیا۔ اور آنکھ بند کرکے زنادقہ ایران یا دیگر گمراہان عجم کا مسلک اختیار کر لیا۔

حضرت غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، سلطان الہند خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ، خواجہ بہاؤالدین نقشبندیؒ، ان حضرات کے پیران سلسلہ اور جانشینان و خلفاء اجل رحمتہ اللہ علیہم اجمعین کے متعلق یہ کہنے کی جرأت کون کر سکتا ہے کہ انہوں نے خدانخواستہ اسلامی تصوف کو زنادقہ کے عقائد سے ملوث کر دیا۔ حَاشَا وَکَلَّا ان بزرگوں نے تو تحقیق و تدقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ انہوں نے ہر بات کی جانچ پڑتال قرآن و سنت اور اپنی فراست و بصیرت[1] کی روشنی میں کر کے دودھ کو دودھ اور پانی کو پانی کی جگہ رکھ دیا ہے۔ حضرت مولانائے رومؒ اور امام غزالیؒ کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اور ان کی تصانیف کبھی اب ہم دھوکا نہیں کھا سکتے۔ بشرطیکہ ہم اُن کی تحقیق و نصائح پر اعتماد کریں۔ اور اپنے آپ کو اُن سے بڑا محقق نہ سمجھیں۔

انسانی اور سماجی اقدارِ تصوف

مخالفین تصوف کے غلط اعتراضات کا جواب دیا جا چکا۔ اب چند ٹھوس سماجی فوائد کا ذکر بھی ضروری ہے۔ جو اسلامی تصوف اختیار کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً اکابر صوفیاء فرماتے ہیں۔ کہ دنیا کے تمام اختلافات جزو پرستوں میں ہیں "کُل پرستی" (یعنے عشق الٰہی و رجوع الی اللہ) سے تمام اختلافات مٹ جاتے ہیں اور انسانیت سے محبت کا جذبہ قوی ہو جاتا ہے۔ اس "کُل" کی یافت اسلامی تصوف اختیار کئے بغیر ناممکن

[1] صفحہ ۱۰۶ پر دیکھیں۔

Marfat.com

ہے۔ اسلامی تصوف دنیا کی تمام اقوام کو اسی توحید کی طرف بلاتا ہے۔ تاکہ اختلافات مٹ جائیں۔ اس لحاظ سے وہ انسانیت نوازی کا مسلک ہے۔ جس کی تائید اقبال نے بھی مختلف پیرایوں میں کی ہے۔ یہ قدرِ اسلامی تصوف بین الاقوامی بلکہ انسانی قدر ہے۔

علاوہ بریں اسلامی زندگی کی اصل بنیاد اخلاقی و روحانی ہے۔ جب تک اخلاقی و روحانی بنیادیں درست نہ ہوں۔ کسی مسلمان کی زندگی اسلامی نہیں ہو سکتی۔ اس مقصد کے لئے بھی اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام ہی کا راستہ اختیار کرنا چاہیئے۔ تاکہ اسلامی معاشرے کی تعمیر صحیح معنے میں اسلامی ہو سکے۔ اور اس کی عمارت اخلاقی و رُوحانی بنیادوں پر استوار ہو۔ ایسے ہی معاشرے کا ہر فرد اپنی انفرادی حیثیت میں بھی "نفسِ مطمئنہ" بن کر اللہ تبارک و تعالیٰ کے خطابِ انعام فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ [۱] کا مستحق ہو سکتا ہے۔

کیا اقبال کا فلسفۂ حیات اس کے خلاف ہے؟ اگر نہیں ہے تو اخلاقی و روحانی اقدار کے لئے تزکیۂ نفس اور اصلاحِ قلب کا کوئی نظامِ تربیت ضرور ہونا چاہیئے۔ اور ملک میں مراکزِ تربیت کی موجودگی بھی انتہائی ضروری ہے۔ جہاں طلباء اپنے روحانی استاد یا اساتذہ کی صحبت میں عملی تربیت حاصل کر سکیں۔ خود حضور اکرم سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی اصولوں پر عمل فرمایا تھا اور آپ کی صحبت و معیت نیز فیضِ تربیت کا اثر تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسی جلیل القدر شخصیتیں تیار ہوئی تھیں۔

جب تک یہ تمام انتظامات نہ ہوں کوئی شخص اخلاقی و روحانی اقدارِ حیات حاصل

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۵ :۔ حضور اکرمؐ فرماتے ہیں۔ مومن کی فراست سے ڈرو۔ کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اور قرآن پاک میں ہے جس شخص کا سینہ کشادہ کیا ہے اللہ نے واسطے اسلام کے۔ پس وہ ہوتا ہے نور پر اپنے پروردگار کی طرف سے (الزمر)

[۱] قرآن پاک :۔ پس شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو میری بہشت میں۔ (۸۹ - ۲۹، ۳۰)

Marfat.com

نہیں کر سکتا۔ موجودہ نظامِ تعلیم میں بھی زبردست کمی ہے جسے اسلامی تصوف اور مشائخ کا نظامِ تربیت ہی دور کر سکتا ہے۔

ایک اہم نکتہ یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ ہر شعبۂ حیات میں نظم و ضبط (ڈسپلن) بے انتہا ضروری ہے۔ جو کسی فردِ واحد کی اطاعت کے بغیر ناممکن ہے۔ لیکن اطاعت وہی بہتر ہوتی ہے جو خوف کی بجائے محبت کے باعث ہو۔ چنانچہ یہ خصوصیت بھی مشائخ کے نظامِ تربیت ہی میں نظر آتی ہے۔ شیخ طریقت کی حیثیت معلّم یا تربیت کنندہ کی ہوتی ہے۔ جو کسی تنخواہ یا مشاہرہ یا اجرت کے بغیر سالک کی تربیت کرتا ہے۔ اس لئے سالک تہ دل سے اس سے محبت کرتا ہے۔ اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتا۔ اس طرح محبت و اطاعت کی بنیادوں پر ڈسپلن برقرار رکھنے کے لئے بھی معاشرے کو اسلامی تصوف اور مشائخ کی ضرورت ہے۔ ؎[1]

معاشرے کی موجودہ گمراہی اور بداخلاقی کی سب سے بڑی وجہ اسلامی تصوف اور مشائخ اسلام سے منہ موڑ لینا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ضبط و نظم مفقود ہو گیا۔ جو محبت و اطاعت سے پیدا ہوتا ہے۔ اقبال براہِ راست ان امور کا ذکر نہیں کرتے لیکن یقیناً وہ زندگی میں اس ڈسپلن کے قائل نہ تھے۔ جو صرف فوج، جیل خانوں، اسکولوں اور کالجوں میں نظر آتا ہے۔ بلکہ اپنے مرشدِ معنوی عارف رومیؒ کی طرح "پیشِ مردِ کاملے پامال شو" ہی کے قائل تھے۔

عہدِ نبویؐ سے آج تک جتنے اولیاء اللہ اور اکابر صوفیہ گزرے ہیں۔ تقریباً سب نے کسی نہ کسی شیخ طریقت کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اور سب نے اطاعت و فرمانبرداری کے

---

[1] یہ صحیح ہے کہ موجودہ دور میں جاہل اور مکار "مشائخ" کی مثالیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ لیکن حق کے متلاشیوں کو مخلص اور باخبر مشائخ بھی مل جاتے ہیں۔ محض بہانے تلاش کرنیوالوں کو البتہ برائی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

Marfat.com

ذریعے اپنے ظاہر و باطن کو درست کیا تھا جس سے آج تک دنیا میں ان کا نام زندہ ہے اور ان کے ذکر سے روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہ حضرات ضبط و نظم کے بے مثل مجسمے تھے۔

آج اس گئے گذرے زمانے میں بھی اگر جائزہ لیا جائے۔ تو چند بدبختوں کے سوا معاشرے میں نیک باطنی، خدا پرستی، عبادت گذاری اور ضبط و نظم کی اچھی مثالیں جتنی زیادہ ان جماعتوں میں ملیں گی جو کسی شیخ طریقت کے حلقۂ ارادت میں داخل ہیں۔ اتنی دوسری جماعتوں میں نہ ملیں گی۔ نفس امارہ کو کچلنے ہی سے جرائم کا سدّ باب ہو سکتا ہے۔ جو بزرگان طریقت کی پیروی ہی سے خاک میں ملتا اور نفس مطمئنہ بنکر ترقی پاتا ہے۔

نتائج

گذشتہ صفحات کے مطالعے کے بعد ہم حسب ذیل نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہیں:۔

(۱) اسلامی تصوف کی بنیاد قرآن و سنت پر قائم ہے۔ اس کا کوئی اصول یا جزو فلاطونیت، نو فلاطونیت، بدھ ازم یا ویدانت سے ماخوذ نہیں ہے۔

(۲) اسلامی تصوف پر زندگی سے فرار نفی خودی یا عجمیت کا الزام بعض غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے۔

(۳) اسلامی تصوف کی دو شقیں ہیں (۱) خلافت فی الارض (۲) ولایت حقہ۔ صوفیائے کرامؒ کا نصاب تعلیم و تربیت ہی انسان کو دونوں شقوں کا اہل بنا سکتا ہے۔ اللہ کے پاک بندوں بالخصوص خلفائے راشدین کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

(۴) علامہ اقبال نے مذکورہ شقوں کو "خودی" اور "قلندری" کے تحت بیان کیا ہے۔ جن کے تمام بنیادی اصول صوفیائے کرام کے عقائد و تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ علامہ نے اشارات سے کام لیا ہے۔ اور شرح و بسط کے لئے ہم صوفیائے کرامؒ

Marfat.com

ہی کے محتاج ہیں ۔

(۴) اسلام اور اسلامی تصوف کے متعلق اکثر غلط فہمیاں مستشرقین یورپ کی پھیلائی ہوئی ہیں۔ بعض حضرات نادانستہ طور پر ان کے دام فریب میں پھنس کر اپنے بیش بہا جواہرات کو محض ٹھیکریاں سمجھ لیتے ہیں۔ اس فریب سے بچنا اور مسلم علماء طریقت و محققین پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔

(۵) علامہ اقبال نے جو اعتراضات "تصوف اور صوفیوں" پر کئے ہیں ان کا اطلاق اسلامی تصوف پر نہیں بلکہ فلاطونی اور ویدانتی تصوف پر یا عیسائی رہبانیت و باطنیت پر ہو سکتا ہے۔ یا ان نام نہاد "صوفیوں" پر جو مذکورہ بالا مسالک کا فرق نہیں کرتے۔ یا جن کی غلط روی سے اسلامی تصوف کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اور اس کے متعلق غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(۶) اسلامی تصوف بالخصوص حصۂ ولایت کی بنیاد قرآن و سنت اور علماء طریقت (اولیاء اللہ) کے مکاشفات و مشاہدات و اجماع پر قائم ہے۔ اسے فلسفہ و منطق کی کسوٹی پر جانچنے کی کوشش ایسی ہی ہے۔ جیسے کوئی پھولوں کی خوشبو کو ترازو میں تولنا چاہے۔

(۷) اسلامی تصوف کا اصل مقصد "تقرب الی اللہ" ہے۔ اس کے لئے توحید شریعت، توحید طریقت اور توحید حقیقت و معرفت پر ایمان رکھنا، بیعت و اطاعت شیخ، شرح صدر اور عبادت با مشاہدہ ضروری ہیں۔

(۸) اسلامی تصوف مکمل حیات اسلامی کا ایک نہایت ہی اہم جزو ہے۔ اس کا کام انفرادی زندگی کی اخلاقی و روحانی بنیادیں مستحکم کرنا اور فرد کو خدا تک پہنچانا ہے ساتھ ساتھ وہ جملہ مادی و عملی ترقیوں سے بھی نہیں روکتا۔

(۹) علامہ اقبال نہ وحدت وجود کے خلاف تھے نہ اسلامی تصوف کے۔ عقائد کی حد

تک وہ خود وحدت الوجودی صوفی تھے۔ اور اس سلسلہ میں اُن کے تمام عقائد مسلم صوفیائے وجودی ہی کے عقائد سے ماخوذ ہیں۔

اصل بات

اصل بات یہ نہیں ہے کہ اقبال تصوف یا طریقت کے خلاف تھے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ اقتدار سیاسی کو بھی صوفیائے کرام کے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ بلکہ صوفیائے کرام نہ اُسے اپنی زندگی کا اصل مقصد قرار دیتے ہیں۔ نہ بحیثیت مجموعی اس کی جانب توجہ دیتے ہیں۔ کیونکہ سانحۂ کربلا کے بعد ان حضرات نے ملوکیت نوازوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اور سیاسی اہلبیت سے نفرت کی بناء پر گوشہ نشینی، تزکیۂ نفس، مکارم اخلاق اور عبادت گزاری کو اصول حیات بنا لیا۔ ان کے بعد ان کے متبعین نے بھی یہی راستہ اختیار کیا اور آج تک اسی پہ گامزن ہیں۔

علامہ اقبال کی نظر میں یہ علیحدگی قومی ترقی کے لئے مضر ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ فقر و شاہی (جمال و جلال) متحد رہیں کیونکہ یہی اتحاد قوم کو دوبارہ بام عروج تک پہنچا سکتا ہے۔ اور حفاظت انسانیت کا ضامن بن سکتا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کردیں شکوہِ سنجر و فقرِ جنیدؒ و بسطامیؒ!

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمالِ بے نقاب

صوفیائے کرام بھی اس کے مخالف نہیں "درویش صفت باش و کلاہ تتری دار" انہی کا مقولہ ہے۔ اور ان کے نظریے کے مطابق "نیابتِ الٰہی" یا "خلافت فی الارض

کا مفہوم بھی یہی ہے۔ لیکن پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ اس کے لیئے جس قسم کے افراد کی ضرورت ہے وہ اسلامی تصوف و طریقت اختیار کیئے بغیر تیار نہیں ہو سکتے۔ از خلیفۃ اللہ تو وہی ہو سکتا ہے۔ جو ایک طرف اپنے اللہ سے وابستہ رہے اور دوسری طرف اس کے بندوں کا خدمت گذار ہو۔ چنانچہ صوفیائے کرام اسی بنیادی ضرورت کی تکمیل کرتے ہیں۔ اور "تزکیۂ نفس" "تطہیر قلب"۔ اطاعت و عبادت الٰہی اور رجوع الی اللہ کی تربیت دے کر انسان کو واقعی خدا کا فرمانبردار اور بندگانِ خدا کا خدمت گذار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ معاشرے میں ایسے افراد کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ جو خلوص کے ساتھ بندگان خدا کی خدمت بھی کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق بھی استوار رکھیں۔ یہی اسلام کی حقیقی روح ہے۔

اب جمہوریت و عوامی اقتدار کا زمانہ ہے۔ چنانچہ معاشرے کی اس بنیادی ضرورت کی اہمیت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ خدا سے ڈرنے والے مخلص افراد کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہو۔ (کیونکہ اسی پر جمہوریت کی کامیابی کا انحصار ہے) یہ ضرورت اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب کہ اسلامی تصوف کے نظام تربیت، اور ملکی نظام تعلیم کو ایک دوسرے کا تکملہ بنایا جائے۔ اقبال بھی فرماتے ہیں:-

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

زمانۂ سابق کے ذی ہوش مسلمان بھی علوم ظاہری حاصل کرنے کے بعد علوم باطنی ضرور حاصل کرتے تھے۔

موجودہ دور میں صوفیائے کرام کے متبعین علوم جدیدہ حاصل کرنے اور ملک و ملت کی خدمت کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ چنانچہ انہیں آپ صنعت و حرفت، تجارت و زراعت، طبابت و ڈاکٹری، وکالت و بیرسٹری، پروفیسری، انجنیری، فوجی

Marfat.com

اور سول ملازمت ...... غرض کہ ہر میدان میں سرگرم عمل پائیں گے۔

لیکن دوسرا طبقہ یعنی انگریزی داں یا انگریزیت پرست یا صرف مادی فوائد ولذائذ کا قائل طبقہ جو علامہ اقبال کو "ترجمان حقیقت" بھی سمجھتا ہے روحانی اقدار کا سرے سے قائل ہی نہیں۔ یا اس کے حصول کی کوشش نہیں کرتا۔ حالانکہ علامہ موصوف صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے سکندری سے نہیں

نیز مقالۂ زیر نظر سے بھی یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے۔ کہ وہ تصوف و روحانیت کے زبردست حامی ہیں۔ اور مسلمانوں کو تاکید کر رہے ہیں کہ وہ حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت بایزید بسطامیؒ کا فقر[1] اختیار کریں۔ اور شکوہِ سنجر و سلیم کے مالک بھی بنیں لیکن افسوس کہ طبقۂ مذکور نے علامہ کی نصیحت کے جزوِ اول کو بالکل ہی ٹھکرا دیا ہے۔ ان حالات میں قرین انصاف تو یہی ہے۔ کہ تصوف اور صوفیوں سے زیادہ ان "خدا فراموش" مسٹروں پر نکتہ چینی کی جائے۔ جو نہ شریعت کے پابند ہیں نہ طریقت کے۔ بلکہ بقول شخصے "زر۔ زن اور زمین" ہی کو "نعوذ باللہ" خدا اور رسولؐ سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ دراصل نفس امارہ کے غلام ہیں۔ درآنحالیکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:۔

اَبْغَضُ اِلٰهٍ عُبِدَ فِي الْاَرْضِ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ الْهَوٰى۔	اللہ کے نزدیک سب سے برا معبود جس کی زمین میں پرستش کی جاتی ہے وہ خواہش نفس ہے

(طبرانی بروایت ابوامامہ)

---

[1] بعض حضرات فقر اقبالؒ کے نام سے خود اپنے نظریات پیش کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت نہ "فقر اقبال" ہے نہ فقر جنیدؒ و بایزیدؒ۔ علامہ اقبال نے کوئی نیا فقر پیش نہیں کیا۔ ورنہ ان بزرگوں کے نام لیکر انکا فقر اختیار کرنیکی تاکید نہ کرتے۔ فقر کی مزید تشریح کیلئے تالیف ہذا کا عنوان "فقر اسلامی" دیکھئے۔

Marfat.com

بہرحال فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ اپنی جگہ حق ہے۔ اور علامہ اقبال کے حامیٔ تصوف ہونے کا زبردست ثبوت یہی ہے کہ وہ آج بھی "فقرِ جنیدؒ و بایزید بسطامیؒ" کو ان حضرات کا نام لے لے کر ببانگِ دُہل پیش کر رہے ہے اور خود ان کی آخری تمنا یہ تھی :۔

عطا اسلاف کا سوزِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لَا یَحۡزَنُوۡنَ[1] کر
خرد کی گتھیاں سُلجھا چُکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ اور شکوہِ سنجر و سلیم یکجا کس طرح ہوں۔ چنانچہ علامہ کے نظریے کے مطابق فرد کے لئے توحید یہ ہے کہ وہ خدا کے قریب ہو جائے۔ اور ملت کے لئے توحید یہ ہے کہ وہ داخلی امور میں خیال و عمل میں متحد رہتے ہوئے بین الاقوامی لحاظ سے مستحکم و مضبوط بنیادوں پر قائم رہے ۔ تاکہ مخالف اقوام اُسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ انفرادی توحید کو وہ "دلبری" اور ملی یا اجتماعی توحید کو "قاہری" کہتے ہیں ۔

اس نظریے کی وضاحت "جاوید نامہ" میں کی گئی ہے۔ چنانچہ "ندائے جمال" "زندہ رود" سے اس طرح مخاطب ہے :۔

فرد از توحید لاہوتی شود
ملت از توحید جبروتی شود
بایزیدؒ و شبلیؒ و بوذرؓ از دست
اُمتاں را طغرل و سنجر از دست

---

[1] اَلَاۤ اِنَّ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ (۱۰ - ۶۲)
(اولیاء اللہ کی شان میں ارشاد باری تعالیٰ ہے)۔

Marfat.com

بے تجلی نیست آدم را ثبات
جلوۂ ما فرد و ملت را حیات
ہر دو از توحید می گیرد کمال
زندگی ایں را جلال آں را جمال
ایں سلیمانی ست آں سلمانی است
آں سراپا فقر و ایں سلطانی است
آں یکی را بیند ایں گردد یکی
در جہاں یا آں نشیں یا ایں بزی

غرض یہ کہ زندگی میں دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ علامہ ان چیزوں کو کہیں جمال و جلال، کہیں فقر و سلطانی، کہیں سلمانی و سلیمانی اور کہیں دلبری و قاہری کے ناموں سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق ہر شخص کی دو حیثیتیں ہونی چاہئیں۔ اولاً اسے توحید کے ذریعہ بایزیدؒ و شبلیؒ و بوذرؓ کی طرح لاہوتی بننا چاہیئے۔ ثانیاً اسے ملتِ اسلامیہ کے ذریعہ "جبروتی" بننا چاہئے۔ اسی طرح قاہری و دلبری کا امتزاج ممکن ہے لیکن اس کے باوجود ان کا فیصلہ یہی ہے۔ کہ دلبری قاہری سے بہتر ہے۔ چنانچہ "جاوید نامہ میں" "زندہ رود" کے اس سوال کے جواب میں کہ

نقش حق را در جہاں انداختند
من نمی دانم چساں انداختند

حلاجؒ کا جواب یہ ہے:۔

یا بزورِ دلبری انداختند — یا بزورِ قاہری انداختند
زانکہ حق در "دلبری" پیداتر است — "دلبری" از "قاہری" اَولیٰ تر است

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

Marfat.com

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ط

یعنی بیدل نہ ہو۔ اور رنج نہ کرو۔ تم ہی غالب رہوگے اگر تم مومن رہے (۳-۱۳۹)

پس ثابت ہوگیا کہ اللہ کی نظر میں مومن رہ کر غالب رہنا مقبول اور مومن کا راستہ چھوڑ کر غالب رہنے کی فکر یا کوشش کرنا مذموم ہے۔ ؎

"قتلِ حسین اصل میں مرگ یزید ہے"

سے ایمان و کامرانی کی وضاحت ہوتی ہے اور علامہ اقبال کے شعر ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

میں صاف طور پر بتا دیا گیا ہے۔ کہ "مومن" کا اصل مقصود حیات کیا ہے۔ فقط

مَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

Marfat.com

(۳)

حقیقتِ انسانیہ

اور

اُس کی معراج

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا
هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (١٠-٦٢)

خبردار ہو جاؤ۔ تحقیق جانو کہ اولیاء اللہ کو نہ کوئی خوف ہوگا
نہ حزن و ملال۔

فرشتہ گرچہ دارد قُربِ درگاہ
نہ گنجد در مقامِ لی مَعَ اللہ

(رومیؒ)

Marfat.com

۲۸۶

حقیقتِ انسانیہ

ما جامِ جہاں نمائے ذاتیم
ما مظہرِ جملۂ صفاتیم
برتر ز مکان و در مکانیم
بیروں زجہات و در جہانیم (مغربیؒ)

طلسمِ بود و عدم

انسان بھی عجیب و غریب شئے ہے۔ متضاد خصوصیات کے باعث وہ ایک ایسا طلسم یا راز ہے۔ جس نے بڑے بڑے مفکروں اور دانشوروں کو ہمیشہ حیران و پریشان رکھا۔ وہ فانی بھی ہے باقی بھی۔ مقید بھی ہے آزاد بھی۔ کمزور اتنا کہ معمولی سی معمولی چیز بھی اس کی جان لے لیتی ہے۔ طاقتور اتنا کہ برق و باراں اور جوہری توانائی سے خدمت لے رہا ہے۔ بظاہر ایک قطرۂ ناپاک سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن رُوحِ قدس یا رُوحِ اعظم کا حامل بھی وہی ہے۔ کافر و مشرک بھی وہی مسلم و مومن بھی وہی۔ ذلیل و گناہگار اور شیطان صفت بھی وہی، متقی، صالح اور نبی و ولی بھی وہی۔ زندہ رہ کر مُردوں سے بدتر بھی وہی۔ مر کر ہمیشہ زندہ رہنے والا بھی وہی۔ وہی محکوم، وہی حاکم۔ وہی جاہل، وہی عالم۔ جو کچھ نہیں وہ بھی وہی اور جو سب کچھ ہے وہ بھی وہی۔ بہر حال وہ ایک "راز" ہے جس کی بابت علامہ اقبال فرماتے ہیں :-

طلسمِ بود و عدم جس کا نام ہے آدم خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

زمانہ روزِ ازل سے رہا ہے محوِ خرام مگر یہ اس کی تگ و دو سے ہو سکا نہ کہن
اگر نہ ہو تجھے الجھن، تو کھول کر کہہ دوں وجودِ حضرت آدم نہ رُوح ہے نہ بدن

اور غوثِ اعظم قُدس سرّہ نے بھی "الہامات غوثیہ" میں اسی قسم کی ایک روایت کا ذکر کیا ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں :۔

"فرمایا[1] حق تعالیٰ نے کہ اے غوثِ اعظم ! انسان میرا راز ہے اور میں انسان کا راز ہوں۔ اگر انسان اپنی حقیقت سے واقف ہو جائے اور اپنے مرتبہ کو پہچان لے جو میرے نزدیک ہے تو یقیناً ہر سانس میں یہی کہے کہ میں مالک ہوں اور مجھ کو ہے بادشاہی آج کے روز۔ میرے سوا کوئی دوسرا مالک یا بادشاہ نہیں۔"

چوں گشت یقیں کہ نیست جز مَن
بے خود شوم و بخود نشینم

حکماء اُسے جسم و جان، عقل و شعور اور ہوش و حواس وغیرہ کا مجموعہ بتاتے ہیں لیکن وہ کچھ اس سے بھی سوا ہے۔ کیونکہ انسان کہتا ہے "میرا جسم" "میری جاں" "میری عقل" "میرا شعور" وغیرہ وغیرہ۔ پس معلوم ہوا کہ جس شئے کی طرف یہ چیزیں مضاف ہیں۔ دراصل وہ "انسان" ہے (یا لفظ میرا یا میرے کے پیش نظر وہ "میں" ہوں باقی چیزیں اُس کی تابع یا اس کے تصرف میں ہیں) ان میں صرف جسم جو مادی عناصر سے ترکیب پاتا ہے ظاہر ہے۔ لیکن اس کی ترکیب و تشکیل بھی پیچ در پیچ ہے اور عقلاء کو حیرت میں مبتلا رکھتی ہے۔

اصل شئے

باقی چیزیں یعنے جان، عقل و شعور، بسیط ہونے کے باعث اصلاً تو انسان کی

---

[1] الہاماتِ غوثیہ۔ اصل عبارت عربی میں ہے۔

Marfat.com

ظاہری آنکھ سے پوشیدہ رہتی ہیں۔لیکن وجود انسانی کے آئینہ میں اپنا جلوہ دکھاتی ہیں ان سب چیزوں میں اصل چیز رُوح ہے۔رُوح نہ ہو تو باقی تمام چیزوں کا وجود باقی نہیں رہتا۔نہ مادی جسم کا۔نہ عقل و شعور جیسی بسیط اشیاء کا۔لہٰذا جب مادی جسم کی ترکیب و تشکیل حکماء و عقلاء کو حیرت میں مبتلا رکھتی ہے۔تو بسیط اشیاء بالخصوص روح کی حقیقت تک انسان محض غور و فکر کے ذریعہ کیونکر پہنچ سکتا ہے۔اور اصل انسان تو روح حیوانی سے بھی بلند و برتر بلکہ خدا کا ایک راز ہے۔پھر اس تک محض عقل تائید ایزدی کے بغیر کس طرح پہنچ سکتی ہے۔

حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں......رُوح کا تعلق بدن سے ہے۔لیکن اس طرح کہ بدن سے نہ متصل ہے نہ منفصل، نہ داخل ہے نہ خارج، نہ حال ہے نہ محل۔[1] اور اسمیں ہر بات کو دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔لیکن ان دلائل سے رُوح کی حقیقت واضح نہیں ہوتی۔نہ اس کی اصل کا پتہ چلتا ہے۔اس کے متعلق کوئی منطقی دلیل پیش نہیں کی صرف یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

وَلَيْسَ الْبَدَنُ مِنْ قِوَامِ ذَاتِكَ	جسم تمہاری حقیقت و ماہیت میں داخل نہیں
فَانْهِدَامُ الْبَدَنِ لَا يُعْدِمُكَ	اِسی لئے جسم کا فنا ہونا تمہارا فنا ہونا نہیں[2]

مصنفِ "اقبالِ کامل" لکھتے ہیں:۔

رُوح اور جسم کی تقسیم از روئے قرآن غلط ہے۔قرآن کے مطابق انسان ایک فرد ہے جس میں رُوحانی اور جسمانی خاصیتیں موجود ہیں۔لیکن رُوح اور جسم دو الگ الگ چیزیں نہیں جن سے وہ بنا ہو۔اسلام انسان کو ایک زندہ شخصیت تصور کرتا ہے۔اور یہ تصور قرآن میں نہ صرف اسی ارضی زندگی کے لئے استعمال ہوتا ہے بلکہ حشر، حیات بعد الموت کے

---

[1] الغزالی از علامہ شبلیؒ ص۸۵

[2] ایضاً ص۸۶

لئے بھی قائم رہتا ہے۔ چنانچہ حیات بعد الموت میں انسان کے لئے جو جزا و سزا مقرر ہے اور جس کا ذکر قرآن میں بار بار آتا ہے۔ روحانی بھی ہے جسمانی بھی[1] لیکن ضروری نہیں کہ وہ جسم ایسا ہی ہو جیسا اس عالم حس و شہادت میں ہے۔ کیونکہ ہر سطح وجود کے آثار و افعال مختلف ہیں۔

اساسی عقائد پر پہلے ایمان لانا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "حقیقتِ انسانیہ" کو سمجھنے کے لئے پہلے وحی، نبوت اور اولیاء کے کشف صدر کو حق سمجھنا اور جو کچھ ان کے ذریعہ معلوم ہوا اس پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو اشخاص یہ راستہ اختیار نہیں کرتے۔ وہ وادیٔ حیرت میں تمام عمر بھٹکتے رہتے ہیں۔ اور ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ بقول اکبر الٰہ آبادی مرحوم :-

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

آخر وہ علوم سائنس جنہیں "قطعی" کہا جاتا ہے۔ اور ان کے اساسی مفروضات بھی تو مابعد الطبیعیات پر ہی قائم ہیں۔ اگر ان مفروضات سے ابتداء نہ کریں تو ان "قطعی" سائنسی علوم کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ ڈاکٹر اطہر رشید اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:-

"مابعد الطبیعیات کوئی سائنس نہیں اور نہ اس کے مسائل کی بحث میں اس طرز استدلال کی گنجائش ہے۔ جو "قطعی" سائنسوں میں اختیار کیا جاتا ہے۔

---

[1] اقبال کامل صـ ۶۶

لیکن تمام نام نہاد "قطعی" سائنسوں کا وجود، ان کے اساسی مفروضات اور ان کے دعووں کی صداقت، سب کی بنیادیں اسی مابعد الطبیعیات پر قایم ہیں[۱]

جب صورتِ حال یہ ہے تو کسی کو، بالخصوص "سائنٹفک" اور "قطعی" کی رٹ لگانے والوں کو اس اصول کو اختیار کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ کہ "حقیقت انسانیہ" اور رُوح کے متعلق انبیاء کرام اور اولیائے عظام کے فرمودات پر پہلے ایمان لانا ضروری ہے نبی اور ولی کے خاص ذرائع علم و عرفان بالترتیب وحی و الہام (کشف صدر) ہوتے ہیں۔ اور عام انسان کے ذرائع علمی محض حواس خمسہ یا قوتِ فہم و ادراک اور وجدان ہیں نبی اور ولی کو عام انسانوں پر اسی لئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ اللہ کے مقرب ہوتے ہیں۔ اور اللہ خود بطور انعام انہیں یہ خاص قوتیں عطا فرماتا ہے۔ ان کے ذریعہ جن باتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔ وہ قطعاً صحیح ہوتی ہیں۔ اور ان کا درجہ محض "مفروضات" کا نہیں ہوتا اسی لئے "حقیقت الحقائق" کی جستجو کے لئے اسلام انسانی تخمین وظن کو مسترد کرتا ہے اور نبوت و ولایت کو پیش کرتا ہے۔

چنانچہ صفحات آئندہ میں بطور اختصار یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن وحدیث اور انکشافات اولیاء اللہ سے "حقیقتِ انسانیہ" پر کیا روشنی پڑتی ہے اور "معراج مومن" کی نوعیت کیا ہے۔ نیز یہ بتانا مقصود ہے کہ اقبال ان امور کی بابت کیا فرماتے ہیں۔

بظاہر یہ کائنات بسیط اور مادی اشیاء کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ اور مادہ کو ترقی کی راہ میں سخت رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ انسان بھی روح اور جسم کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے مادہ کی حقیقت کے بارے میں رائے قائم کرلی جائے۔

---

[۱] پاکستان فلاسوفیکل کانگرس۔ اجلاس دوم۔ کراچی ۱۹۵۵ء۔ اصل خطبہ انگریزی میں ہے۔

جدید مفکرین اور سائنسدان حضرات مادّہ کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور یہ رائے رکھتے ہیں۔ کہ مادّہ یا جسم روح ہی کی ایک صورت ہے۔ جیسے دھواں در اصل ایک شعلہ ہے جس نے دھوئیں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی کہیں کہیں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ مثلاً

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود

(ساقی نامہ۔ بال جبرئیل)

علاوہ بریں جدید مفکرین کا نقطہ نظر اب طبیعیاتی کی بجائے حیاتیاتی ہے اور ان میں یہ رجحان روز افزوں ہے کہ دنیا کی اصل حقیقت اور اس کا راز جمود اشیاء میں نہیں بلکہ زندگی کی حرکت میں ہے۔ ایک سالمہ کے قلب میں جوہری توانائی کی دریافت نے مادیت کے قلعہ کو قطعاً مسمار کر دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود حرکت کو روح نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ ایک لڑھکتی ہوئی گیند اور بھاگتی ہوئی ٹرین کو بھی جاندار شے ماننا پڑے گا۔ جاندار شے تو ساکن بھی رہ سکتی ہے۔ لیکن ہر متحرک شے جاندار نہیں ہو سکتی۔ اس بناء پر ہم یہی کہیں گے۔ کہ حرکت اور رُوح دو مختلف چیزیں ہیں۔

اسی طرح توانائی اور روح بھی مترادف نہیں ہیں۔ کیونکہ آج تک توانائی سے خواہ وہ برقی ہو یا ایٹمی کوئی مردہ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکا۔ الٹا اثر البتہ دن رات دیکھنے میں آتا ہے۔ یعنے اس کے بے قاعدہ استعمال سے سارا جوش حیات دم زدن میں ختم ہو جاتا ہے۔

بہر حال ایک ذی حیات انسان میں محض رُوح کی بدولت علم وارادہ، توانائی، حرکت، عقل وفہم وشعور، سمع وبصر اور گویائی وغیرہ سب کچھ موجود رہتا ہے۔ اور جہاں روح کا چراغ گل ہوا۔ یہ تمام چیزیں نابود ہو جاتی ہیں۔

خدا کے منکر مفکرین ابھی تک "خدا" اور "رُوح" کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے۔ زیادہ

Marfat.com

سے زیادہ وہ حیات کو ایک "مستقل تخلیقی ارتقاء" کہتے اور اسی کو اصل حقیقت جانتے ہیں۔ ان کے خیال میں "یہ مستقل تخلیقی حیات جس کا ہر فرد اور نوع ایک تجربہ ہے۔ (نعوذ باللہ) خدا ہے۔ خدا اور حیات ایک چیز ہیں۔ مگر یہ خدا محدود ہے اور قادر مطلق نہیں ہے۔ یعنی مادے سے محدود ہے اور اپنے جمود پر زحمت کے ساتھ قدم بقدم غالب آتا ہے۔ یہ خدا عالم کل نہیں ہے۔ بلکہ ٹٹولتا ہوا رفتہ رفتہ علم اور شعور اور زیادہ روشنی تک پہنچتا ہے........"[1]

علم پر عرفان کی فضیلت

یہ اور اس قسم کی دیگر خرافات بعض ایسے اہل فلسفہ کے غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ جو نور نبوت سے روشنی حاصل کرنے کی بجائے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اور محض اپنے خیالات کو اپنا رہنما بناتے ہیں۔ اس طرح وہ تمام عمر "تخمین و ظن" میں مبتلا اور حقیقت رسی سے محروم رہتے ہیں۔ انہی لوگوں کے متعلق قرآن پاک صاف صاف الفاظ میں فرماتا ہے:-

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا ۚ	اور نہیں پیروی کرتے اکثر ان کے مگر گمان کی۔
إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ	تاکید جانو! کہ حق کی تلاش میں ظن و گمان کچھ کام
شَيْئًا ۚ (۱۰-۳۶)	نہیں دے سکتے۔

اور (۵۳-۲۸) کا مضمون بھی قریب یہی ہے۔

علامہ اقبال کے روحانی پیشوا حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں:-

گر بہ استدلال کار دیں بُدے
فخر رازی راز دار دیں بُدے

---

[1] دِل ڈُوران۔ حکایت فلسفہ ص۵۸۶ ترجمہ مولوی احسان احمد صاحب جامعہ عثمانیہ (دکن)

Marfat.com

اور خود اقبال فرماتے ہیں :-

علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

عرفان شرح صدر پر منحصر ہے

قرآن پاک ہی صحیح راستہ بھی بتاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :-
فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ (۶-۱۲۶) پس جب ارادہ فرماتا ہے اللہ کہ ہدایت فرمائے کسی کی (تو) کھول دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے۔

اور جب وہ کسی کو شرح صدر سے نوازتا ہے تو اسے اپنے نور خاص سے نوازتا ہے۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (۳۹-۲۲) پس کیا جس شخص کا سینہ کشادہ اللہ نے واسطے اسلام کے۔ پس وہ ہوتا ہے اوپر نور کے اپنے پروردگار کی طرف سے۔

غرض یہ کہ ہدایت پانے اور حق تک پہنچنے کا دار و مدار اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے ارادہ پر رکھا ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک وہی "کشفِ صدر" اور "نورِ بصیرت" قابلِ اعتبار ہے جس کا تعلق اسلام سے ہو۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اسی لئے اکابر اولیاء و صوفیہ نے تزکیہ قلب

لہ الفاظ "شرح صدر" اور "اسلام" کو ملحوظ خاطر رکھیے۔ اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ جو شخص وحی و نبوت پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ اس کے کشف و الہام یا وجدان کے ذریعہ معلوم کی ہوئی بات کا اعتبار نہیں۔ اسی طرح خود اسلام کے لئے جو اہمیت "کشفِ صدر" کو حاصل ہے وہ بھی اسی آیت سے ظاہر ہے۔

Marfat.com

پر اپنے سلوک کی بنیاد رکھی ہے۔ اور کشفِ صدر کے لئے اللہ تعالیٰ کی استعانت طلب کرنے پر زور دیا ہے اور اس کے طریقے بھی مقرر کئے ہیں۔

قرآن پاک میں ہے :-

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ	فلاح پائی اس نے جس نے تزکیہ کیا اس کا (یعنے
خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ط	نفس کا)۔ اور ناکام رہا جس نے خراب
(۹۱: ۹ - ۱۰)	کیا اُسے۔

تمام اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام نے کشفِ صدر، تطہیر قلب اور تزکیہ نفس کی اہمیت جتائی ہے۔ خود علامہ اقبال نے اپنے پہلے خطبہ میں علم پر عرفان کی فضیلت فلسفیانہ انداز میں ثابت کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ وجدان اور کشفِ صدر ہی کے ذریعہ حقیقت تک رسائی ممکن ہے۔ اسی بات کو وہ اشعار میں اپنی مخصوص اصطلاح "عشق" کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں "عشق" کے مفہوم میں سیاسی و مادی ترقیاں بھی شامل ہیں۔ لیکن جہاں وہ عقل و خرد یا علم کے مقابلہ میں "عشق" کی فضیلت بیان کرتے ہیں۔ وہاں بنیادی چیز یہی وجدان یا کشفِ صدر کی نعمت ہوتی ہے۔ مثلاً ضربِ کلیم کی ایک نظم "علم و عشق" میں جہاں وُہ "عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب" یا "علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات" فرماتے ہیں وہاں ان کا مقصد یہی ہے کہ ذاتِ حق کے حضور میں علم کے ذریعہ رسائی محال ہے۔ اس بارگاہ قدس میں عشق ہی پہنچا سکتا ہے۔ ایک جگہ صاف صاف کہتے ہیں :-

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :-

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

Marfat.com

یہ "حضور" کیا ہے اور ورائے عقل منزل کون سی ہے؟ اسے صوفیائے کرام نے بالوضاحت سمجھایا ہے۔ لیکن یہ باتیں اس وقت سمجھ میں آسکتی ہیں جب کہ اللہ تبارک و تعالےٰ کے ارشادات۔ هُوَ الْاَوَّلُ۔ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ[1] .... وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ[2] .... نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ[3] .... وَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ[4] وغیرہ کی تفسیر اہل عشق (اکابر اولیاء و صوفیہ) سے سمجھی جائے۔ کیونکہ ان بزرگوں نے تائید ایزدی۔ بصیرتِ ایمانی اور کشفِ صدر کے ذریعہ اناءِ انسانی و اناءِ سبحانی، حقیقتِ کائنات اور زمان و مکان وغیرہ کے سربستہ راز معلوم کئے ہیں۔ اور ان اشخاص کے "تخمین و ظن" کو ہرگز شمع ہدایت نہ بنایا جائے۔ جو نہ وحی و نبوت کے قائل ہیں۔ نہ امر ولایت (تقرب الی اللہ) کے۔ یا جنہیں نور بصیرت اور کشف صدر کی نعمت حاصل نہیں۔ جو دل کے اندھے ہیں۔ اور قلم کی لاٹھی کی مدد سے "قرب و حضور" کا راستہ طے کرنا چاہتے ہیں۔

اللہ کا راستہ

سلوک تصوف سخت مجاہدہ کا راستہ ہے۔ اس میں قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا پر عمل کیا جاتا اور اللہ تعالےٰ سے استعانت کی جاتی ہے۔ ارشادِ باری تعالےٰ ہے

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ — اور جن لوگوں نے مجاہدہ کیا ہماری راہ میں۔ ہم دکھائیں گے انہیں راہ اپنی یقیناً

(۲۹ - ۶۹)

---

[1] الحدید آیت نمبر ۳
[2] ۵۲ پ ۲۶ - ع ۱۸
[3] ۵۲ پ ۲۶ - ع ۲
[4] البقرہ - ع ۱۴

Marfat.com

اس میں اللہ تعالیٰ "اپنی راہ" دکھانے کی ضمانت کر رہا ہے۔ اور اس کی راہ وہی ہے جو اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحیح جانشینوں (اولیاء اللہ اور صوفیاء عظام) نے اختیار کی۔

سورۂ فاتحہ میں جسے ہم رات دن نمازوں میں پڑھتے ہیں "صراطِ مستقیم" ان حضرات کی راہ کو کہا گیا ہے۔ جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔ انہی کی تفصیل اس آیت کریمہ میں موجود ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	اور جو لوگ اللہ اور رسول کا حکم مانتے ہیں
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ	ایسے لوگ اُن حضرات کے ساتھ ہیں۔
اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ	جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے۔ یعنے
مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ	انبیاء اور صدیقین
وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ	اور شہداء و صالحین
وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ط	اور یہ حضرات بہت اچھے رفیق ہیں۔
ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ	اور انکے ساتھ رفاقت محض اللہ کا فضل ہے
وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ط	اور اللہ بس ہے خبر رکھنے والا۔

(۴ - ۶۹ تا ۷۰)

اولیاء اللہ کے حق میں تو صاف صاف قرآنی شہادتیں موجود ہیں۔ مثلاً

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَاۗءَ اللّٰهِ	خبردار ہو جاؤ۔ اور تاکید جانو کہ اولیاء اللہ کے لیئے
لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ	نہ خوف ہے
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ	اور نہ رنج و ملال۔

(۱۰ - ۶۲)

علامہ اقبال بھی اسی زمرے میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک قطعہ میں

Marfat.com

فرماتے ہیں :-

عطا اسلاف کا سوزِ دروں کر — شریک زمرۂ لایحزنون کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہیں — مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اگر علامہ اقبال نے یورپ کے بعض فلاسفروں کے بعض خیالات پسند کیے اور اپنے اشعار میں ان کا اظہار کیا۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ ان کا اسلام ملحدین یا وحی و نبوت کے منکر فلاسفروں کی تقلید تھی۔ یا اولیاء اللہ اور صوفیاء کرام کا مذہب خدانخواستہ اسلام کے سوا کچھ اور تھا۔[1]

بہرحال زیر نظر مقالہ کا یہی مقصد ہے۔ کہ "حقیقت انسانیہ" اور "معراج مومنین" کے متعلق اکابر صوفیہ اور علامہ اقبال کے خیالات و عقائد کے مشترک نکتے اور اتصال و تطبیق کے مختلف پہلو واضح کیے جائیں۔

وحدت وجود

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ نکتہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ جس طرح جسم انسانی روح انسانی، انسان کی زندگی اور زندگی کی چہل پہل میں ایک وحدت ہے جو ان سب کی اصل ہے۔ یا جو ان سب میں خاص حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح انائے انسانی انائے حقیقی اور کائنات (جس میں "عالمین" مثلاً عالم حس و شہادت، عالم برزخ، عالم

[1] جس تصوف پر اقبال کو اعتراض ہے۔ وہ شنکر اچاریہ یا افلاطون کا تصوف ہو سکتا ہے۔ حضرت غوث الاعظم سید عبد القادر جیلانیؒ۔ ولی الہند عطائے رسول حضرت خواجہ غریب نواز اجمیریؒ۔ سلطان العارفین حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندیؒ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ جیسے جید صوفیہ کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا تصوف ہرگز نہیں ہو سکتا۔ منہ

Marfat.com

ارواح، عالمِ ملکوت وغیرہ شامل ہیں۔) ان سب کے درمیان بھی ایک وحدت کارفرما ہے جسے صوفیئہ کرام "وحدتِ وجود" کی اصطلاح سے واضح کرتے ہیں۔ اصطلاح مذکور کا مطلب یہی ہے کہ مذکورہ "وحدت" انسان اور کائنات کے مظاہر میں جلوہ گر ہے۔ اس "وحدت" کو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے محض عقل کی مدد سے پوری طرح سے سمجھنا محال ہے۔

عقل پوری حقیقت کا احاطہ بیک وقت نہیں کرسکتی۔ یہ کام کشف صدر کا ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ ان موضوعات یعنے انائے حقیقی۔ انائے انسانی اور کائنات کی حقیقت کو انہی حضرات سے سمجھا جائے۔ جنہیں خود اللہ تبارک و تعالیٰ نے سمجھایا ہے۔ اس کے خلاف عمل کرنا منشائے الٰہی کے خلاف راہ اختیار کرنا ہے۔

انائے حقیقی

ان معروضات کے پیش نظر پہلے "وجود مطلق" سے متعلق اولیاء اللہ کے عقائد کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:۔

وجودِ مطلق (انائے حقیقی)

"وجودِ مطلق" ہستی بے قید ہے۔ اور وہی ذاتِ حق ہے۔ اس کے سوا کوئی شی موجود نہیں ہے جس شئے کو ہم "موجود" سمجھتے ہیں اس کا وجود حقیقی نہیں اعتباری ہے۔ اصل اور حقیقی وجود صرف ایک ہے جسے وجود مطلق یا ذاتِ حق کہا جاتا ہے وہ واجب ہے۔ ہمیشہ سے ہے۔ ہمیشہ رہے گا۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ط (۲-۲۵۵)

وہ واحد ہے کیونکہ تعدد قدما ناممکن ہے۔

Marfat.com

وہ غیر محدود ہے کیونکہ دوسری چیز موجود نہیں ہے جو اپنے وجود سے اسے محدود کرے۔

وہ مطلق ہے مقید نہیں کیونکہ اس صورت میں بھی دوسرے وجود کی ضرورت ہے جو اُسے مقید کر دے۔

وہ بے مثل ہے کیونکہ مثل بھی اُسے محدود کر دے گی۔

بے جہت ہے۔ کیونکہ جہت بھی دو وجودوں کے بغیر متعین نہیں ہو سکتی۔

غرض یہ کہ اطلاق وجود سے تقید شہود تک ایک ہی ذات ہے۔ جو تجلیات و تعینات کے اختلاف کے مطابق "مختلف مراتب" یا "مختلف حضرات" سے موسوم ہوئی ہے۔ اور تعینات محض اعتباری اور نسبتی باتیں ہیں جن کی وجہ سے ذاتِ مقدس میں کوئی نقص عائد نہیں ہوتا۔ تم ایک کو اگر چار کی چوتھائی کہو یا تین کی تہائی یا دو کا آدھا یا آدھے کا دوچند تو ان نسبتوں سے اس کی یگانگی میں کوئی قباحت لازم نہیں آتی۔ اسی طرح ذاتِ پاک کو تجلیات و تعینات کے لحاظ سے مختلف ناموں اور مختلف مرتبوں کے نام سے بولنا اس کی احدیت کا مانع نہیں ہے۔ وہی ایک ذات ہے۔ جو رنگا رنگ نظر آرہی ہے۔ [1]

قرآن پاک میں ہے:۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (۵۷۔۳)

اور حدیث شریف میں آیا ہے:۔

كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَّعَهٗ شَيْءٌ یعنی تھا اللہ اور نہ تھی ساتھ اسکے کوئی شی۔

نیز وَهُوَ الْاٰنَ كَمَا كَانَ یعنی وہ (اللہ) اب بھی ویسا ہی ہے، جیسا پہلے تھا۔ یعنی اس وقت بھی اس کے ساتھ کوئی شی موجود نہیں ہے۔

---

[1] تعلیماتِ غوثیہ صفحہ ۲۴

ان فرمودات کی موجودگی میں "غیر اللہ" کا حقیقی وجود تسلیم کرنا ہی "شرک فی الذات" ہے۔ اس لئے صوفیۂ وجودیہ حقہ دیگر تمام فرقوں مثلاً عدمیہ، وہمیہ، حلولیہ، اتحادیہ ظلیہ وغیرہ کے عقائد کے قائل نہیں کیونکہ وہ دو وجود قائم بالذات کے متقاضی ہیں۔ جن کا ایک ساتھ رہنا ناممکن ہے جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے ان میں بعض عقائد کائنات کی نفی کرنے۔ یا اُسے سراب قرار دیتے ہیں۔ یہ بھی غلط تصور ہے۔ کیونکہ قرآن پاک میں ہے کہ ہم نے اسے باطل نہیں پیدا کیا[۵۱] اور یہ بھی ہے کہ تم جس طرف بھی منہ کرو۔ دیکھو گے اللہ کی ذات[۵۲] وغیرہ وغیرہ۔

اکابر صوفیہ جس چیز کو دھوکا، سراب، فانی یا باطل قرار دیتے ہیں۔ وہ شئی کی ظاہری صورت یا اس کا تعین ہے حقیقت شئی نہیں۔

اس مسئلہ کی نزاکت سیدھے سادے الفاظ میں بحر اور امواج کی مثال سے واضح کی جاسکتی ہے۔ جو نسبت بحر کے ساتھ امواج کی ہے[۵۳] تقریباً وہی مخلوق کی حق تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

یعنی جس طرح امواج بلحاظ حقیقت، بحر کی عین اور بلحاظ تعین اس کی غیر ہیں۔ (لیکن یہ غیریت اعتباری ہے) اسی طرح اکابر صوفیہ وجودیہ کا یہ عقیدہ ہے۔ کہ اشیائے کائنات کا وجود بلحاظ حقیقت حق تعالیٰ کا عین اور بلحاظ تعین اس کا غیر ہے۔ اور یہ غیریت اعتباری ہے[۵۴]

---

۵۱ (۳۸-۲۷) ۵۲ (۲-۱۱۵)

۵۳ یہ مثال بھی ناقص ہے۔ کیونکہ بحر محدود ہے۔ لیکن اس سے بہتر مثال دوسری نہیں ملتی۔

۵۴ تفصیل کے لئے دیکھو "تحفۂ مرسلہ" جسے حضرت ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت غوث الاعظم سید عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ کی تعلیم کے لئے تحریر فرمایا تھا۔

Marfat.com

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اکابر صوفیۂ وجودیہ عالم کو نہ یونانیوں کی طرح "معدوم" مانتے ہیں۔ نہ ہندوؤں کی طرح اسے "مایا جال" نہ بعض دیگر حضرات کی طرح اسے محض "ظل" یا "سایہ" قرار دیتے ہیں۔ نہ حلولیہ، اتحادیہ کی طرح اس کی ہستی کو حق تعالٰے کی ہستی کی طرح "مستقل بالذات" تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے عقیدے کا خلاصہ یہ ہے کہ حق موجود اور غیر حق معدوم ہے۔

لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللہ

علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے :۔

وہی اصلِ مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شے ہے انداز بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زمان نہ مکاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

زمین و آسمان و چار سُو نیست
درین عالم بجز اللہ ھُو نیست

بخوفِ طوالت زیادہ اشعار نقل نہیں کئے گئے۔ علاوہ بریں اس سے قبل والے

مضمون "تصوف اور اقبال" میں اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

تنزّلات

انہی اکابر صوفیۂ وجودیہ کی تحقیق کے مطابق حق تعالیٰ بمصداق حدیثِ قدسی کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ عالمِ تنزیہہ سے عالمِ حس و شہادت تک مختلف مراتب میں جلوہ گر ہے۔ جنہیں اصطلاح میں "حضرات" "عالمین" "مراتب" "تنزّلات[۱]" وغیرہ کہتے ہیں۔ ان مراتب میں تقدم و تاخر اعتباری ہے۔ زمانی نہیں۔ ان میں پہلا مرتبہ "لا ظہور" کا ہے۔ باقی مراتب کو کسی نے پانچ کسی نے چھ پر تقسیم کیا ہے اور اپنی کتابوں میں انہیں نہایت بسط و تشریح اور آیات و حدیث کے حوالوں کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ ان میں پہلی تجلی کو "حقیقتِ محمدیؐ" "نورِ محمدیؐ" یا "وحدت" اور آخری تجلی کو "ناسوت" اور "مرتبۂ انسانی" وغیرہ کہتے ہیں۔ ہر علم کی طرح انہوں نے اس علم (یعنے خود شناسی و خدا شناسی) کو بھی اصطلاحات کے پردے میں بیان کیا ہے۔ تاکہ جنہیں حقیقت کی تلاش ہو وہ انہی سے معلوم کریں جو اس سے باخبر ہوں۔ قرآن پاک بھی یہی ہدایت فرماتا ہے:-

فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (۱۶-۴۳)

پس پوچھو اہلِ ذکر سے اگر تم نہیں جانتے (اہلِ علم نہیں کہا۔ اہلِ ذکر کہا ہے)

بہر حال حق سبحانہٗ و تعالےٰ جملہ مراتب بطون و ظہور میں بہ یک وقت اسی طرح موجود ہے جس طرح ایک انسان بیک وقت مختلف حیثیتوں میں رہتے ہوئے بھی اپنے وجود کی انفرادیت برقرار رکھتا ہے۔ مثلاً زید ایک شخص واحد، معروف اور متعین ہے وہی بلحاظ قومیت پنجابی یا سندھی۔ بلحاظ نوع، انسان۔ بہ لحاظِ جنس قریب حیوان اور

---

[۱] زیادہ تفصیل کے لئے دیکھو ص ۳۷۵ تا ص ۳۷۷۔

جنس متوسط کے لحاظ سے جسم نامی کے زمرے میں داخل ہے وغیرہ وغیرہ

اس مثال پر نظر رکھتے ہوئے یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھئے کہ جس طرح زید اپنی مختلف حیثیتوں میں مختلف ناموں سے یاد کیا جائے گا۔ اسی طرح اکابر صوفیۂ وجودیہ کا عقیدہ ہے کہ وجود حقیقی کو مختلف مراتب میں بلحاظ اسماء و صفات و اعتبارات مختلف ناموں سے یاد کرنا ضروری ہے۔ اسامی مرتبۂ الٰہیہ کا اطلاق مراتب کونیہ میں اور اسی طرح اس کے برعکس ممنوع ہے۔ مولانا جامیؒ نے اسی نکتہ کو یہ کہہ کر واضح کیا ہے ؎

ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد
گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی

نظر بریں بندہ بندہ ہی کہلائے گا۔ اور خدا خدا، بحر، دریا، موجیں، لہریں، قطرات آب، بھاپ، برف، شبنم سب ایک حقیقت یعنے پانی کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس کے باوجود ہر تعین اپنے مخصوص نام سے یاد کیا جاتا اور اپنے مخصوص آثار و اوصاف رکھتا ہے۔

بال جبرئیل کے ساقی نامہ میں علامہ اقبالؒ نے حیات کے جتنے اوصاف بیان کئے ہیں۔ وہ تقریباً وہی ہیں۔ جو وجودی صوفیہ نے ظہور وجود کے "تنزلات" کے تحت بیان کئے ہیں اس کے دو ایک اشعار میں تو علامہ لفظ "وجود" بھی استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

ٹھہرتا نہیں کاروانِ "وجود"
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ "وجود"

یا

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ "وجود"

Marfat.com

یورپ کے فلاسفر "زندگی" ہی کو (حقیقت مطلقہ) کہتے ہیں۔ وجودی صوفیہ اسے وجودِ حقیقی یا وجودِ مطلق کہتے اور حیات کو اس کی ایک صفت قرار دیتے ہیں اسی لحاظ سے وہ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ہے۔ صفت حیات چونکہ ذات باری سے علیحدہ نہیں ہو سکتی اس لئے وجودِ حقیقی اور حیات کا تصور ایک ساتھ ذہن میں آتا ہے۔ اور شاید اسی وجہ سے علامہ اقبال نے مذکورہ ساقی نامہ میں الفاظ "حیات" "زندگی" اور "وجود" کو قریب قریب ایک ہی معنے میں استعمال کیا ہے۔ اور ان سے ان کی مراد "وجودِ حقیقی" ہے۔ جس سے اس کی صفت حیات کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ برخلاف غیر مسلم فلاسفروں کے جو "ذاتِ حقیقی" (خدا) اور "حقیقت محمدی" (اول مرتبۂ ظہور) کے تو منکر ہیں لیکن انسان کی زندگی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔

بہرحال ظہور وجود کے متعلق علامہ اقبال "وجودی صوفیوں" کے ہمنوا[۱] ہیں چند مثالیں پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ چند اور سنیئے:۔ فرماتے ہیں:۔

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عینِ محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے

---

[۱] حالانکہ صوفیائے کرام کی طرح اقبال نے اصطلاحات ظہور استعمال نہیں کیں لیکن بنیادی خیالات صوفیائے کرام ہی کے ہیں۔

Marfat.com

اسی کے بیاباں اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول

"ذاتِ حقیقی" کا مرتبۂ احدیت سے مرتبۂ انسان میں ظہور فرمانا انسانی ذہن میں "اوپر سے نیچے آنے" (تنزل) کا تصور پیش کرتا ہے یہ ایک ذہنی مغالطہ ہے۔ ورنہ وہ ذاتِ اقدس ہر مرتبہ میں ذاتِ اقدس ہے۔ بہرحال "نزول" یا "اترنے" کا تصور اقبال کے یہاں بھی موجود ہے۔ مذکورہ "ساقی نامہ" کے ایک شعر میں ہے:-

"اتر کر" جہان مکافات میں
رہی "زندگی" موت کی گھات میں

علامہ اقبال نے اپنے بعض خطبات میں بالخصوص ان میں جو "زمان" اور "وقت" سے متعلق ہیں فی الجملہ ظہور "ذات" ہی پر بحث کی ہے۔ حالانکہ الفاظ "ذات" "ظہور" یا "تنزلات" وغیرہ استعمال نہیں کیئے گئے ہیں لیکن اس سے نفسِ مضمون میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہماری نظر معنے پر ہے الفاظ پر نہیں۔

علامہ نے اسلامی نظریات کو مغرب کے جدید فلسفیانہ نظریات میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ فلسفہ پسند طبائع کے لئے قابلِ قبول بن سکیں۔ ہمارے صوفیہ کرام کے یہاں یہ بحث قرآن وحدیث پر قائم ہے اور نہایت مبسوط و مدلل ہے قدماء کا طرزِ استدلال ان کا اپنا ہے۔ البتہ حضرت ابن عربیؒ حضرت امام غزالیؒ اور مولانائے رومؒ وغیرہ نے اسے فلسفیانہ انداز عطا کیا۔

حرکی اور سکونی نظریۂ حیات

اسلامی تصوف میں "تسلسل ظہور" اور "تجدد امثال" بہت مشہور مسئلے ہیں جن سے سکون و ثبات غیر حقیقی ثابت ہوتا ہے۔ لیکن سکون و ثبات کو اگر حقیقی بھی مان

لیا جائے۔ تب بھی اہل فلسفہ کو اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ بعض فلاسفر یہی کہتے ہیں۔ کہ اس کے بغیر نظام عالم نامکمل رہے گا۔ ان کے نظریئے کے مطابق ہر چیز کی حرکت چند سکونی وقفوں کا سلسلہ ہوتی ہے۔ لہٰذا حیات جو مسلسل نظر آتی ہے حقیقتاً متعدد اموات کا تسلسل ہے۔ لہٰذا "سکون وثبات" اور "موت وحیات" سب اضافی چیزیں ہیں۔ علامہ اقبال بھی فلاسفۂ جدید کی تائید میں حیات کو "حرکت" اور "سیل رواں" قرار دینے اور یہ کہنے کے باوجود کہ ۔۔۔

دما دم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے میں پیدا رم زندگی

اسی "ساقی نامہ" میں جس کا شعر اوپر نقل کیا گیا ہے یہ بھی فرماتے ہیں:۔

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلہ میں پوشیدہ ہے موج دود
یہ "ثابت" بھی ہے اور "سیار" بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

اسی طرح اگر حرکت چند "سکونی وقفوں" کا نام ہے۔ اور زندگی "ثابت" بھی ہے اور "سیار" بھی تو "حرکی" یا "سکونی" "نظریۂ حیات" جیسے الفاظ از روئے منطق وفلسفہ کوئی معنے نہیں رکھتے۔ لہٰذا اسلامی تصوف اور صوفیۂ کرام کو خواہ مخواہ مطعون کرنے کے لئے یہ کہنا کہ اسلامی تصوف "سکونی نظریۂ حیات" ہے۔ محض اعتراض برائے اعتراض ہے۔ اور کچھ نہیں۔

اس پر "بے عملی" کا الزام بھی غلط ہے۔ کیونکہ صوفیائے کرامؒ اس کے لئے عموماً لفظ "سلوک" استعمال کرتے ہیں۔ جس کے لغوی معنے ہیں "چلنا"۔ مسلک (راستہ) اور سالک (چلنے والا) بھی اسی سے مشتق ہے۔ کیا کوئی صحیح الدماغ شخص چلنے کو بھی بے عملی

کہہ سکتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ "طالبانِ دنیا" کی منزل خدا فراموشی اور لہو و لعب ہے جیسے قرآن پاک میں "حیٰوۃُ الدُّنیا" کہا گیا ہے۔ اور طالبانِ حق کی منزل اللہ ہے۔ اس لحاظ سے دونوں راستے جُدا اور منزل رسی کے طریقے الگ الگ ہیں۔ بہرحال سالک اپنی راہ چلتا ہے۔ اُس پر "بے عملی" کا الزام ہرگز نہیں لگایا جا سکتا۔

عرفانِ نفس

وجودی تصوف کا اہم ترین مسئلہ عرفانِ ذات یا عرفانِ نفس ہے۔ نفس یا حقیقتِ انسانیہ کو صوفیائے کرام نے "انا" اور اقبال نے "خودی"[1] کہا ہے۔

صوفیۂ کرام کے سلوک کا خلاصہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ ہے یعنی عرفانِ رب کے لئے عرفانِ نفس ضروری ہے۔ ان کا سلوک عرفانِ نفس سے شروع ہو کر عرفانِ حق پر ختم ہوتا ہے۔ لیکن بعض حضرات نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ "عرفانِ نفس" ہی "عرفانِ حق" ہے۔

اس لحاظ سے وجودی تصوف میں "نفی خودی" کا امکان ہی نہیں ہے۔ اور وہ سراسر حق کا عرفان و اقرار ہے۔ وہاں "نفی" سے اپنی اَنا کے متعلق غلط تصور کی نفی اور صحیح تصور کا اثبات مراد ہے جو "تخلقوا باخلاق اللہ" کے ساتھ قائم کیا جاتا ہے اور اس میں کامیاب ہونے والا ہی نائبِ حق بننے کا مستحق ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی کو "لا والا" کے تحت اور "اسرار و رموز" کے بعد "قلندری" کے عنوان سے پرزور الفاظ میں بیان کیا ہے۔

وجودی تصوف کے سلسلے کی دو اہم کڑیاں "مرتبۂ روح" اور "مرتبۂ انسان" ہیں دیگر مراتبِ ظہور کا ذکر بخوفِ طوالت نہیں کیا گیا۔ ان مراتب کی وضاحت بھی وجودی تصوف کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

---

[1] نقطۂ نوری کہ نام او خودی ست   زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی ست

مرتبۂ رُوح

صوفیائے کرام نے "عالم ارواح" کو مراتب وجود کے ایک مرتبے میں رکھا ہے۔ جو مرتبۂ ارواح یا عالم ارواح کہلاتا ہے۔ اور اس سے مراد عالم کون کی مجرد و بسیط اشیاء ہیں۔ جو اپنی ذاتوں اور مثالوں پر ظاہر ہوئی ہیں۔ نفوس و عقول یا ملائکہ و ارواح اسی زمرے میں داخل ہیں۔ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ روح انسانی درحقیقت روح اعظم یا روح قدس ہے۔ جو بلحاظ ربوبیت ذات حق کا مظہر ہے۔ اور اسے سوائے ذاتِ حق اور کوئی نہیں پہچان سکتا۔ اور نہ کسی مشاہدے میں آسکتی ہے۔ قرآن پاک میں وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ اسی روح اعظم کے لئے کہا گیا ہے۔ اور جس طرح روح اعظم کے لئے عالم کبیر میں اسماء و مظاہر ہیں۔ جیسے عقل اول۔ قلم اعلیٰ، نور، نفس کلیہ، لوح محفوظ وغیرہ اسی طرح عالم صغیر انسانی میں بھی اس کے ظہوروں اور مرتبوں کے اعتبار سے مظاہر اور اسماء ہیں جیسے۔ سر۔ خفی۔ روح۔ قلب۔ فواد۔ صدر۔ عقل وغیرہ۔

ان میں سے ہر ایک کا ذکر آیات قرآنی میں موجود ہے۔ بخوف طوالت تفصیل سے احتراز کیا جاتا ہے۔

حکماء کے نزدیک روح[۵۱] ایک جوہر ہے۔ جو اپنی ذات کے لحاظ سے مادہ سے خالی ہے۔ لیکن اپنی صفات کے اعتبار سے مادہ سے متعلق ہے۔ ان کے نظریے کے مطابق وہ ایک لطیف بخار ہے۔ جسے روح طبعی، روح نفسی اور روح حیوانی بھی کہا جاتا ہے

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رح اس کو "نسمہ" کہتے ہیں جو رُوح اعظم یا رُوح قدس کیلئے ایک سواری کی طرح ہے دونوں میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے[۵۲]

---

۵۱ مراد رُوح حیوانی۔

۵۲ حجۃ اللہ البالغہ

Marfat.com

حضرت غوث علی شاہ قلندر پانی پتیؒ کے خلیفۂ اجلّ حضرت گل حسن شاہ صاحب "تعلیم غوثیہ" میں ایک جگہ لکھتے ہیں "یہ ارواح یعنے روح طبعی۔ روح نفسانی و روح حیوانی مخلوق ہیں اور فانی۔ اور ایک روح انسانی ہے جس کو روح اللہ، روح ربانی اور امر رب کہتے ہیں"۔ وہ اجسام میں داخل یا خارج ہونے سے منزہ ہے۔ اور افہام عقول و ادراکات شعور سے برتر و پاک ہے۔ اہل شریعت اس روح کو امر رب اور اہل تصوف مظہر حق و سرِ ذات کہتے ہیں

گر نبودے ذاتِ حق اندر وجود
آب و گِل راکے ملک کردے سجود

ارشاد باری ہے :۔

وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (۱۵—۲۹)

اس میں اسی روح قدس کی طرف اشارہ ہے۔ [1]

علامہ اقبال بھی اس فرق کے قائل معلوم ہوتے ہیں چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

وہ شے کچھ اور ہے کہتے ہیں جان پاک جسے
یہ رنگ و نم یہ لہو آب و نال کی ہے بیشی

اسلامی تصوف کی "روحانیت" اسی روح اعظم سے نسبت رکھتی ہے۔ اور صوفیۂ کرامؒ "آب و نان کی کمی بیشی" سے پیدا ہونیوالی روح کی بجائے اسی پر جان دیتے ہیں۔

مرتبۂ انسانی

حقیقت انسانیہ کا بیان نامکمل رہے گا جب تک وجودِ حقیقی کے سلسلۂ ظہور کی آخری کڑی "مرتبۂ انسانی" کی بابت صوفیہ کرام کا نقطۂ نظر واضح نہ کیا جائے۔ چنانچہ

---

[1] مقدمۃ الکتاب، تعلیم غوثیہ

Marfat.com

ان کے نزدیک "وجود حقیقی" کے ظہور کا آخری مرتبہ مرتبۂ جامعیت ہے۔ وہ اس کی پچھلی تجلی اور آخری لباس ہے۔ اور اسی کا نام "انسان" ہے۔

اس انسان کو جب اپنی حقیقت کا عرفان ہوتا ہے۔ تو وہ خود کو ذاتِ حق سے واصل پاتا ہے۔ یہ عرفان بھی بالمراتب حاصل ہوتا ہے۔ اور ہر مرتبۂ عرفان کے اسماء و آثار مختلف ہیں۔ صوفیہ اس عرفان کو عروج کہتے ہیں۔ "انسان" جب تمام مراتب عروج طے کر لیتا ہے تو اسے "انسان کامل" کہتے ہیں۔

غرض یہ کہ "انسان" بلحاظ "روح قدسی" حق اور بلحاظ جسم و صورت خلق ہے۔ اللہ تعالیٰ ملائک کو حکم فرماتا ہے :-

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ط

ترجمہ :- جب ٹھیک بنا چکوں اور پھونک دوں اس میں اپنی روح تو گر پڑو اس کے آگے سجدے میں۔ (۱۵-۲۹)

چنانچہ جیسا پہلے مذکور ہوا۔ صوفیۂ وجودیہ کے نزدیک یہ "روح اور ذاتِ حقیقت" واحدہ ہیں۔ اور ملائکہ کا سجدہ حقیقت آدم یعنی روح اللہ یا ذات کو تھا۔ اسی لئے وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ کے بعد فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ط آیا ہے۔

قرآن پاک میں ہے :-

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ط

(۷-۱۱)

ہم نے کہا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو۔ پس سجدہ کیا انہوں نے مگر ابلیس نے (نہ کیا) (لہذا مردود بارگاہ الٰہی ہوا)

اس کی ایک تعبیر یوں بھی کی جاتی ہے۔ کہ جب امر ربی یعنے روح قدس تنِ خاکی میں پھونکی جاتی ہے تو عقل و فہم ہوش و حواس اور اخلاقِ حسنہ وغیرہ مثل ملائکہ

سر جھکاتے اور خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ لیکن جذباتِ شہوانی اور لذاتِ نفسانی سرکشی و نافرمانی کرتے ہیں۔ یہی آدم کے شیطان ہیں۔ اور انہی کے باعث انسان سے اعمالِ خبیثہ سرزد ہوتے ہیں۔ بہرحال اس تعبیر سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا اصل کارنامہ جذبات شہوانی کو رام کر کے انسانیت کے اعلیٰ مدارج کی جانب عروج کرنا ہے یہ اسلامی تصوف کا ایک مخصوص شعبہ ہے۔ جسے "تزکیۂ نفس" کہتے ہیں۔)

بہرحال اصل چیز "روح قدس" ہے اور وہی "حقیقت انسانیہ" ہے یہ حقیقت جسم و نسمہ، عقل و شعور اور حس وادراک وغیرہ کے پردوں میں محجوب اور ان سب سے اعلیٰ ہے۔ اس کی سرّیت سے متعلق حضور غوث الاعظم قدس سرہٗ کا الہام اور علامہ اقبال کے اشعار ابتدائی صفحات میں نقل کئے جا چکے ہیں۔

عوام الناس اس "راز" کی حقیقت شاید اس مثال سے اچھی طرح سمجھ سکیں۔ فرض کیجئے کہ سائنسی علوم کی مدد سے ایک حسین ترین انسانی مجسمہ تیار کیا جائے اسے بہترین لباس بھی پہنا دیا جائے۔ اور اس میں ایسے آلات نصب کر دئے جائیں کہ وہ انسانوں کی طرح حرکت بھی کرے اور بہترین سریلی آواز سے گائے بھی۔ تو کیا کوئی عقلمند انسان اس پر یا وہ حسین مجسمہ کسی دوسرے انسان پر عاشق ہو سکتا ہے۔ یا کوئی شخص کبھی کسی حسین لیکن مردہ عورت پر فریفتہ ہو سکتا ہے۔ پھر وہ کونسی چیز ہے جو "عاشق" یا "معشوق" ہو سکتی ہے۔ انسان کی حد تک جو شے ان الفاظ کی سزاوار ہے وہ "حقیقت انسانیہ" ہی ہے یعنے وہی حقیقتِ اقدس جو مرتبہ اطلاق سے مرتبۂ انسان تک قائم و ظاہر ہے۔

وجودی تصوف میں اس حقیقت کا دائرہ اتنا وسیع ہے۔ کہ ہر ذرۂ کائنات اس کے اندر آجاتا ہے اور صوفیائے کرام ہر شئے کے اندر اسی کو دیکھتے اور اس سے محبت کرتے ہیں۔

Marfat.com

اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ ط (۴۱-۵۴) اسی راز کی شرح ہے۔

عام نظر کے سامنے یہ "ذات" یا "حقیقت" مختلف صفات و تعینات کے پردوں میں چھپ کر آتی ہے اور عشق و محبت کے رشتے بظاہر انہی کے ساتھ الجھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت شناس نظریں حقیقت بن کر حقیقت کو دیکھتیں اور اسی سے عشق و محبت کے رشتے قائم رکھتی ہیں۔ صفات و تعینات کی غیریّت اور ان کے حجابات ان عوام کے لئے ہیں جو حقیقت سے نا آشنا رہتے ہیں۔ حقیقت آشنا کے لئے تو معشوق کی ہر ادا معشوق ہوتی ہے۔ وہ معشوق کی ادا کو معشوق سے الگ کر کے نہیں دیکھتا۔ جب تک یہ باور کیا جائے گا کہ عشق رنگ روپ، خد وخال چال ڈھال اور ناز و ادا سے ہوتا ہے۔ اس وقت تک عشق، عاشق اور معشوق سب حقیقت سے دور رہیں گے۔

نظر بزلف و رُخ و خال نیست عاشق را
تو واقفی کہ سرِ رشتہ در کجا بند است

مشاہدہ
معروضی و موضوعی

اہل علم جانتے ہیں کہ مشاہدہ کے نقطہ ہائے نظر دو ہوتے ہیں ایک معروضی یا ظاہری (OBJECTIVE) اور دوسرا موضوعی یا داخلی (SUBJECTIVE) معروضی نقطۂ نظر (ظاہری) کو سائنسی بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں اشیاء کو خارج سے دیکھا جاتا ہے۔ لیکن داخلی نقطۂ نظر میں باطنی اشیاء کو بذریعہ باطن دیکھتے ہیں۔ اس

میں اشیاء کا مشاہدہ بلا تجزیہ و تقسیم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں تجزیہ و تقسیم کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مشاہدۂ داخلی میں کسی شے کی حقیقت وہ ہوتی ہے جو ہمارے باطنی شعور کے ذریعہ متعین ہو۔ جس طرح ہم کسی نغمہ کو بلا تجزیہ و تقسیم ایک نغمہ سمجھتے اور اس طرح اس کو ایک مکمل شے سمجھتے ہوئے۔ اُس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا شعور اپنے تمام معروضات کو ایک مکمل واحدے کے طور پر دیکھتا ہے۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے دوسری مثال یہ پیش کی جا سکتی ہے کہ جب ہم اپنے وطن کی کوئی تصویر دیکھتے ہیں۔ جس میں اس کا کوئی خاص حصہ یا منظر ہو۔ تو فوراً ہماری آنکھوں میں پورے وطن کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ اور ہم اپنے آپ کو وطن کی فضاؤں میں سانس لیتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ جسمانی حیثیت سے ہم وہاں ہیں۔ نہ وہ تصویر پورے وطن کی ہوتی ہے۔ نہ کسی تصویر میں اس کے مناظر، اس کے موسم، اس کی آب و ہوا اور اس کی وہ فضائیں نظر آتی ہیں۔ جن میں ہم زندگی کا کافی وقت اس کے ایک زندہ جزو کی حیثیت سے گزار چکے ہیں۔ کسی دوسرے شخص کے سامنے جس نے ہمارے وطن کو نہ دیکھا ہو۔ وطن کی تصاویر خواہ کتنی ہی تعداد میں پیش کی جائیں لیکن وہ ہر تصویر کو ہمارے وطن کا ایک ٹکڑا ہی سمجھ کر دیکھے گا۔ اور اس کی مجموعی فضاؤں کی حقیقت تک ہرگز نہ پہنچ سکے گا نہ اس سے اس طرح لطف اندوز ہو گا۔ جس طرح میں ہو سکتا ہوں یہ فرق بنیادی فرق نظر کا نتیجہ ہے۔ میرے شعور میں وطن ایک حقیقت کی حیثیت سے موجود ہے۔ اور میں خود اس وقت بلحاظ باطن یا بلحاظ شعور اس کا ایک حقیقی جزو ہوں حالانکہ جسمانی طور پر اس وقت اس سے الگ اور بہت دور ہوں اس کے باوجود میں جب چاہوں میری باطنی نسبت "اس حقیقت کلی" (وطن) اور اس کی فضاؤں میں باطنی طور پر ڈوب[1] جاتی ہے اور اس سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ

---

[1] اقبال کہتے ہیں:- "اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی" (ضرب کلیم)

Marfat.com

دیتی ہے اور میں تھوڑی دیر کے لئے ہزاروں میل دور رہ کر بھی اپنے وطن میں "موجود" ہوتا ہوں۔ اس کے برخلاف وہ شخص جس کے شعور میں یہ مخصوص واحدہ (میرا وطن اور اس کی فضائیں) نہیں اور جو، واقعی اس کا "حقیقی جزو" [1] نہیں ہے۔ ان تمام حقائق سے جو مذکور ہوئے۔ محروم رہتا ہے۔ اور اس کی ہر تصویر کو محض ایک ٹکڑا ایک بے جان ٹکڑا بلکہ اس کی تصویر سمجھتا ہے۔ اس کا "تجربہ" اسے اس دائرے سے باہر نکال بھی نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ میرے "تجربات" اور "واردات قلبی" سے مختلف اور محدود ہوتا ہے اس مثال سے سمجھ میں آجائے گا۔ کہ "حقیقت تک رسائی" کشف صدر اور نور بصیرت (جسے حکماء کی زبان میں وجدان کہا جاتا ہے) کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ لیکن عقل اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دیکھتی ہے۔ اسی لئے "اصل حقیقت" تک پہنچنے کے واسطے عقل کی بجائے نور بصیرت کی ضرورت ہے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود (رُومیؒ)
عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں! (اقبال [2])

ان حقائق کے پیش نظر اکابر صوفیۂ وجودیہ کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کیجئے ان کا وطن "وحدتِ وجودِ حقیقی" ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق وہ خود بلحاظ تعین "وجود حقیقی" کے "غیر" اور اس سے "دور نظر آتے ہیں۔ لیکن بلحاظِ "حقیقت" اس کے "عین" ہوتے ہیں۔ وہ اپنے باطنی شعور (نور بصیرت [3] یا وجدان) کے ذریعہ اس حقیقت

---

[1] بطور استعارہ [2] تفصیل کے لئے اقبال کا پہلا لیکچر بھی پڑھئے۔

[3] اولیاء اللہ کے نور بصیرت اور حکماء کے وجدان میں توحید و رسالت کے اقرار و انکار سے بنیادی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

میں جس طرح ڈوب جاتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ وہ شخص نہیں کر سکتا جس نے اکابر صوفیۂ وجودیہ کے مذکورہ "وطن" کی "سیر" نہ کی ہو۔ نہ اس میں "پرورش" پائی ہو۔ یعنے جس نے بنیادی طور پر عقیدۂ وحدتِ وجود کو اپنایا نہ ہو اور وجودِ حقیقی کے فیضانِ قدس سے بھی اسے کوئی حصہ نہ ملا ہو۔ ایسے شخص کی نظر میں یہ تمام کائنات مختلف تصاویر کا ایک بے معنے "مجموعہ" ہو گی۔ اور اس مجموعہ میں اُسے ہرگز کوئی "وحدت" نظر نہ آئے گی۔ نہ اس سے وہ اس طرح محبت کرے گا جس طرح ایک "حقیقی مُوَحّد" کر سکتا ہے۔ اس "وحدت" کا شعور کائنات کے ہر ذرہ میں اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ہم اپنے آپ کو اس "حقیقت" کا غیر نہ سمجھیں۔ صوفیۂ کرام سچ کہتے ہیں۔ کہ ہماری سمجھ ہی نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ ورنہ ؎

"وہ آپ تماشا ہے اور آپ تماشائی"

کجا غیر کو غیر کو نقشِ غیر
ھُوَ اللّٰہُ وَاللّٰہُ مَافِی الْوُجُوْد

اور خود وہ "حقیقت" اس "حجاب غیریت" کو "ھُوَ الظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ۔ اور فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ کہہ کر دور کر رہی ہے۔ لیکن ہمارا عقیدہ چونکہ "غیریت" اور "دوئی" پر مبنی ہے۔ لہٰذا "وہ" نظر نہیں آتا۔ قصور خود ہمارا ہے۔ ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

صوفیۂ کرام مذکورہ بنیادی عقیدے کو بذریعہ عبادت و مجاہدہ اپنا حال بنا لیتے ہیں۔ اور فیضان قدس سے حصۂ رسدی کے موجب اعلیٰ سے اعلیٰ منزل پر فائز ہوتے رہتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :۔

Marfat.com

اَللّٰھُمَّ زِدْنِیْ عِلْمًا ط یہ اسی امر کی جانب اشارہ کرتا ہے۔

اب پھر اصل موضوع کی طرف رجوع کیجیے۔ یعنی یہ کہ اصل انسان "روح ملکوتی" ہے۔ اور صاحب قرب و ولایت وہ شخص ہوتا ہے جسے ذات حقیقی کا عرفان نہ صرف بطور علم حاصل ہو بلکہ جسے خود وہ ذات جامع جمیع صفات محض اپنے فضل و کرم سے اپنے محبوب حقیقی صلی اللہ علیہ وسلم کے توسل سے اپنا مقرب بنالے۔ اُسی کے سر پر اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً ط کا تاج رکھا گیا ہے۔ یہاں "خلیفہ" سے ایسی شخصیت مراد ہے جسے خدا اور رسول کی ذات میں عشق و اطاعت کے ذریعہ فنائیت کا درجہ حاصل ہو۔ جن اشخاص کو خدا اور رسول کی معرفت حاصل نہ ہو۔ جو ان کے عاشق زار اور سچے فرماں بردار نہ ہوں اور جو کفر و نفاق اور شرک میں مُبتلا ہوں۔ جو شخص مشینی، پتلیوں یا مجسموں کی طرح "حرکت" یا "حیات" رکھتے ہوں یا ایسی حیات کے قائل ہوں۔ اُنہیں قرآن پاک ان الفاظ سے یاد کرتا ہے۔

لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا۔ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۷ — ۱۷۹)

یعنے ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں۔ ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے کان ہیں۔ لیکن ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ ڈھوروں کی مانند ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ۔

صوفیۂ کرام ایسے ہی لوگوں کو "غافل" "اندھے" اور "مُردہ" کہتے ہیں۔

حقیقتِ انسانیہ سے متعلق مزید آیاتِ قرآنی

"حقیقتِ انسانیہ" سے متعلق قرآن پاک کی ایک دو آیات پہلے مذکور ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ دو تین آیات اور ملاحظہ ہوں۔ یعنے

Marfat.com

وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۶۴ - ۳)

اور تمہاری صورت کھینچی - پس نہایت اچھی بنائی تمہاری صورت - یا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ط (۹۵ - ۴)

ہم نے بنایا انسان بہترین اندازے یا نمونے پر - یا

وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ (۱۷ - ۷۰)

اور ہم نے عزت بخشی بنی آدم کو - یا

وَلَقَدْ خَلَقْنَاکُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَاکُمْ ثُمَّ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط لَمْ یَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ (۷ - ۱۱)

اور تحقیق ہم نے ہی تم کو خلق کیا - اور پھر تمہاری صورت بنائی - پھر ہم نے ملائکہ کو حکم دیا - کہ آدم کو سجدہ کریں - پس وہ سجدہ میں گر پڑے - مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں سے نہ ہوا -

ان تمام آیات میں "حقیقت انسانیہ" ہی کی تعریف کی گئی ہے جو جملہ اخلاق اللہ سے منصف ہو کر "انسان" کی صورت میں ظاہر ہوئی - اور نہ جانے کب تک ظاہر ہوتی رہے گی -

شہادت احادیث

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ[1] -

اس نے پیدا کیا انسان کو اپنی صورت پر -

مشہور حدیث ہے - یہاں بھی صورت سے مراد وہی "اہلیتیں" ہیں جنہیں صوفیہ کرام "صفات جمالی و جلالی" کے نام سے موسوم کرتے ہیں - اور دیگر حضرات "قوت تسخیر" -

---

[1] اسے مسلم رح نے بروایت ابی ہریرہ رض بیان کیا ہے -

Marfat.com

"تخلیقی قوت" فعالیت، قوت عمل وغیرہ کہتے ہیں۔ ایک اور حدیث قدسی میں آیا ہے۔

فَاِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ فَاعْرِفْ نَفْسَکَ یَا اِنْسَانُ تَعْرِفُ رَبَّکَ۔

پس تحقیق اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا انسان کو اپنی صورت پر۔ پس پہچان اپنے نفس کو اے انسان! تاکہ پہچانے تو اپنے خدا کو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا مشہور قول ہے:۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ [1]

جس نے اپنے آپ کو پہچانا۔ اس نے اپنے رب کو پہچانا۔

اور ان کا مفہوم اس آیت کے مطابق ہے:۔

سَنُرِیْہِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِہِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمْ اَنَّہُ الْحَقُّ (۴۱-۵۳)

یعنے ہم ان کو جلد دکھا دیں گے اپنی نشانیاں اطراف عالم میں اور ان کے نفسوں میں یہاں تک کہ وہ پکار اٹھیں گے۔ تحقیق یہ حق ہے۔

مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی صلعم اور قول حضرت علیؓ سے متعدد نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مثلاً

(۱) معنوی اعتبار سے نفس انسانی، آفاقی نشانیوں اور حق کے درمیان ایک وحدت کارفرما ہے۔ (جیساکہ اوپر مذکور ہو چکا ہے)

(۲) انفس اور آفاق کی نشانیوں کا اصل مقصد خالق کل کے نزدیک یہ ہے کہ بالآخر انسان پکار اٹھے کہ "تحقیق یہ ہے حق"

---

[1] بعض علماء اسے حدیث قرار دیتے ہیں۔ (واللہ اعلم)

Marfat.com

(۳) اس عرفانِ حق کے لئے انسان پہلے خود اپنے نفس کو پہچانے (یعنے عرفان نفس عرفانِ حق ہے۔ اسی کو معلوم سے نامعلوم کی طرف جانا کہتے ہیں)

(۴) عالم کی نشانیوں کا عرفان بھی عرفانِ حق ہے۔

(۵) اور بالآخر انسان اس وحدت پر اپنی توجہ مرکوز رکھے جو انفس و آفاق اور ان کے خالق کے درمیان کار فرما ہے۔

بزرگانِ دین نے عرفانِ نفس پر اس لئے زور دیا ہے کہ انسان کائنات کا خلاصہ ہے۔ اور اس کے اندر تمام عالم سمایا ہوا ہے۔ چنانچہ خلاصۂ کائنات کا عرفان لامحالہ کل کائنات کا عرفان ہوگا۔

عرفان کے وسیع معنے

عرفان کے متعلق بھی غلط فہمیاں ہیں۔ جن کا رفع کرنا ضروری ہے۔ عرفان ایک وسیع المعنی لفظ ہے۔ یہ نہ صرف ذات یا نفس کی پہچان تک محدود ہے۔ بلکہ اس کے دائرے میں ذات کی جملہ صفات اور اس کے تمام آثار و افعال کی معرفت بھی داخل ہے۔ آخر کسی ذات یا نفس کا تصور اس کی صفات اور افعال سے علیحدہ کرکے کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ اسی لئے مذکورہ آیات میں کہا گیا ہے۔ کہ انفس و آفاق میں ہم اپنی نشانیاں دکھائیں گے۔ ان نشانیوں میں بلکہ ہر ذرہ میں حرکت، حیات اور فعالیت موجود ہے۔ جنہیں صوفیۂ کرام صفاتِ جمالی و جلالی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ (اب تو سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ ہر ذرّہ جوہری توانائی کا خزانہ ہے نیز یہ کہ ہر ایٹم کے اندر مثبت برق پارے منفی برق پاروں کے گرد نہایت تیزی سے گردش کرتے رہتے ہیں) انہی تمام امور کی پہچان عرفان ہے۔ جو حقیقتاً عمل ہے۔ عرفان کسی بتِ خاموش کا نظارۂ محض نہیں ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ

Marfat.com

"ایاز قدرِ خود بشناس"

تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اپنی حیثیت سے آگے نہ بڑھ۔ یہاں بھی عرفان یا پہچان عمل ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہی عمل اگر خدا کی یافت کے لئے کیا جائے۔ تو صوفیاء کرام کا "عمل" بن جاتا ہے۔ ورنہ خدا سے غافل رہنے کا سبب۔ عارف رومیؒ فرماتے ہیں:-

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

مذکورۂ بالا آیۂ کا منشا بھی یہی ہے کہ نشانیاں اصل مقصود نہیں بلکہ ان کے ذریعہ حق تک پہنچنا اور ان میں حق کا مشاہدہ کرنا اصل مقصود ہے۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیثِ احسان[1] (بنیادِ تصوف) میں بھی مشاہدہ کے ساتھ عبادت کا ذکر ہے محض مشاہدہ کا نہیں اور عبادت سراسر عمل ہے کیونکہ مؤمن کا ہر نیک کام عبادت ہے۔

غرض یہ کہ "عرفانِ نفس" اسی بات پر یقین رکھنے کا دوسرا نام ہے کہ میں حق تعالےٰ کے "نظامِ ظہور" کا ایک حقیقی پرزہ ہوں۔ اس سے الگ میری کوئی ہستی نہیں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ میری اپنی حقیقت، ممکناتِ عالم اور وہ ذاتِ مطلقہ جو سب کی خالق ہے۔ فی نفسہ ایک دوسرے سے علیحدہ تین واحدے نہیں (جن کا تصور کم ازکم وجودِ حقیقی کی حد تک) الگ الگ قائم کیا جاسکے۔ یا جن کے عرفان کے دائرے ایک دوسرے سے قطعی الگ ہوں۔ یہ سب ایک ہی حقیقت کی تفصیل اور ایک ہی شمع کی تجلیات ہیں

---

[1] اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ ط
(متفق علیہ)

یعنے تو عبادت کرے خدا کی گویا تو اسے دیکھتا ہے۔ پس اگر تو نہیں دیکھتا اس کو پس تحقیق وہ دیکھتا ہے تجھ کو۔

Marfat.com

ان سب کا خلاصہ "انسان" ہے اس لئے عرفائے کرام اور صوفیائے اسلام نے عرفانِ نفس پر ہی زیادہ زور دیا ہے۔ کیونکہ اسی میں سب کچھ ہے۔۔

چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے جگر گوشوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

(۱) يَا وَلَدِيْ فِكْرُكَ فِيْكَ يَكْفِيْكَ
فَلَيْسَ شَيْءٌ خَارِجًا مِنْكَ

---

(۲) وَدَائُكَ فِيْكَ وَمَا تَشْعُرُ
وَدَوَائُكَ مِنْكَ وَلَا تُبْصِرُ

(۳) وَتَزْعَمُ اِنَّكَ جِسْمٌ صَغِيْرٌ
وَفِيْكَ انْطَوَى عَالَمٌ اَكْبَرُ

(۴) وَاَنْتَ اُمُّ الْكِتَابِ الَّذِيْ
مَاحَرْفُهٗ يُظْهِرُ الْمُضْمَرُ

اے میرے فرزند! تیری فکر تجھ میں تیرے لئے کافی ہے۔ کیونکہ کوئی شی تجھ سے خارج نہیں۔

اور تیرا درد تیرے اندر ہے اور تو نہیں جانتا۔ اور تیری دوا تجھ میں ہے اور تو نہیں دیکھتا۔

اور تجھے گمان ہے کہ تو چھوٹا سا جسم ہے۔ حالانکہ تیرے اندر ایک عالم اکبر لپٹا ہوا ہے۔

اور تو وہ ام الکتاب ہے کہ اپنے حرفوں سے دل کی بات جانتا ہے۔

ان نکات کی تشریح مستند کتب تصوف میں موجود ہے۔ جس کے اعادہ کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

Marfat.com

حضرت مغربیؒ فرماتے ہیں :-

ما جام جہاں نمائے ذاتیم
ما مظہر جملۂ صفاتیم
ما نسخۂ نامۂ الٰہیم
ما گنج طلسمِ کائناتیم
ہم صورتِ واجب الوجودیم
ہم معنئ جانِ ممکناتیم
برتر زمکان و در مکانیم
بیروں زجہات و درجہاتیم
ہرچند کہ مجمل دو کونیم
تفصیل جمیع مجملاتیم

اور حضرت شیخ فرید الدین عطارؒ فرماتے ہیں :-

تو بمعنے جان جملہ عالمے
ہر دو عالم خود توئی بنگر دمے
در حقیقت خود توئی اُم الکتاب
خود زخود آیات حق را باز یاب
تو بمعنے برتری از انس و جاں
ہرچہ بینی خود توئی بنگر بداں

دانشِ آفاق را از نفس خواں
تاکہ گردی عارفِ اسرار داں

Marfat.com

گر ہمی خواہی کہ گردی حق شناس
خویش را بشناس از راہِ قیاس

ہر چہ موجود است در عالم توئی
وانچہ توجویائی آنی ہم توئی[1]

نظرے بسوئے خود کن کہ تو جان دلربائی
مفگن بخاک خود را کہ تو از بلند جائی
تو زچشمِ خود نہانی تو کمال خود چہ دانی
چو دُر از صدف برُوں آکہ تو بس گراں بہائی

ہر دو عالم شد بہ نور ما عیاں
اصل ہر پیدا و پنہانے منم
نیست عالم در حقیقت جز طلسم
گنج بے پایاں اگر دانی منم

ان کے علاوہ حضرت مولانائے رومؒ، حضرت غوث الاعظم، حضور غریب نواز اجمیریؒ اور دیگر اکابر صوفیہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے صدہا اشعار و اقوال اس سلسلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جن سے حقیقتِ انسانیہ اور اس کے عرفان کی وسعتیں بے نقاب ہو جاتی ہیں۔

مذکورہ بالا واضح آیاتِ قرآنی، احادیث نبویؐ اور اقوال و اشعار اولیاء اللہ

---

[1] مثنوی طویل ہے۔ صرف چند اشعار لیے گئے ہیں۔

Marfat.com

کے ہوتے ہوئے اسلامی تصوف کے متعلق یہ کہنا کہ وہ "نفی خودی" کی تعلیم دیتا ہے یا وہ ایک "سکونی نظریہ حیات" ہے۔ بہتانِ عظیم ہے

فرد اور حقیقتِ انسانیہ کا فرق

جس طرح مجرد و بسیط اشیاء کا ظہور کسی جسم کے آئینہ میں ہوتا ہے۔ اسی طرح "حقیقتِ انسانیہ" بھی افراد کے پردے میں ظاہر ہوتی ہے۔

شعاعِ آفتاب از چارم افلاک
نگردد منعکس جز بر سرِ خاک

اس لئے فرد ظاہر و باطن کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے صحیح راہ ترقی وہی ہو سکتی ہے جو اس کے ظاہر و باطن کو اونچی سے اونچی منزلوں پر لے جائے۔ اسی راہ کا دوسرا نام "اسلام" ہے۔

اسلام شریعت و طریقت کا مجموعہ ہے۔ شریعت کا تعلق ظاہر سے اور طریقت کا باطن سے ہے۔ صفائے باطن کے بغیر نہ حقوق العباد ادا ہو سکتے ہیں۔ نہ حقوق اللہ۔ قرآن پاک میں ہے:۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ وہ دن جب نہ کام آئے گا مال اور نہ اولاد
إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ط مگر وہ شخص جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آیا۔ (۲۶-۸۸، ۸۹)

"قلب" کیا ہے؟ اس کی سلامتی کے کیا قواعد و اصول ہیں۔ وہ کس طرح اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام امور اسلامی تصوف یا طریقت کے تحت آتے ہیں۔ اور چونکہ اسلام کا اہم ترین مقصود یہی ہے جو اس آیت قرآنی میں مذکور ہوا۔ کوئی شخص جب تک "صوفی" (صفائے قلب کا حامل) نہ بنے وہ صحیح معنے میں نہ مسلم ہو

Marfat.com

سکتا ہے اور نہ مومن۔

بہرحال فرد اور حقیقتِ انسانیہ میں فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ فرد مجموعہ ہے "حقیقتِ انسانیہ" اور تجسم و تعین کا، حقیقتِ انسانیہ باقی رہتی ہے۔ اور تعین و تجسم مٹتا ہے۔ بچپن سے ضعیفی تک زید ہزار دن لاکھوں روپ بدلتا ہے۔ لیکن حقیقتِ زید علیٰ حالہ قایم رہتی ہے۔ بالآخر اس کا ظاہری تعین و تجسم فنا ہو جاتا ہے اور ہم کہتے ہیں کہ زید کا انتقال ہو گیا۔ یعنی وہ کسی دوسرے عالم میں منتقل ہو گیا۔ جو ہماری ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ اس لحاظ سے حقیقت انسانیہ کی جگہ فرد کا استعمال غلط ہے۔

اسی لحاظ سے خدا کے لئے فرد کا استعمال بدرجہ اولیٰ غلط ہے۔ کیونکہ اس سے ذہن تجسم و تعین کی جانب منتقل ہوتا ہے۔

اسی طرح لفظ "خودی" یا "اَنَا" کے استعمال میں بھی احتیاط لازم ہے۔ ان کا استعمال مجرد اور بسیط حقیقت ہی کے لئے ہونا چاہیئے۔ نہ کہ "فرد" کی جگہ۔ اقبال کا شعر ہے:۔

نقطۂ نوری کہ نام او خودی ست
زیرِ خاکِ ما شرار زندگی ست

یہ انسان کی حقیقت ہی کو واضح کرتا ہے۔

لفظ انسان البتہ دونوں کے لئے مستعمل ہے۔ مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ انسان فانی ہے۔ تو ہماری مراد اس کے ظاہر سے ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم یہ کہیں کہ "انسان نہ روح ہے نہ بدن" بلکہ "وہ خدا کا ایک راز ہے" تو اس سے مراد "حقیقت انسانیہ" ہے۔

اہلِ یورپ اور ہمارے نظریات کا فرق

روح سے متعلق یورپ کا تصور ہمارے اسلامی تصور سے مختلف ہے۔ لہذا یہ تسلیم کرنا ضروری ہے۔ کہ ہماری روحانیت بھی یورپ کی روحانیت سے مختلف ہے۔ حالانکہ اس کے بیان کرنے میں متعدد الفاظ مشترک استعمال کئے جاتے ہیں۔

یورپ اس بات کا قائل ہے کہ انسانی روح بھی درختوں کی طرح ارتقاء یافتہ ہے۔ لیکن قرآن پاک اُسے "امرِ ربّی" بتاتا ہے۔ اور اسی بناء پر نیز وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ سے استدلال کرتے ہوئے مسلمان اُسے ایک مقدس حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔ اور رُوحِ حیوانی سے مختلف قرار دیتے ہیں۔

اسی لئے ہمارے ہاں رُوحانی ترقی، اور مادی ترقی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ اس سے حیاتِ انسانی کے دو مختلف پہلو واضح ہوتے ہیں۔ جن کا باہم متضاد ہونا ضروری نہیں۔ نہ یہ ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے پر منحصر ہوں۔ البتہ اسلام اس بات کو ضروری قرار دیتا ہے کہ مادی وسائل ترقی کو (اگر وہ موجود ہوں) روحانی ترقی اور اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جائے۔ اور یورپ کی طرح ان وسائل اور مادی ترقی ہی کو واحد مقصدِ حیات نہ سمجھ لیا جائے۔

اسلام یہ تو ضرور مناسب سمجھتا ہے۔ کہ بنی نوعِ انسان کی ظاہری ترقی اجتماعی ہو لیکن روحانی و اخلاقی ترقی انفرادی چاہتا ہے۔ اور بعد مرگ باز پرس بھی ہر شخص سے الگ الگ ہوگی۔ اور ہر شخص اپنا بوجھ خود اٹھائے گا۔ لیکن یورپ نہ روح کے تقدس کا قائل ہے۔ نہ آخرت کی جزا و سزا کا۔[۱]

---

۱ مزید تفصیل کے لئے دیکھو محمد لیوپولڈ اسد کی کتاب (Islam At The Cross Roads)

اسلامی تصوّف میں ارتقاء کا مفہوم

اسلام میں حیات ارتقائی ہے۔ لیکن اس ارتقا کی نوعیت اس کے مدارج اور اس کی انتہا سب کچھ دنیا کے تمام حکماء، فلاسفہ اور بانیانِ مذاہب کے نظریات وعقائد سے مختلف ہے۔ لہذا "ارتقا حیات" سے متعلق اسلامی نظریات معلوم کرنے کے لئے ان حقائق معنوی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ جو قرآن اور احادیث نبوی میں جابجا مذکور ہیں۔ اور جنہیں صوفیہ کی تحریروں میں بالخصوص عارفِ رُومیؒ کی مثنوی میں بہترین طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے لئے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی لاجواب کتاب "حکمتِ رومی" کا مطالعہ بے حد ضروری ہے[1]

افسوس ہے کہ قرآن پاک کے معنوی حقائق کا پتہ لگانے کی بجائے ظاہر پرست اشخاص ویدانت بدھمت، افلاطونیت اور نوفلاطونیت کی خاک چھانتے رہتے ہیں اور ان مستشرقین کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔ جو نہ وحی کے قائل ہیں اور نہ ہمارے آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمتِ شان کے۔ نہ قرآن پاک اور اس کے دقیق معارف معنوی کی صداقت کے۔ نہ روح اعظم کے نہ اس کی معراج کے۔ نہ مسلک اولیاء کے۔ ایسے محققین اگر اسلام کی تعریف کریں تو وہ صداقت سے خالی ہی ہو گی۔ اگر آپ اُن سے کہیں کہ قرآن اور اسلام پر ایمان لے آئیں تو وہ ہرگز ایسا نہ کریں گے۔ پھر مسلم "محققین" کو کیا ہو گیا ہے جو اپنے خزانے کو نظر انداز کر کے کنگالوں اور مفلسوں سے ہدایت

---

[1] حالانکہ خلیفہ صاحب کی بعض توضیحات سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ تاہم بحیثیتِ مجموعی ان کی یہ کتاب لاجواب ہے۔

Marfat.com

کی بھیک مانگتے ہیں (ہمیں ان کی "علمی" خدمات سے انکار نہیں لیکن یہ بات اپنی جگہ حق ہے کہ وہ قرآن پاک، اسلام یا حضور خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان نہیں رکھتے)

اسلام اپنے مخصوص انداز میں انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج حیات تک پہونچنے کے راستے بتاتا ہے۔ اس میں جسم و رُوح، قلب و قالب، ظاہر و باطن، دین و دنیا (آپ جس نام سے چاہیں اسے یاد کریں) سب کی ترقی کا سامان موجود ہے۔ فی الحال ہمارا موضوع "باطن انسان اور اس کی معراج" ہے۔ جو ہر صحیح الدماغ انسان بالخصوص مسلم کا محبوب ترین موضوع فکر ہونا چاہیئے۔

اس سلسلے میں "حکمتِ دین" کے جاننے والے اولیاء اللہ جنہیں اللہ تبارک و تعالےٰ نور بصیرت اور کشف صدر کی نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ یہ بتاتے ہیں۔ کہ منطقی عقل جزوی عقل ہے۔ جو محض "ظاہر" یعنے محسوسات میں الجھ کر رہ جاتی ہے۔ وہ ماہیت حیات اور اس کے ارتقائی رموز و اسرار کے سمجھنے سے قاصر ہے۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے۔ منزل نہیں ہے

وہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔ اور "حکمت دین" یہ ہے کہ ظاہر سے باطن کی طرف، صورت سے معنی کی طرف رجوع کیا جائے۔ ارتقائے روحانی بھی ظاہر سے باطن کی طرف آنے کا نام ہے۔ نہ صرف بطور علم بلکہ بطور حال۔

محض مادیت اور جسمانیت پر نظر جمانے والے معنویت تک نہیں پہنچ سکتے۔ ایسے اشخاص کے لئے تو محسوسات سے معقولات تک پہنچنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ وہ "حکمتِ دین تک جو نفسی اور روحانی حقایق پر مبنی ہے کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔

قرآن پاک میں رسول اللہ صلعم کے بارے میں تین امور کا ذکر ہے:-

Marfat.com

یُزَکِّیۡہِمۡ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ "(۲-۱۶۴)

(۱) تزکیۂ نفس (۲) تعلیم کتاب اور (۳) تعلیم حکمت - یہ تینں جدا جدا امور ہیں - جو واوین عطف کے ساتھ مربوط ہیں - ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں "کتاب" و "حکمت" ایک ہی چیز نہیں ہو سکتی - نور بصیرت سے مشاہدۂ حقائق کرنے والے حضرات "نے کتاب" سے "آیات قرآنی" کے ظاہری معنی یا ظاہر سے متعلق مسائل اور "حکمت" سے نفسی و روحانی حقائق اور معارف حیات مراد لئے ہیں - حضرت مولانائے روم فرماتے ہیں :-

من ز قرآں بر گزیدم مغز را

اُستخواں پیش سگاں انداختم

جُبہ و دستار و علم و قیل و قال

جملہ در آب رواں انداختم

چنانچہ مثنوی میں قرآن کی گہری معنویت ہی بیان کی گئی ہے - جس کا مقصد عروج روحانی ہے - اس لئے اس کی بابت یہ دعوٰی کیا گیا ہے کہ

مثنوئ مولوئ معنوی ❊ ہست قرآں در زبان پہلوی

خلیفہ صاحب صورت و معنے کے تعلق پر عارف رومیؒ کے خیالات کا ذکر کرتے ہوئے حکمت رومیؒ کے صفحات ۱۷۶ و ۱۷۷ پر تحریر فرماتے ہیں :-

"..... یہ کہ صورت حجاب معنے ہے - اس سے یہ غلط نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ صورتوں کے ایک قلم محو ہو جانے سے حقیقت بے نقاب ہو جائے گی - صورت ایک طرف سے حجاب اور نقاب ہے اور دوسری حیثیت سے معنے کی طرف راہنمائی کرتی ہے جس میں ذوق معنے نہ ہو - اس کے لئے وہ حجاب اکبر ہے - لیکن رُوح معرفت کوش کے لئے وہ معنے کی جانب دلیل اور راہبر ہے - اہل معنے نے قرآن کریم کی اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے -

Marfat.com

أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا ۔۔۔۔

حجاب صور کے متعلق غالب کا یہ شعر بھی معانی سے لبریز ہے :-

واقف نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

...... یہ کہ عالم صور کے مقابلے میں عالم معنٰے میں وحدت ہے۔ یہ ایک ایسی عالمگیر حقیقت ہے کہ انبیائؑ و اولیاءؒ و صوفیہؒ کے علاوہ حکماء طبیعین بھی اس کے قائل ہیں۔

.... اب سائنس دان کہتے ہیں۔ کہ تمام مادے کی اصلیت ایک ہی ہے۔ ذرا ذرا سے تغیر سے عناصر میں امتیاز پیدا ہو گیا ہے۔ اور اب وہ نظری طور پر عناصر کے ایک دوسرے میں مبدل ہونے کے بھی قائل ہو گئے ہیں (کوئلہ اور ہیرے کی مثال) عارف رومی اس بارے میں جو کچھ کہہ گیا ہے۔ اب سائنس دان بھی اس یقین پر پہنچا ہے۔ اگر اس کے معلومات عالم طبیعی سے آگے نہیں بڑھے۔ ایک قدم اور اٹھائیں تو وہیں پہنچ جائیں۔ جہاں ولی اور صوفی کا عرفان پہنچا ہے۔ لیکن حکیم طبیعی جب یہ قدم اٹھانا چاہے۔ تو اس کے پاؤں من من بھر کے ہو جاتے ہیں .... عقل کا مصدر بھی توحید وجود ہے۔ اور اس کا نصب العین بھی وحدتوں کی جستجو کرتے ہوئے ایک وحدت کُلّی پر پہنچنا ہے۔ عقل کُلّ آلان کَمَا کَان ہے اور کثرت و تجدد امثال کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ہے۔"

خلیفہ صاحب برگسان اور عارف رومیؒ کے عرفان کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"برگسان ماہیت حیات کا کسی قدر وجدان حاصل کرنے کے بعد اس کو ارتقائی قرار

دیتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کو عارف رومیؒ سے کچھ مناسبت ہے۔ اگرچہ عارفِ رومیؒ کا عرفان اس کے مقابلہ میں بہت زیادہ وسیع اور بہت زیادہ عمیق ہے۔ برگساں آخیر عمر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ عرفانِ ماہیتِ حیات جو عقل سے ماوراء وجدانِ حیات سے حاصل ہوتا ہے وہ اُس عشق کے مرادف ہے۔ جو انبیاء و اولیاء میں پایا جاتا ہے۔ اس تحقیق میں بھی وہ عارفِ رومیؒ کے نقوشِ قدم پر چلا اگرچہ بہت دور تک نہیں جا سکا۔"[۱]

اقبال کے مرشدِ معنوی عارفِ رومیؒ نے عشق سے متعلق جتنے دقیق مطالب کا اظہار اپنی مثنوی اور فیہ مافیہ میں کیا ہے۔ اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ ان کے نظریۂ حیات میں تمام حیات و کائنات کا ظہور عشق کی بدولت ہی ہوا ہے۔ اور جو کچھ ظہور میں آتا ہے اسی عشق کی بدولت آتا ہے۔ اور عشق ہی کی بدولت ہر شے اپنے مرکزِ اصلی کی طرف کھچی چلی جا رہی ہے[۲] "احسن تقویم" جس روح کی شان میں کہا گیا ہے۔ وہی کسی مصلحت کی بناء پر جسے حق تعالےٰ بخوبی جانتا ہے۔ منزل "اَسْفَلَ السافلین" میں پھینک دی گئی۔ مدارج حیات میں یہ درجہ جمادات کو حاصل ہے۔ پھر اس منزل فراق سے وہ روح درجہ بدرجہ ارتقاء پاتی ہوئی۔ خدا کی طرف بڑھتی رہتی ہے۔ تاکہ اقرب سے اقرب ہو جائے۔ اس تمام سفر میں جو کشمکش اور تڑپ ہے۔ اس کو عارفِ رومیؒ جملہ صوفیائے کرامؒ کی طرح عشق کہتے ہیں۔ اس کی اصل سند حدیث قدسی کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرِفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ہے۔

---

[۱] "حکمت رومی" ص ۲۵۶ عشق اولیاء اللہ، وحی و الہام، وحدت وجود، آدم، صورت و معنی، عالم اسباب، سلسلۂ علت و معلول اور جبر و قدر کے دقیق معانی از روئے قرآن معلوم کرنا ہوں۔ تو "حکمت رومیؒ" کا مطالعہ ضروری ہے۔

[۲] عشق پر مقالہ ع۷ دیکھو۔

Marfat.com

اپنے مرشد روحانی عارفِ رومیؒ کے اتباع میں علامہ اقبال بھی اس عشق کی توصیف نہایت مؤثر اور بلیغ الفاظ میں کرتے ہیں اور اسے انہی کی طرح عقل منطقی سے بہتر درجہ میں رکھتے ہیں۔ قلب و نظر، دل و نگاہ، روح و معنی، وغیرہ کی اہمیت پر ان کے بیسیوں اشعار موجود ہیں۔

"جیتا ہے رومیؒ ہارا ہے رازیؒ" انہی کا فیصلہ ہے اور یہ فیصلہ بھی اپنے مرشد معنوی کی تقلید میں کیا ہے۔ جو فرماتے ہیں۔

گر باستدلال کارے دیں بُدے

فخرِ رازی رازدارِ دیں بُدے

غرض یہ کہ سراپردۂ راز تک رسائی حاصل کرنے کے لئے صورت سے معنے یعنے ظاہر سے باطن کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔ بلکہ باطن کی یافت ہی کا دوسرا نام سراپردۂ راز تک رسائی یا "قرب الی اللہ" ہے۔ لیکن چونکہ ہر عامی اس کا اہل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اولیاء اللہ کی راہنمائی ضروری ہے۔ خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ جب اقبال جیسے ذی علم مفکر کو "مرشد معنوی" کی ضرورت تھی تو ان سے کم درجہ کے ذی علم حضرات کس شمار میں ہیں۔

معراجُ المؤمنین

سطور بالا کے پیشِ نظر مومن کی معراج یہ ہے کہ وہ:۔

(۱) اپنی حقیقت کی جہت سے مقرب الٰہی بن جائے۔ اور

(۲) ایک فرد کی حیثیت سے معاشرہ، ملک اور ملّت کو اسلامی نصب العین کے مطابق کامیاب بنانے کی جدوجہد میں مصروف رہے۔ تاکہ کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ کا اعزاز حاصل ہو۔

Marfat.com

لیکن چونکہ ان فرائض کی ادائیگی فضائل قلبی، تزکیہ نفس، تطہیر قلب، حسنِ نیّت عشق الٰہی، اخلاقِ حسنہ وغیرہ وغیرہ کے بغیر ناممکن ہے۔ اس لئے صوفیائے کرام اصلاح باطن اور سلامتی قلب پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ اور ان کے مشرب میں قرب الٰہی کا حصول اصل مقصود حیات ہے۔ کیونکہ قرآن پاک اسی کی تائید و تاکید کرتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے بھی اسرار خودی کے بعد "قلندری" کا سہارا لیا اور مسلک اولیائ ہی میں انہیں سکون قلب نظر آیا چنانچہ فرماتے ہیں۔

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے سکندری سے نہیں

اور

عطا اسلاف کا سوز دروں کر
شریک زمرۂ لا یحزنوں کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

خلاصہ

حقیقت انسانیہ اور اس کے عروج الی اللہ سے متعلق جو باتیں گذشتہ صفحات میں بیان کی گئی ہیں وہ قرآن پاک، سنتِ نبویہؐ اور اجماع صوفیۂ کرام و اولیاء عظام سے ثابت ہیں۔ اسلامی تصوف میں "حقیقتِ انسانیہ" روحِ اعظم ہے۔ اور مرتبۂ انسان، ظہور ذاتِ الٰہیہ کا آخری مرتبہ (مرتبۂ جامعیت) اس کی پچھلی تجلی اور آخری لباس ہے۔ اس میں تمام کمالات بالقوہ موجود ہیں جنہیں عملی جامہ پہنانا ضروری ہے۔ اسی لئے اس میں عرفانِ نفس کو عرفانِ خدا کی بنیاد قرار

Marfat.com

دیا گیا ہے۔

ان حقائق کے پیشِ نظر اسلامی تصوف پر "نفیِ خودی" کا الزام قطعی غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس غلط بینی کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن دونوں کو ایک سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسلام نے ان دونوں کی نوعیت جدا جدا قرار دی ہے۔ دونوں کے لئے جدا جدا احکام، فرائض، حقوق اور نصب العین مقرر کئے ہیں۔ ظاہر کے لئے احکام شریعت اور باطن کے لئے احکام طریقت ہیں۔ ظاہر کے لئے خلافت فی الارض اور باطن کے لئے "رب کی ملاقات" مقرر کی ہے۔ ایک کا تعلق امر نبوت[1] سے دوسرے کا امر ولایت[2] سے ہے۔

پہلے یہ مذکور ہو چکا ہے کہ اسلام میں ظاہر سے باطن کی طرف آنے کا نام ارتقائے روحانی ہے۔ یہی حکمتِ دین ہے اور یہی مقصد حیات ہے۔

چنانچہ اسلامی تصوف یا سلوک و طریقت بطور خاص صرف تزکیہ نفس اور رجوع الی اللہ کے اصولوں اور طریقوں سے بحث کرتا ہے۔ اور شریعت اسلامی پر عمل درآمد کو بھی لازمی قرار دیتا ہے شریعت کا کام ہمارے ظاہری اعمال و افعال کی درستی ہے۔ عوام صرف ظاہری صورتِ اعمال پر نظر رکھتے ہیں۔ اور صوفیائے کرام ظاہری اعمال جوارح کے ساتھ ساتھ عبادات میں حضور قلب کو اور دوسرے اعمال میں صفائے باطن کو بنیاد قرار دیتے ہیں۔ تمام اولیاء کرام اور صوفیائے عظام کی تحریریں، تقریریں اور ان کی زندگیاں انہی حقائق کی تصدیق کرتی ہیں۔

علامہ اقبال نے بھی اپنے فلسفۂ حیات کو دو حصوں میں یعنے خودی اور قلندری کے تحت بیان کیا ہے۔ اور اس کے تمام اہم خصائص اسلامی شریعت و طریقت ہی

---

[1] ہر نبی لازماً پہلے ولی ہوتا ہے پھر نبی ۱۲

[2] ہر ولی نبی نہیں ہوتا ۱۲

Marfat.com

سے ماخوذ ہیں۔ انداز بیاں البتہ کہیں شاعرانہ اور کہیں فلسفیانہ ہے۔ اس سے ثابت ہے کہ علامہ اسلامی تصوف کے خلاف نہ تھے۔ بلکہ شنکر اچاریہ، فلاطونی تصوف اور غلط کار نام نہاد صوفیوں کے خلاف تھے۔ اسلامی تصوف پر معترضین کے اعتراضات ذہنی انتشار فکری الجھاؤ اور لاعلمی کا نتیجہ ہیں۔ مسلمان اصلاحِ قلب سے جتنا دور ہوتا جائے گا اتنا ہی ہمارا معاشرہ برائیوں کا شکار ہو گا اور دنیا میں امن و مساوات کے بجائے ظلم و زیادتی کا دور دورہ رہے گا۔

شارحین اقبال کا فرض ہے کہ وہ فکر اقبال کی صحیح ترجمانی کریں اور قوم کو ملوکیت کی طرف لے جانے کے بجائے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف بلائیں کیونکہ علامہ اقبال کا حقیقی مشن یہی تھا۔

اولیاء اللہ کے مشرب کو جھٹلانا کوئی کمال نہیں۔ البتہ ان کے مشرب کو سمجھنا اور اسے اختیار کرنا کمال ہے۔ کیونکہ ان نفوسِ قدسیّہ کی تعریف خود اللہ پاک ان الفاظ میں کرتا ہے۔

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ط

(۱۰ - ۶۲)

علامہ اقبال نے تو اللہ تعالیٰ سے دُعا کی تھی۔ کہ میں خرد کی گتھیاں سلجھا چکا اب مجھے اپنی محبت میں دیوانہ بنا دے۔ اور "شریک زمرۂ لایحزنون کر" لیکن افسوس ہے کہ علامہ پر مضامین لکھنے والے زیادہ تر فلسفیانہ موشگافیوں میں الجھ جاتے ہیں۔ اور سیدھے سادے الفاظ میں اولیاء اللہ کے مشرب و مسلک کو قرآن و سنت کے حوالوں کے ساتھ خود اولیاء اللہ کی تعلیمات و زندگی کی روشنی میں پیش نہیں کرتے اقبالیات سے متعلق تمام اداروں کا فرض ہے۔ کہ وہ لکھنے والوں کو اس کی طرف متوجہ کریں۔ ورنہ فکرِ اقبال کی اشاعت کا حق کما حقہٗ ادا نہیں ہو سکتا۔ نہ معاشرہ، ملک اور ملت کی بہتری کا سامان ہو سکتا ہے۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ۔

(۴)

وُجود و موجُودات

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۴-۳۵)

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (۵۷-۳)

در کون و مکاں نیست عیاں جز یک نور
ظاہر شدہ آں نور بانواعِ ظہور
حق نور و تنوّع ظہورش عالم
توحید ہمیں است دگر وہم و غرور

جامیؒ

Marfat.com

وجود و موجودات

وجود حقیقی ایک ہے یا ایک سے زیادہ۔ موجودات عالم کی کیا حقیقت ہے۔ ان کی تخلیق کس طرح اور کیوں ہوئی۔ خالق کے ساتھ عالم کے تعلق کی کیا نوعیت ہے وغیرہ وغیرہ یہ سوالات نہایت اہم ہیں اور حیاتِ انسانی سے ان کا گہرا تعلق ہے۔ اتنا گہرا کہ ہر زمانے میں ہر قوم کے علماء و حکماء نے ان مسائل پر غور کیا ہے۔ اور اپنی فکر کے نتائج دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں۔

اسلام کی بنیاد وحی و نبوت پر قائم ہے۔ لہذا مابعد الطبیعیاتی مسائل میں انسانی تخمین و ظن کو اہمیت نہیں دی جاتی۔

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا ط (۱۰-۳۶)

اس لئے مذکورۂ بالا سوالات کے جواب کے لئے ہم قرآن و سنت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور چونکہ قرآن و سنت کے صحیح شارح اتباع رسول کے زندہ نمونے مقربین بارگاہِ ایزدی اولیاء اسلام ہیں جنہیں خود ذاتِ الٰہی اپنا مقرب بناتی اور عام انسان کے مقابلہ میں اپنے فضلِ خاص سے کشف و بصیرت کی روحانی قوت عطا فرماتی ہے۔ جس کی مدد سے وہ حقیقت اشیاء سے واقف ہو جاتے ہیں۔ لہذا ان کے ارشادات حق اور منشائے ایزدی کے مطابق ہوتے ہیں۔ اسی لئے سالکانِ طریقت انہیں واجب التعمیل سمجھتے ہیں۔

اسلام میں وجود و موجودات کی بحث توحید کے تحت آتی ہے۔ توحید ہی اسلام کی بنیاد اور امتیازی صفت ہے۔ اسی لئے کلمۂ توحید لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اس کا بنیادی کلمہ ہے۔ اس کی شرح میں پورا اسلام یعنے شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت سب کچھ آجاتا ہے۔ لہذا اس کی شرح میں جس توحید کی وضاحت کی جائے۔

Marfat.com

اسے دیگر مذاہب اور مکاتیب فکر کی توحید سے مختلف اور ممتاز ہونا چاہیئے۔ ورنہ اسلام کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

ان امور کے پیش نظر توحید اور کلمۂ توحید کی شرح کے لئے ہم قرآن وسنت اور اولیاء اللہ کے ارشادات کے سوا کسی دوسرے لٹریچر یا شخصیت کی جانب رجوع نہیں کر سکتے۔

یہ سوچنا یا کہنا کہ مسلمانوں نے کسی زمانے میں بھی توحید کی حقیقت غیر مسلم علماء یا حکماء سے سیکھی۔ خود اسلام، پیغمبر اسلامؐ، علمائے اسلام اور اولیاء کرامؒ کی زبردست توہین ہے۔

توحید، شرک کی ضد ہے۔ جہاں توحید ہے وہاں شرک نہیں۔ جہاں شرک (ذاتی یا صفاتی) ہے وہاں توحید نہیں۔ اور اسلام میں شرک ہی وہ گناہ کبیرہ ہے جسے اللہ پاک ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ اسی لئے عرفاء اسلام نے شرک و توحید کو سمجھنے سمجھانے میں پوری توجہ اور قوت صرف کی ہے۔ انہوں نے توحید[1] کی چار قسمیں قرار دی ہیں۔ توحید[1] شریعت، توحید[2] طریقت، توحید[3] حقیقت، توحید[4] معرفت، ان کی تعلیم بقدر ہمت و حوصلہ طالب کو دی جاتی ہے۔ عام مسلمانوں کے لئے توحید شریعت کافی ہے۔ تاریخی شواہد کے بموجب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشینوں نے توحید کی تعلیم طالب کو حوصلہ اور استعداد کے مطابق دی۔ اس لحاظ سے صحابہؓ کے درجات میں تفاوت رہا۔ جس کی تصدیق خود احادیث نبویؐ اور اقوال صحابہ کرامؓ سے ہوتی ہے۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ تمام تعلیمات کا مرکزی نقطہ "توحید" تھا۔ ثنویت، تثلیث یا کثرت نہیں۔

اسی توحید یا توحید ذاتی کے لئے بعد میں "وحدت الوجود" کی اصطلاح وضع

---

[1] ساتھ ساتھ شرک کی بھی۔ لیکن اس کا بیان فی الحال یہاں نہیں کیا جاتا۔

Marfat.com

ہوئی۔ اور اس کے تحت شیخ اکبر ابن عربیؒ[1] نے اس سے تفصیلی احکام فلسفیانہ انداز میں مرتب و مدون کئے۔[2] جس طرح علم حدیث، علم اسماء الرجال اور فقہ وغیرہ کی اصل زمانۂ نبوت میں تو موجود تھی۔ لیکن ان کی تدوین آہستہ آہستہ بعد میں ہوئی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ چونکہ اصطلاح "وحدت الوجود" زمانۂ نبوت میں موجود نہ تھی۔ لہذا اس کے تحت جو مفہوم بیان کیا جاتا ہے۔ وہ اسلام میں کہیں باہر سے آیا ہے۔ اگر زمانۂ نبوت میں "شرک فی الذات" کا مسئلہ موجود تھا تو "توحید فی الذات" یا "توحید ذاتی" کا مفہوم بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا۔ اور اسی کو رفتہ رفتہ "وحدت الوجود" کی اصطلاح سے واضح کیا گیا اس کے تحت جو کچھ بیان کیا جاتا ہے۔ وہ در اصل توحید ذاتِ باری تعالےٰ کی وضاحت ہے۔ چنانچہ مشہور واقعہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لبید کا یہ قول سنا کہ "اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے"۔ تو حضور نے ارشاد فرمایا کہ سب سے سچی بات جو شاعر نے کہی۔ وہ لبید کا یہ قول ہے۔ کہ اللہ کے سوا ہر شے باطل ہے۔[3]

لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ   دیکھئے صفحہ ۶۵

قرآن پاک کی متعدد آیات صراحت کے ساتھ اسی حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں جیسا کہ صفحات آئندہ میں مذکور ہے۔

مسئلہ "وحدت الوجود" کا مرکزی خیال یہ ہے کہ وجود حقیقی صرف ایک ہے اور

---

[1] المتوفی ۱۲۵۰ء۔

[2] ان سے پہلے حضرت جنید بغدادیؒ متوفی ۹۱۹ء۔ حضرت سنائیؒ متوفی ۱۱۳۱ء۔ حضرت عطارؒ ۱۲۲۹ء۔ وغیرہم بھی اپنی کتابوں میں یہ مسائل بیان کر چکے تھے۔ لیکن صحیح معنے میں ان کی فلسفیانہ تدوین حضرت ابن عربیؒ ہی نے کی۔

[3] اس حدیث شریف کو امام بخاریؒ۔ امام مسلمؒ۔ ترمذیؒ اور ابن ماجہؒ سب ہی نے روایت کیا ہے۔

Marfat.com

وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہے۔ موجوداتِ عالم کی صورت میں وہ خود جلوہ گر ہے اسی طرح موجودات عالم بلحاظ حقیقت عین حق ہے اور بلحاظ تعین غیر حق ہیں۔ اور یہ غیریت اعتباری[1] ہے۔

اسی حقیقت کو صوفیائے وجودی نے "تنزلات" کے تحت بالوضاحت بیان کیا ہے۔ اور ہر تفصیل کی سند قرآن و سنت اور اقوال اولیاء اللہ سے پیش کی ہے۔

اس مختصر مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ "تنزلاتِ ستہ" کو قرآن و حدیث کی روشنی میں بالتفصیل بیان کیا جائے۔ علاوہ ازیں میرے دوسرے مضامین میں جو کتاب ہذا میں شامل ہیں اس کے بعض ضروری پہلو بیان کر دئے گئے ہیں۔ لہذا یہاں بخوف طوالت انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ صوفیائے کرام نے "تنزلات ستہ" کے بنیادی نکات کا خلاصہ تنزیہہ و تشبیہہ کے تحت بھی بیان کیا ہے۔ چنانچہ آئندہ چند سطور میں "وجود حقیقی" کی وحدت اور اس کی صفتِ تنزیہہ و تشبیہہ کو نہایت اختصار کے ساتھ نصوص قرآنی اور احادیث نبویؐ کی روشنی میں بیان کیا جاتا ہے۔

واضح ہو کہ نصوصِ قرآنی :۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ (۵۷+۳) اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۴-۳۵) وغیرہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وجود حقیقی صرف اللہ کا ہے۔ اور دیگر اشیاء کا وجود بالعرض ہے۔ وہی ایک ذات واجب الوجود ہے۔ جو صفتِ تشبیہی کے ساتھ متصف ہے۔ پس وہی وجود واحد باعتبارات و حیثیات تنزل بالوان صورِ مختلفہ متجلّی و متشکل ہے۔ حسبِ نصِ قرآنی كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ ط چنانچہ ذاتِ بحت، ممکنات کے تعینات و اضافات میں بھی

---

[1] تفصیل کے لئے شرح تحفہ مرسلہ۔ اور دیگر کتب تصوف بھی دیکھیے ۱۲

Marfat.com

نیز بذاتہ دونوں حال میں قائم ہے۔ فنائے تعینات و اعتبارات سے فنائے ممکن ہوتی ہے۔ نہ کہ فنائے واجب۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ط

صفت تنزیہہ:۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ — اس جیسی کوئی شئی نہیں۔

اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ — اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اسکی کوئی اولاد ہے نہ ماں باپ

تَعَالَى اللّٰهُ عَمَّا يَصِفُوْنَ — خدا اس سے بہت بلند ہے جن صفات سے کہ یہ بیان کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

آیات سے اس کی تنزیہہ ثابت ہوتی ہے۔

صفت تشبیہہ:۔

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ — پس جدھر بھی تم رُخ کروگے ادھر ہی ذات یا وجہ اللہ ہے۔

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ط (۵۰-۱۶) — ہم بندے سے اس کی شاہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ — اور وہ تمہارے ساتھ ہی جہاں کہیں تم ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ط — (اے رسول) جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھوں پر۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ — وہی اول ہے وہی آخر ہے وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے۔

وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ — اور وہ تمہارے نفوس میں ہے۔ کیا تم نہیں دیکھ

وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ — اور اللہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ — اور وہی سنتا اور دیکھتا ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى — اور اے رسول! وہ کنکریاں تم نے نہیں پھینکیں مگر اللہ نے پھینکیں۔ وغیرہ وغیرہ

یہ تمام آیات اس کے مرتبۂ تشبیہہ کو ثابت کرتی ہیں۔

اس سلسلے کی احادیث نبویؐ بھی بے شمار ہیں جن کے اعادہ کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ صرف ایک حدیث قدسی کافی ہے۔

كُنْتُ كَنْزًا مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ

(تھا میں ایک خزانہ مخفی پس چاہا میں نے کہ پہچانا جاؤں۔ پس پیدا کیا میں نے خلق کو۔)

آیات و احادیث کے علاوہ صحابہ کرامؓ، آئمہ عظامؒ، اولیاء اللہؒ اور اکابر علماء طریقتؒ و صوفیائے کرامؒ کے اقوال و ارشادات سے کتب تصوف بھری پڑی ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عرفان نفس عرفان حق ہے اور عالم حس و شہادت کی تمام اشیاء آیاتِ ربانی کُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ کی تفسیر اور انسان کے نظام حیات کا اہم جزو ہیں۔

وہ اشخاص جو تنزیہہ محض یا تشبیہہ محض کے قائل ہیں حق کو ایک یا دوسری صورت میں محدود کر دیتے ہیں۔ صرف اسلامی نظریۂ وحدت الوجود ان دونوں مراتب وجود (تنزیہہ و تشبیہہ) کا جامع ہے۔ "نفی خودی" یا "ترک عمل" اور اس قسم کے دیگر اعتراضات جو دوسرے نظریوں پر عاید ہو سکتے ہیں۔ اس پر عائد نہیں ہوتے۔ یہی وہ نظریہ ہے جس میں عالم کو مایا دھوکا یا نظر نہیں سمجھا جاتا۔ اور یہی نظریہ اتحاد و حلول جیسے باطل عقائد کی تردید کرتا ہے۔

Marfat.com

اب چند باتیں بطور معقولات بھی بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ تاکہ ثابت ہو جائے کہ اسلامی نظریۂ وحدت الوجود کی تائید قرآن و سنت کے علاوہ معقولات سے بھی ہوتی ہے۔

اسلامی نظریۂ وحدۃ الوجود
عقل کی روشنی میں

وجود کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

(۱) واجب بالذات (۲) ممتنع بالذات (۳) ممکن بالذات۔

(۱) **واجب بالذّات**:۔ وجود جو اپنے موجود یا ہست ہونے میں کسی دوسری ذات کا محتاج نہیں ہے بلکہ اپنی ذات سے آپ موجود ہے۔ یہ وجود ضروری ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ ایسا وجود صرف واجب تعالےٰ کا ہے۔ اور اس کو موجود مطلق کہتے ہیں۔

(۲) **ممتنع بالذات**:۔ عدم محض ہے۔ اس کا وجود محال ہے۔ دراصل اس پر لفظ "ہے" کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔[1]

(۳) **مُمکن بالذات**:۔ ایسا وجود جو بذاتہٖ معدوم اور بالعرض موجود ہو۔ جو اپنے وجود کے لئے بہتر و برتر ہستی کا محتاج ہو۔

---

[1] صوفیہ وجودیہ کے نزدیک "وجود" کے دو معنے ہیں (۱) ایک مصدری یعنے "ہونا"۔ دوم وہ چیز جسے "ہے" کہہ سکیں۔ یہ معنے مصدری کا منشاء ہے اور اس پر "ہے" کا اطلاق ہوتا ہے۔ خواہ وہ خارج میں موجود ہو یا پوشیدہ ہو۔ یا دونوں کا مجموعہ۔ اس کو موجود بمعنے مابہ الموجودیت کہتے ہیں اور یہی وجود حقیقی ہوتا ہے۔

Marfat.com

وجودی صوفیہ کے عقیدے کے بموجب دنیا کی ہر چیز وجود واجب تعالےٰ کے سبب موجود ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ واجب بالذات نہ ممکن بالذات بن سکتا ہے نہ ممتنع بالذات۔ اسی طرح ممکن نہ واجب ہو سکتا ہے نہ ممتنع۔ ممکن وجوب ذاتی اور استغناء ذاتی سے ہمیشہ محروم رہے گا۔ وجود ممکنات دو عدم کے درمیان ہے۔ یعنے نہ وہ پہلے تھا۔ نہ ہمیشہ رہے گا۔ ہمارا وجود اگر حقیقی[۵۱] ذاتی ہوتا تو ہمیشہ ہم کو لازم رہتا۔ کیونکہ ذات سے لزوم ذات علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا ہمارا یہ ظاہری وجود ممکن ہے۔ اور دو عدم کے درمیان ہے۔ نہ پہلے تھا۔ نہ کچھ دن بعد رہے گا۔ (بلکہ لحظہ بہ لحظہ بدلتا رہتا ہے۔ اور نیا تعین اس کی جگہ لے لیتا ہے) لیکن مجھ میں جسم کے علاوہ "روح قدسی"[۵۲]۔ روح حیوانی۔ شعور، علم اور ارادہ بھی ہے اس لحاظ سے میں غیر مادی ہوں۔ میرے جسم کی تحلیل اور اس کے تغیر کا سلسلہ دن رات جاری رہتا ہے۔ اور آخری دم تک بلکہ اس کے بعد بھی جاری رہے گا۔ لیکن ابھی تک لا انتہاہی تغیرات کے باوجود "میں" "میں" ہی رہا۔ اور جسم عنصری سے روح[۵۳] کی پرواز کے بعد بھی "عالم مثال" میں رہوں[۵۴] گا۔ صرف مادیت باقی نہ ہو گی۔ اس لحاظ سے وہ شئی جس پر "میں" یا "انا" کا اطلاق ہوتا ہے۔ دراصل نہ صرف مادہ یا جسم بلکہ روح حیوانی[۵۵] سے بھی ماوراء ہے۔

---

۵۱ مراد تعین یا تجسم۔ ۵۲ اس حقیقت کا انکشاف انسانی غور و فکر کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی الٰہی اور حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے ہوا۔

۵۳ مراد روح حیوانی ہے۔

۵۴ یہ حقیقت بھی اسی طرح معلوم ہوئی جیسا کہ روح قدسی[۵۲] کے تحت درج ہے۔

۵۵ روح حیوانی۔ روح اعظم یا روح اقدس سے مختلف ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو میرا مضمون بعنوان "حقیقت انسانیہ" ۱۲

Marfat.com

اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن (اقبال)

مادّہ کی حقیقت

جدید سائنس نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ مادّے کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے اس کا وجود مادّہ پرستوں کے ذہن میں رہتا ہے۔ لیکن واقع میں اس کے وجود کا ثبوت نہیں۔ نہ وہ ہمارے احساسات کی علت ہے۔ نہ صفات کا محل ..... وہ کہتے ہیں کہ مادّہ صرف ہمارے احساسات کا گورکھ دھندا ہے۔ احساسات ہمارے حواس کے محتاج ہیں۔ اور ہمارے حواس خدا کی مرضی کا نتیجہ ہیں۔ مادہ کی صفات بو۔ آواز۔ ذائقہ رنگ۔ مقدار۔ شکل۔ روشنی۔ تاریکی۔ سختی۔ نرمی۔ وغیرہ سمجھی جاتی ہیں جن کا تعلق قوتِ شامہ۔ قوت سامعہ۔ قوت باصرہ۔ قوتِ لامسہ اور قوتِ ذائقہ سے ہے کسی مادّہ کو ان صفات سے باہر محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ صفات بھی اسی وقت محسوس ہو سکتی ہیں جب ہمارے حواس بجا ہوں۔ اور حواس کی تخلیق اور ان کا بجا رہنا اللہ تعالےٰ کی مرضی پر منحصر ہے۔

ان صفات کے لئے کسی موصوف کا ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ یہ صفات جب صرف ہمارے احساسات ہیں تو محلِ صفات وجود ذہنی ہو سکتا ہے۔ خارجی نہیں اس توضیح کے بموجب بھی عالم حس وشہادت اللہ تعالےٰ کی مرضی کا ظہور ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کی مرضی حق ہے۔)

حقیقتِ موجودات

اس سلسلہ میں مولانا عبدالقدیر صاحب صدیقی حیدر آبادی مترجم "فصوص الحکم"

Marfat.com

نے فص نوحیہ کی تمہید میں جو وضاحت فرمائی ہے وہ اس الجھے ہوئے مسئلہ کو اتنی اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ میں اسے من وعن یہاں نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ فرماتے ہیں :۔

"وجود حقیقی کے دو تعین ہیں۔ایک تعین وتشخص ذاتی جو الآن کما کان ہے دوم تعین وتشخص باعتبار اسماء وصفات کے اس لحاظ سے اس کے کئی مراتب ہیں۔ مرتبۂ داخلی۔ مرتبۂ خارجی۔ مرتبۂ داخلی کن فیکون سے پہلے ہے۔ لہذا یہاں "مخلوقات" کو دخل نہیں۔اور نہ یہاں متعدد ذوات موجود فی الخارج ہیں۔

مرتبۂ خارجی کُن کے بعد ہے۔یہ مرتبۂ مخلوقات، موجودات بالعرض حوادث کا ہے۔

واضح ہو کہ ترکیب واجتماع صفاتِ الٰہیہ سے نسبتیں پیدا ہوتی ہیں۔ان نسبتوں کو دو اعتبار لاحق ہوتے ہیں۔ (۱) نسبت وترکیب سے ایک حقیقت وماہیت وطبعیت کا محض معلوم ہونا حقیقت ممکنہ اور عین ثابتہ کہلاتا ہے۔

(۲) خود یہ نسبت وترکیب جس پر حقیقتِ ممکنہ کا قیام ہے حقیقت الٰہیہ اور اسم الٰہی کہلاتی ہے۔جب اس حقیقت اور عین ممکنہ کے مطابق حقیقت الٰہیہ یا اسم خاص کا ظہور ہوتا ہے۔تو یہ اعتباری یا بالعرض شئے عین خارج کہلاتی ہے۔اور اس پر آثار واحکام مرتب ہوتے ہیں۔مثلاً پانی ایک حقیقت اعتباری اور موجود بالعرض شئے ہے۔پانی کا قیام ہائیڈروجن اور آکسیجن کی نسبت خاصہ پر ہے۔یعنے دو حصے ہائیڈروجن آکسیجن کے ایک حصہ کے ساتھ ترکیب کھاتی ہے۔کیمیا دان ہائیڈروجن اور آکسیجن کی مختلف نسبتوں سے پیدا ہونے والے مختلف حقائق کو جانتا ہے۔مثلاً پانی۔ ہائیڈروجن پیرا کسائڈ وغیرہ۔ یہ عین ثابتہ مخلوقات وحقائق ممکنہ کی مثال ہے۔

Marfat.com

اور یہ نسبتیں جن پر حقائق ممکنہ کا قیام ہے۔ حقیقت الٰہیہ یا اسم خاص یا تجلی خاص کی مثال ہے۔ جب کیمیا دان پانی کی حقیقت کے مطابق دو حصے ہائیڈروجن اور ایک حصہ آکسیجن کو ملا دے تو پانی جو خیالی اور علمی چیز تھی حقیقی اور واقعی شے ہو جائے گی۔ اور اس وقت اس کو خارجی پانی کہیں گے اور اس وقت پیاس بجھانے۔ درختوں کو سرسبز رکھنے کی صفت اس کی طرف رجوع ہو جائے گی۔

دیکھو! کیمیا دان کے علم میں پانی کی حقیقت ہے۔ پانی میں ہائیڈروجن اور آکسیجن کی حجمی نسبت ۲ : ۱ کی ہے۔ خارج میں آکسیجن اور ہائیڈروجن ہیں۔ جن سے پانی بھی خارجی شے معلوم ہوتی ہے۔ ان میں سے اسمائے الٰہیہ کی مثالی ہائیڈروجن اور آکسیجن ہیں۔ ان کی باہمی نسبت اسم خاص یا حقیقت الٰہیہ کی مثال ہے۔ پانی عین خارجی کی مثال ہے۔ دیکھو ظاہر میں پانی معلوم ہوتا ہے۔ جس کی نسبت خاصہ آکسیجن و ہائیڈروجن پر ہے۔ خود یہ نسبت ہائیڈروجن اور آکسیجن سے قائم ہے۔

کیا پانی حقیقی شے ہے۔ عامۃ الناس کہیں گے بے شک حقیقی شے ہے۔ ہم اس کو پیتے ہیں۔ ضرورتوں میں استعمال کرتے ہیں۔

کیمیا دان سے پوچھو۔ وہ کہتا ہے۔ کہ حقیقی شے صرف ہائیڈروجن اور آکسیجن ہیں۔ فلاسفر سے پوچھو۔ وہ کہتا ہے کہ مادّہ ہے۔ شہودی سے پوچھو۔ وہ کہتا ہے۔ اسماء الٰہیہ ہیں۔ وجودی سے پوچھو وہ کہتا ہے۔ صرف ذات حق ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن اور پانی میں کون معقول اور علمی شے ہے۔ اور کون محسوس و مشہود؟ ظاہر ہے کہ پانی ایک نمائشی اور انتزاعی شے ہے۔ اور ہائیڈروجن و آکسیجن حقیقی خارجی اشیاء ہیں۔ لہذا پانی

Marfat.com

معقول اور اس کے عناصر محسوس ہیں۔ اسی طرح مخلوقات معقول ہیں اور اسماءِ الٰہیہ محسوس۔ غور کرو تو اسماءِ الٰہیہ بھی انتزاعی اور معقول ہیں۔ اور حق محسوس و مشہود ہیں۔ مگر ہماری نظر پر غفلت کا پردہ پڑ گیا ہے کہ معقول کو محسوس اور محسوس کو غیر مشہود سمجھتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ[1]

علّامہ اقبال کا
اختلاف و اتفاق

کہا جاتا ہے۔ کہ عقیدۂ وحدت الوجود اسلام میں نوفلاطونی، ویدانتی اور بدھ مت کے فلسفوں سے لیا گیا ہے۔ اس کا بھی سراغ لگالیا جائے۔ تاکہ ثابت ہو سکے کہ یہ الزام سراسر غلط اور گمراہ کن ہے۔

وجودی صوفیہ کے نظریۂ "وحدت الوجود" میں اور نوفلاطونی یا ویدانتی نظریوں میں وہی فرق ہے جو اسلام اور غیر مسلم اقوام کے مذاہب میں ہے۔ محض بعض اصطلاحات یا الفاظ کی مشابہت سے یہ سمجھ لینا کہ مسلم علماء طریقت اور غیر مسلم علماء و حکماء کے عقائد کی تفصیلات و جزئیات میں بھی بالکل یکسانیت ہو گی قطعاً غلط ہے۔ ایسی رائے قائم کرنے سے پہلے ان کی کتابوں اور عقیدوں کا بغور مطالعہ ضروری ہے۔

علامہ اقبال بھی پہلے "وحدت الوجود" کے خلاف تھے۔ بالخصوص دیباچۂ "اسرارِ خودی" میں ۱۹۱۵ء اور پھر اس کے بعد ۱۹۱۷ء تک ان کی تحریریں اس نظریہ

---

[1] ماخوذ از ترجمہ فصوص الحکم۔ فص نوحیہ۔ تمہید۔ ۱۲

کے خلاف ملتی ہیں۔ لیکن اس کے بعد ۱۹۲۲ء سے اس کی موافقت شروع ہوئی۔ جس کی مثالیں "پیام مشرق" "زبور عجم" "خطبات" "جاوید نامہ" "ضرب کلیم" "ارمغان حجاز" سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی
کہ او پیداست تو زیر نقابی
تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی
تلاشِ خود کنی جز او نیابی

پیام مشرق ۱۹۲۲ء

اپنے مشہور مقالہ "فلسفۂ عجم" کی بابت ایک خط میں لکھتے ہیں :۔
"یہ کتاب آج سے ۱۸ سال قبل لکھی گئی تھی۔ اس وقت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے۔ اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آ چکا ہے۔ . . . . . میرے خیال میں اب اس کتاب کا تھوڑا سا حصہ باقی ہے۔ جو تنقید کی زد سے بچ سکے۔ ۱۹۲۷ء [1]

یا ان کے بعض اشعار یہ ہیں :۔

مٹا دیا میرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰہ اِلَّا ھُو
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زُناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ (ضرب کلیم ۱۹۳۶ء)

---

[1] دیکھو دیباچۂ "فلسفۂ عجم" از میر حسن الدین بی اے۔ ایل ایل بی عثمانیہ ۱۲

ایں جہاں چیست صنم خانۂ پندارِ من ست
جلوۂ او گرو دیدۂ بیدارِ من ست
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من
چہ زمان و چہ مکاں شوخیٔ افکارِ من ست

(زبورِ عجم ۱۹۲۷ء)

علامہ کا اس طرح اپنی فکر و نظر میں تبدیلیوں کا اعتراف کرنا اور حقیقت کا اظہار کرنا۔ جہاں ان کے اوصاف عدل و جرأت کو واضح کرتا ہے۔ وہیں شارحین فکر اقبال سے یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ وہ ان تبدیلیوں کا پتہ لگائیں جو وحدت الوجود کے متعلق علامہ کے خیالات "اسرارِ خودی" کی اشاعت کے بعد رونما ہوئیں۔ اور اگر یہ نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کے متعلق اظہار خیال کرتے وقت علامہ کے ان خیالات کو پیش نظر رکھیں جن کا اظہار انہوں نے ۱۹۲۲ء کے بعد کیا ہے اور جو اکابر صوفیہ کے بنیادی عقائد وحدۃ الوجود میں سرِ مُو فرق نہیں رکھتے (لیکن اس کے لئے پہلے عقائد صوفیہ کا سمجھنا ضروری ہے۔ ورنہ الفاظ و عبارات کا سرسری مطالعہ اکثر غلط نتیجہ پر پہنچا دیتا ہے۔)

بہر حال اکابر صوفیہ جن میں بڑے بڑے مجتہد، محدث، محقق، علماء اور اہل کشف و بصیرت گذرے ہیں یہی شہادت دیتے ہیں کہ خالص توحید اسلامی وحدت الوجود ہی ہے جو ہم تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سند متصل کے ساتھ پہنچتی ہے۔

حضرت ابن عربیؒ نے اس سے متعلق تفصیلی احکام و مسائل کو مدوّن کیا اور اسکی شرح مختلف فصوص کے تحت اپنی مشہور کتاب "فصوص الحکم" میں کی۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ ان سے قبل متعدد حضرات مثلاً حضرت عطارؒ اور حکیم سنائیؒ وغیرہ اپنی کتابوں میں یہ مسائل بیان کر چکے تھے۔ انہی مسائل کی تعلیم بطور اسرارِ دین خاص خاص صحابہ[1] کرامؓ کو بقدر استطاعت و ضرورت دی گئی تھی اور وہی بسند متصل ہم تک پہنچی ہے۔

---

[1] علم لدنی سے متعلق حضرت ابوہریرہ کی مشہور حدیث اور اس کی شرح از حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کے لئے تزئین العشاق (حصہ اوّل) شائع کردہ محفل زوقیہ۔ کراچی) صـ ۲۱ و صـ ۲۲ دیکھو

صوفیائے کرام نے کسی زمانے میں بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اور توحید و حقیقت و معرفت کی تعلیم خاص خاص افراد کو بقدر استطاعت و ضرورت ہی دی۔ کیونکہ توحید کی اعلیٰ تعلیم عوام کے لئے نہیں ہے۔ اس لئے کہ جب تک ان میں اس کے سمجھنے اور اس سے فائدہ حاصل کرنے کی اہلیت نہ پیدا ہو جائے۔ اس کی تعلیم بے کار ہے۔ علم معرفت تو بڑی چیز ہے۔ جب تک اہلیت نہ ہو کسی کو کوئی ظاہری علم بھی نہیں سکھایا جاتا۔ اسرار توحید کو "اسرار" کا درجہ اسی لئے دیا گیا ہے۔

کیا عقیدۂ توحید ذاتی

غیر اسلامی عقیدہ ہے

یہ کہنا کہ توحید ذاتی (ضد شرک فی الذات) کا مفہوم اسلام میں کہیں باہر سے آیا ہے۔ خود اسلام اور شارع اسلام پر ایک سنگین الزام ہے جس کا رفع کرنا ہر مسلم کا فرض ہے۔ خواہ اس کا تعلق کسی جماعت سے ہو۔ ہم کسی حال میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ علماء اسلام بالخصوص دور اول کے عرب علماء محققین نے جو قرآن پاک کی تفسیر بالرائے کو بھی کفر قرار دیتے ہیں کلمۂ توحید لا الٰہ الا اللّٰہ محمد الرسول اللّٰہ کے معنے تقریباً دو سو سال[1] بعد

---

[1] سب سے پہلے ارسطو کی تصانیف کا ترجمہ عربی میں خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں شروع ہوا (۸۱۳ء تا ۸۳۳ء) اور ارسطو وحدت الوجودی نہ تھا۔ دیکھو نقد اقبال حاشیہ ص ۵۲۔

Marfat.com

افلاطونیوں اور ویدانتیوں[۱] سے سیکھے یا انہوں نے تین چار سو سال بعد نو فلاطونیوں[۲] کے عقائد اختیار کر لئے اور خدانخواستہ قرآن و سنت نیز آئمہ اطہارؓ و صحابہ کرامؓ کے ارشاداتِ گرامی یا ان کے کردار و حالاتِ زندگی سے کوئی تمسک نہیں کیا۔ کیا اس قسم کے اعتراضات گھڑنے والے مسلمانوں کی نظر میں اسلام کا یہ دعویٰ کہ وہ دنیا کو صحیح توحید سکھانے آیا ہے۔ خدانخواستہ غلط ہے۔ اگر نہیں تو وہی بتائیں کہ مسلم علماء کو توحید کے معنے سمجھنے کے لئے مغرب کے فلسفیوں یا ہندوستان کے شنکر اچاریوں کی جانب رجوع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ باطنی نعمتوں[۳] کے حامل علماءِ طریقت تو مسلم علماءِ ظاہر کی ترجمانیوں کو بھی اپنے مسلک کے لئے قابل قبول نہیں سمجھتے۔ ایسی حالت میں وہ غیر مسلموں کے خیالات کو کب خاطر میں لا سکتے تھے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اہل اللہ نے ہمیشہ غلط عقائد کی اصلاح کی ہے۔ اور اللہ کے دین کو باطل نظریات فلسفہ سے محفوظ رکھا ہے۔ قرآن، سنت اور وجودی اکابر صوفیہ کی تحریروں کا بغور مطالعہ کرنے اور پھر نظریۂ وحدت الوجود کے ہر جزو کا تفصیلی موازنہ نو فلاطونیوں، ہندوؤں اور بدھ مت کے نظریوں سے کرنے کے بعد مذکورہ بالا نوعیت کے اعتراضات کی قلعی کھل جاتی ہے گذشتہ صفحات میں اسلامی توحید وجودی سے متعلق قرآن، احادیث کے حوالے اور عقلی دلائل مختصر طور پر پیش کئے جا چکے ہیں اب نوفلاطونی، ویدانتی اور بدھ مت کے باطل عقائد بیان کئے جاتے ہیں تاکہ نتیجہ اخذ کرنے میں آسانی ہو۔

۱؎ شنکر کا زمانہ ۷۸۸ء تا ۸۲۰ء مطابق ۱۷۲ھ تا ۲۰۵ھ ہے۔

۲؎ نوفلاطونیوں کا زمانہ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی ہے۔

۳؎ باطن اور باطنی نعمتیں قرآن و سنت سے ثابت ہیں اور ان کی شرح و تفصیل تمام کتب تفسیر و حدیث و تصوف میں موجود ہے۔

Marfat.com

نوفلاطونیوں کے غیر اسلامی عقائد[۱]

نوفلاطونیوں کا زمانہ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی ہے۔ ان کے فلسفے کی بنیاد افلاطون کے فلسفے پر ہے۔ لیکن انہوں نے رواقیین کے عقائد بھی اختیار کئے ہیں۔

حقیقتِ اعلیٰ (یہاں محض دو تین ایسے عقائد بیان کر دینا کافی ہوگا جو وجودی صوفیہ اسلام کے عقائد سے مختلف ہیں)۔ حقیقت اعلیٰ کی بابت نوفلاطونیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ جمال، صداقت، خیر، شعور اور ارادے سے بلند ہے۔ خدا نے دنیا کو تخلیق نہیں کیا۔ کیونکہ اس کے لئے شعور اور ارادے کی ضرورت ہے۔ جن سے وہ محدود ہو جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ (گویا وہ صفات حق کے قائل نہیں۔ لیکن اسلام اور اسلامی تصوف خدا کو جامع جمیع صفات خالق کائنات اور خیر محض تسلیم کرتے ہیں)

تنزّلات نوفلاطونیوں کے عقیدے میں تخلیق ایک تنزل ہے۔ مکمل سے نامکمل کی طرف۔ وجود میں ہم جس قدر نیچے کی طرف آتے جائیں گے۔ اتنا ہی نقص کثرت تغیر اور برائی میں پھنسیں گے ..... وغیرہ وغیرہ (گویا تخلیق ایک شر اور عالم تمام برائیوں کا مجسمہ ہے۔ اس کا مقابلہ اسلامی نظریۂ وحدت الوجود کے تنزلات سے کیجئے اس میں "تنزلات" مراتب ظہور حق کو کہتے ہیں۔ اس میں از روئے حقیقت "نیچے کی طرف آنے" کا مفہوم نہیں ہے۔ نہ مذکورہ مراتب ظہور بلحاظ زمانہ ہیں۔ اسمیں "مرتبۂ انسان" مرتبۂ جامعیت اور ظہور کی آخری تجلی یا لباس ہے۔ اس کا "انسان" "نائب حق" ہے۔ اور اس حیثیت سے کائنات کی تسخیر کرتا اور مقرب حق بن کر باقی باللہ بنتا ہے۔)

مادہ اور کائنات نوفلاطونیوں کے عقیدے میں مادّہ کو روح تخلیق کرتی ہے تاکہ اپنی قوت کو فعل میں لائے اور تشکیل کی خواہش کو پوری کرے

---

[۱] ماخوذ از نقد اقبال ۱۲

(ہمارے یہاں مادہ و روح حیات کے دو پہلو ہیں) اور مادے کو روح تخلیق نہیں کرتی۔ ہم امر اور خلق میں فرق کرتے ہیں وہ نہیں کرتے)

ان کے عقیدے میں مادہ شر اور شر کی اصل ہے۔ وہ خدا سے انتہائی دور ہو۔ اس میں خدا کا کوئی نشان نہیں وہ تاریکی ہے۔ وغیرہ وغیرہ (ہمارے یہاں مادہ نہ شر ہے نہ شر کی اصل۔ مادی عالم باطل یا وہم نہیں ہے۔ بلکہ آنکھ والوں کے لئے ذرہ ذرہ خدا کی نشانی اور مظہر ہے۔ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ۔ اس کے شاہد ہیں۔)

روحِ انسانی (۱) ان کے عقیدے میں روحِ انسانی، روح کائناتی کا ایک حصہ ہے اگر وہ جسمانی زندگی سے متعلق رہتی ہے تو موت کے بعد کسی دوسرے انسانی یا حیوانی یا نباتی جسم سے متعلق ہو جاتی ہے۔

[(۱) یہی تناسخ ہے جو اسلام میں جائز یا صحیح نہیں (۲) روح کا وہ حصہ جو مادی جسم میں ظہور کرتا ہے حقیقی خودی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک پرتو یا ظل ہے۔

[(۲) اسلامی وحدت الوجود کا نظریہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں روح اعظم اور روح حیوانی میں فرق کیا جاتا ہے۔ اصل انسان تو روح اعظم ہے جس کا اشارہ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي میں ہے۔ اور روح حیوانی جسے علامہ اقبال ایک جگہ "آب و نان کی بیٹی" اور شاہ ولی اللہ "نسمہ" کہتے ہیں بالکل دوسری چیز ہے۔ "نسمہ" یا "روح حیوانی" فانی ہے۔ اور زندگی میں روحِ اعظم کے مرکب کی حیثیت رکھتی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو۔ حجۃ اللہ البالغہ اور تحفۂ مرسلہ وغیرہ۔]

نو فلاطونیوں کے عقیدے میں نظریاتی زندگی عملی زندگی سے بلند تر ہے کیونکہ یہی خدا کے دیدار کے قریب لاتی ہے۔ (اسلامی تصوف میں) نظریاتی زندگی عملی زندگی سے بہتر نہیں ہے۔ اس میں عمل پر کامیابی و کامرانی کا انحصار ہے۔ اور دنیا کو دار العمل

Marfat.com

قرار دیا گیا ہے۔ اس قانون الٰہی پر عمل درآمد ضروری ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ بندے کو اپنی شانِ رحمت سے بے طلب جو چاہے بخش دے)۔

نو فلاطونیت میں نجات کامل فنا کا نام ہے۔ جسم کی فنا اور اس کے ساتھ یا اس سے پہلے جملہ صفاتِ انسانی کی فنا اور اس کے لئے تمام جسمانی بندھنوں سے اپنے آپ کو آزاد کرنا ضروری ہے۔۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ [لیکن اسلامی تصوف میں بالخصوص وحدت الوجودی تصوف میں فنا کا وہ مفہوم نہیں ہے جو اوپر بیان ہوا ہے۔ اس میں فنا ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم ہے اپنے فانی وجود کے متعلق غلط عقیدے اور وہم غیریت کی فنا۔ تاکہ حق ہی حق رہ جائے۔ اور فانی صفاتِ بشری زائل ہو کر ان کی جگہ صفاتِ الٰہیہ قائم ہو جائیں۔ جیسا کہ حدیث "قربِ فرائض" اور حدیث "قربِ نوافل" سے ثابت ہے۔

اس میں جسمانی بندھنوں سے اپنے آپ کو آزاد کرنے سنیاس یعنی رہبانیت اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ علاوہ بریں اسلامی تصوف میں مقام فنا آخری مرحلہ نہیں ہے۔ بلکہ جامۂ انسانیت میں رہ کر باقی باللہ بننا اصل مقصود ہے۔]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ افلاطونیوں یا نو فلاطونیوں کے مذکورہ بالا تمام عقائد باطل ہیں۔ اور اسلامی تصوف بالخصوص نظریۂ وحدت الوجود ان تمام عقائد باطلہ کی تصحیح کرتا ہے۔

چند ویدانتی عقائد جو غیر اسلامی ہیں

ان عقائد کے سب سے بڑے شارح شنکر اچاریہ سمجھے جاتے ہیں۔ جن کا زمانہ ۷۸۸ء تا ۸۲۰ء ہے۔ دراصل ان کا نظریہ "نفی خودی" ترکِ عمل اور تناسخ پر مشتمل ہے۔ جو اسلام میں صحیح نہیں سمجھے جاتے۔

اصل حقیقت | ویدانت میں اصل حقیقت "برہمہ" کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن ہندو

Marfat.com

کی مذہبی کتابوں میں برہمہ کے متعلق مختلف نظریات ملتے ہیں۔ شنکر اچاریہ بھی "برہمہ" ہی کو اصل حقیقت مانتے ہیں۔ ان کے عقیدے میں وہ سکون محض ہے۔ وہ تمام صورتوں میں جلوہ گر ہے۔ مگر صورتوں میں اس کا اطلاق ایک دھوکا ہے ـــــ وہ اس عالم کی آخری علت ہے۔ لیکن علت ہونے میں مایا (دھوکا) بھی اس کا شریک ہے ـــــ اپنشدوں میں ہمیں یہ اصول ملتا ہے۔ کہ ہر لحظہ بدلنے والے عالم کے تغیر کے تحت ایک نہ بدلنے والی حقیقت بھی ہے۔ جس پر اس تغیر کا اثر نہیں ہوتا۔

(اتفاق سے یہی خیال زمانے کے متعلق علامہ اقبال نے بھی اپنے ایک خطبہ میں ظاہر کیا ہے۔ (دیکھئے اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید) ممکن ہے انہوں نے یہ خیال یا استعارہ یہیں سے لیا ہو۔)

اسلام میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات ہر تغیر و تبدل احتیاج و زوال اور ہر قسم کے نقص ذاتی و صفاتی و فعلی سے پاک ہے۔ وہ مرتبۂ اطلاق سے مرتبۂ آخر ظہور تک یعنے غیب و شہادت دونوں حال میں کسی وقت اپنی صفات سے معرّیٰ نہیں اُسے نہ کسی وقت غنودگی آتی ہے نہ نیند۔ لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔ اس کی ذات کو سکون یا تغیر سے منسوب کرنا مناسب نہیں۔ صفات کے لئے "بالقوۃ" اور "بالعمل" کی تقسیم صرف ہمارے سمجھنے سمجھانے کے لئے ہے۔ لیکن چونکہ اس کی صفات کا تصور اس کی ذات سے الگ نہیں کیا جا سکتا اسے اَلْاٰنَ کَمَا کَانَ ہی سمجھا جانا ہے۔ یعنے وہ جیسا پہلے تھا۔ ویسا ہی اب بھی ہے۔ اسلامی نظریۂ وحدت الوجود میں بھی مرتبۂ اطلاق بلحاظ زمانہ نہیں ہے۔ نہ وہ ذات معرّیٰ عن الصفات متصور ہوتی ہے۔ مایا۔ فریب یا دھوکے کو اس کی ذات سے منسوب کرنا کفر ہے۔ فنا و تغیر تجسم و تعین کے لئے ہے اصل حقیقت کے لئے نہیں۔ اسلامی نظریۂ وحدت الوجود میں جو الفاظ و صفات واجب کے لئے ہیں۔ ان کا استعمال ممکن کے لئے ناجائز ہے۔

Marfat.com

اور اسی طرح اس کے برعکس ہے۔ نظریۂ وحدت الوجود کے بہت ممتاز شارح مولانا جامیؒ فرماتے ہیں :۔

اے بردہ گماں کہ صاحب تحقیقی ‏ ‏ ‏ وندر صفتِ صدق ویقین صدیقی
ہر مرتبہ از وجود حکمے دارد ‏ ‏ ‏ گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

(جامیؒ)

عالم

اپنشدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم ناپاک ہے۔ اور پاک "برہم" سے الگ ہے۔ شنکر اچاریہ کہتے ہیں۔ عالم مایا (دھوکا) ہے۔ نہ اسے نیست کہہ سکتے ہیں۔ نہ ہست۔ جب تک ہم میں جہالت ہے۔ اس وقت تک صورتِ عالم نظر آتی ہے وہ عرفان حقیقت پر غائب ہو جاتی ہے۔ قریب قریب یہی عقیدہ پارسیوں کا بھی ہے لیکن صوفیہ وجودیہ مظاہر عالم کو حقیقی سمجھتے ہیں۔ مایا یا دھوکا نہیں۔ ان کے یہاں مشاہدہ کی آخری منزل حق میں خلق کو اور خلق میں حق کو دیکھنا ہے۔ اس طرح کہ ایک کا مشاہدہ دوسرے کے مشاہدے میں مانع نہ ہو۔

شنکر کے عقیدے میں اصل حقیقت کے ساتھ غیر حقیقت کا شامل ہو جانا "مایا" ہے (اسلامی نظریۂ وحدت الوجود میں نہ حلول کی گنجائش ہے نہ اتحاد کی۔ کیونکہ دونوں صورتیں دو مستقل وجودوں کی مقتضی ہیں۔ اسی لئے وجودی حضرات لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ کے قائل ہیں)۔

ویدانت اور شنکر اچاریہ کے نقطۂ نظر سے صورت عالم خواب کی صورت ہے اشیاء غیر حقیقی ہیں۔ اور صورتیں اودیا (جہالت) سے بنی ہیں۔ اسی طرح "برہم" "مایا" اور اودیا تینوں مل کر عالم کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ یہ گویا ایک قسم کی تثلیث ہے۔ اسے وحدت الوجود سے کیا واسطہ۔ اسلامی وحدت الوجود میں عالم حق اور اس کی اشیاء آیات و شیون حق ہیں۔ خالق حقیقی اللہ کی ذات ہے۔ اس میں وہ کسی

Marfat.com

کا محتاج نہیں۔

شنکر کہتے ہیں کہ "برہمہ" انفرادی اشخاص میں ازلی جہالت سے ظاہر ہوتا ہے انفرادی اشخاص نے خود اپنی جہالت سے صورتِ عالم کو پیدا کیا ہے۔(اسلام یا اسلامی نظریۂ وحدت الوجود کو اس قسم کے عقائد سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

بُدھ مت کا نظریہ

اسی طرح بُدھ مت کی بناء سراسر نفی خودی اور دنیا سے پیچھا چھڑانے پر قائم ہے۔ اس مت میں خدا جیسی کوئی ہستی مستقل بالذات موجود نہیں ہے جو اس عالم کی خالق ہو۔ اس کے نزدیک جوہر موجود نہیں ہے۔ جو ظہور ہے وہ محض اعراض کا ہے۔ عالم محض تغیرات کا نام ہے۔ لہذا سب کچھ عدم ہے

بُدھ محققین کے نزدیک عالم محض دھوکا ہے۔ نہ خدا ہے نہ کوئی مستقل وجود۔ نہ مستقل شعور۔ سب کچھ خلا ہی خلا ہے۔ اور عدم ہی عدم۔ ان کے نزدیک خود ہمارا شعور ذات کسی خاص لمحہ کے جذبات و تصورات کی پیداوار ہے۔ نہ علت ہے نہ معلول۔ نہ نفس ہے نہ رُوح۔ عناصر اور ان کی نمائش یا ظہور خلافِ حقیقت اور جادوگر کے شعبدے کی طرح ہیں۔ جو نہیں ہیں۔ مگر نظر آتے ہیں۔

بدھ مت کے مطابق اس دنیا میں پیدا ہونا تمام مصیبتوں کی جڑ ہے۔ لہذا زندگی سے نفرت کرنا۔ اور اس کا ترک بہت اہم چیزیں ہیں۔ اس کا سلسلہ نفی محض یعنے نروان پر ختم ہوتا ہے۔ نروان عمل کی آخری فنائیت ہے۔ جب کہ تمام خواہشات فنا ہو جاتی ہیں۔ اسے موت بھی نہیں کہا جاتا۔ کیونکہ موت کے بعد تناسخ[1] ضروری ہے۔

---

[1] ماخوذ از فقد اقبال۔ میں نے ویدانتی اور بدھ مت کے عقائد بیان کرنے کے لئے قریب قریب حضرت میکش نیازی اکبر آبادی ہی کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ (باقی صـ۱۹۲ پر)

Marfat.com

ویدانتی نجات (مکتی) بھی نفی خودی یعنے ہستی سے پیچھا چھڑانے کے مترادف ہے اسی لئے تناسخ کا چکر ہے۔

اسلامی توحید کو ان عقائد سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام تو دنیا کے غلط عقائد کی اصلاح کے لئے آیا ہے۔ اور اس کے عقائد فطری اور عقل سلیم کے مطابق ہیں۔ لہذا موحدین اسلام کو کون سا امر مجبور کر سکتا ہے کہ وہ غیر اسلامی عقائد اختیار کریں۔

استغفر اللہ

بہرحال اسلامی نظریہ وحدت الوجود توحید کی اعلیٰ ترین صورت اور شرک فی الذات سے بچنے کی بہترین شاہراہ ہے۔ اس میں غیر اسلامی عقائد کی شمولیت کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس کی بنیاد قرآن واحادیث اور علمائے طریقت کے اجماع پر قائم ہے۔ اور اسے اختیار کرنے والوں میں ہزاروں لاکھوں علماء، فقراء، عرفاء اور اصحاب کشف دیقین شامل ہیں۔ عقل و فلسفہ بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ لہذا یہ غلط ہے۔ کہ اس میں کوئی عقیدہ نو فلاطونیت، ویدانت یا بدھ مت کے نظریات سے لیا گیا ہے جیسا کہ صفحات گذشتہ میں ہر ایک کے عقائد کا مختصر الفاظ میں موازنہ کر کے ثابت کر دیا گیا ہے۔

علامہ اقبال نے تو اعتراف کر لیا۔ کہ ان کے خیالات میں بہت سا انقلاب آچکا ہے۔ اور بقول پروفیسر یوسف سلیم چشتی "وہ آخر عمر میں پکے وحدت الوجودی ہو گئے تھے"[۱] لیکن افسوس ہے کہ علامہ پر مضامین لکھنے والے بعض حضرات اب تک پرانے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۹۱:- کیونکہ موصوف نے صحت ترجمہ کے خیال سے اہل ہنود کے تراجم پر اعتماد کیا ہے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھو "نقد اقبال" از علامہ موصوف۔

[۱] شرح اسرار خودی و ارمغان حجاز از پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔ اور سیرت اقبال از پروفیسر طاہر فاروقی۔

اعتراضات ہی دُہراتے اور دعویٰ بلا دلیل ہی پیش کرتے رہتے ہیں۔ مضمون نگاری کے جوش میں اکابر صوفیہؒ پر بہتان طرازی، اور وہ بھی اسلام کے بنیادی عقیدۂ توحید کے متعلق، اسلام کی جڑ کاٹنے کے مرادف ہے۔

فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِی الْاَبْصَار

Marfat.com

(۵)

فقرِ اسلام

Marfat.com

۷۸۶

اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ وَالْفَقْرُ مِنِّیْ ط

(حدیث شریف)

Marfat.com

فقرِ اسلامی

فقر کے لغوی و اصطلاحی معنے

حکمتِ دیں دلنوازیہائے فقر
قوتِ دیں بے نیازیہائے فقر

فقر کے لغوی معنے احتیاج اور تنگدستی کے ہیں۔ لیکن اصطلاح طریقت میں اس سے وہ منزل حیات مراد ہے۔ جس پر سرکار دوجہاں صلے اللہ علیہ وسلم نے اَلفَقرُ فَخرِی وَ اَلفَقرُ مِنِّی کی امتیازی مہر ثبت فرمائی ہے۔ اس منزل حیات پر پہنچ کر "فقیر" مال و دولت، جاہ و منصب، عزت و عظمت، خوشی و خوشحالی اور رنج و غم وغیرہ سب کو اللہ کی محبت میں ٹھکرا دیتا ہے۔ اور خدا سے کہتا ہے۔ کہ الٰہی! تو میرا ہو جا۔ اور مجھے کچھ نہیں چاہیئے" فقر صرف اللہ سے واسطہ رکھتا ہے اور اس کی محبت میں دونوں جہانوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

طَالِبِ دُنیَا مُؤَنَّثٌ طَالِبِ عُقبیٰ مُخَنَّثٌ وَطَالِبِ مَولیٰ مُذَکَّرٌ۔

اس کی ہمت تمام چیزوں سے بالاتر ہوتی ہے۔ اس کے قدموں میں سونے چاندی کے پہاڑ بھی ہوں تو وہ ان پر نظر التفات نہیں ڈالتا۔ اس کے سامنے دنیا کی دولت کے انبار ہوں تو بھی وہ انکی پرواہ نہیں کرتا۔ سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کر کے خدا کو اپنا بناتا ہے۔ وہ کسی سے سوال نہیں کرتا۔ نہ کسی کا احسان لیتا ہے۔ اس کی منزل مقصود خدا اور صرف خدا ہے۔ وہ اسی کے عشق میں زندہ رہتا ہے۔ اور اسی کے عشق میں جان دیتا ہے۔

مسلمانوں میں جب تک یہ فقر رہا۔ دونوں جہانوں کی نعمتیں ان کے قدموں میں

Marfat.com

ٹوٹتی رہیں۔ جب وہ زر، زمین اور زن کی ہوس میں گرفتار ہوئے ان سے دونوں جہانوں کی نعمتیں چھین لی گئیں۔

حضور کا ارشاد گرامی اَلْفَقْرُ مِنِّیْ (فقر مجھ سے ہے) کا مطلب یہ ہے کہ فقر کی تعریف وہ نہیں ہو سکتی جو آپ کے اسوۂ حسنہ سے ثابت نہ ہو۔ آپ کا اسوۂ حسنہ آپ کے ظاہری عمل، اوصاف و اخلاق، آپ کی عبادات، آپ کے ارشادات مبارکہ آپ کے روحانی فضائل و مراتب وغیرہ سب پر مشتمل ہے۔ لہذا مسلمانوں کے لئے وہی فقر مستند ہو سکتا ہے۔ جو آنحضرتؐ کے حالات و اسوۂ حسنہ سے ثابت ہوتا ہو۔

علامہ اقبال کی نظر میں فقر کی خصوصیات کا اندازہ حسب ذیل اشعار سے لگایا جا سکتا ہے:۔

فقر خواہی از تہیدستی منال
عافیت در حال و نے در جاہ و مال
صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد
نے زر و سیم و قماشِ سرخ و زرد

چیست فقر اے بندگانِ آب و گِل
یک نگاہ راہ بیں یک زندہ دل
فقر کار خویش را سنجیدن است
بر دو حرفِ لَا اِلٰہ پیچیدن است
فقر خیبر گیر با نانِ شعیر!
بستۂ فتراک او سلطان و میر!
فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست

ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰؐ است

فقر بر کروبیاں شبخوں زند
بر نوامیسِ جہاں شبخوں زند
بر مقامِ دیگر اندازد ترا
از زجاجِ الماس می سازد ترا
برگ و سازِ او ز قرآنِ عظیم
مردِ درویشے نہ گنجد در گلیم

با سلاطین درفتد مردِ فقیر
از شکوہِ بوریا لرزد سریر
از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر
وارہاند خلق را از جبر و قہر
می نگیرد جز بآں صحرا مقام
کاندرو شاہیں گریزد از حمام
قلبِ او را قوت از جذبِ سلوک
پیشِ سلطاں نعرۂ او لا ملوک

فقر کے متعلق بعض غلط فہمیاں

علامہ اقبال ایک جگہ فقر کے متعلق فرماتے ہیں :-

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

Marfat.com

قبضہ میں یہ تلوار[1] بھی آجائے تو مومن
یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرؓ کرار

ان اشعار سے یہ شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ "تاج و سریر و سپاہ" اور جنگ و جدال فقر کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ دو ایک نکتے ذہن میں رہیں۔

(۱) "فقر" انفرادی شے ہے۔ اجتماعی نہیں۔ لیکن جب استحکام ملت کے لئے اجتماعی طور پر "شوریٰ" "جہاد" اور اچھے نظم و نسق کے لئے فقیر کی خدمات ضروری ہوں تو وہ ان امور میں حصہ لیتا ہے۔ لیکن اس سے وہ فقرا ہمیشہ مستثنیٰ رہیں گے جو عشق الٰہی کے جذبہ سے مغلوب الحال ہوں۔ اور اس جذبہ کی تسکین صرف کثرتِ عبادت کے ذریعہ کر سکتے ہوں (جیسے اصحابِ صفہؓ)۔

(۲) فقر کا نصب العین فتوحات ملکی کے لئے جنگ و جدال نہیں ہے۔ البتہ اللہ کی راہ میں اور مدافعت کے لئے جو جنگ کی جائے اس میں فقیر کا حصہ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

(۳) اگر انتظام سلطنت کسی فقیر کے سپرد کیا جائے تو "تاج و سریر و سپاہ" خدمت خلق اللہ اور حفاظتِ دین کے ذرائع کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ فی نفسہٖ منزلِ مقصود نہیں بنتے۔ اس طرح مرد فقیر بوریا نشین رہ کر شاہی کرتا ہے۔ اور اس کے فقر کے طفیل سلطنت اسلامی ملوکیت نہیں بنتی۔ خلفائے راشدین کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

(۴) فقیر، اللہ کا محتاج ہوتا ہے، مال و دولت اور "تاج و سریر و سپاہ" کا نہیں۔ وہ ان چیزوں کو حاصل کر کے بھی صرف اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے۔

---

[1] فقر کی تلوار۔

Marfat.com

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے

اقبال

کافر ہے تو تلوار پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

اے ز آداب امانت[۵۱] بے خبر
از دو عالم خویش را بہتر شمر
از رموز زندگی آگاہ شو!
ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو!

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

یہ کافری تو نہیں کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتار حاضر و موجود

غرض یہ کہ فقر سلطنت کا محتاج نہیں ہے۔ خود سلطنت فقر کی محتاج ہے
تاکہ وہ ملوکیت اور شہنشاہیت میں تبدیل نہ ہونے پائے۔

---

۵۱ یہ نظریۂ حیات اولیائے کرام اور صوفیائے عظام کا ہے۔ جس کی تائید اقبال کر رہے ہیں۔ ۱۲

Marfat.com

اصل سرمایۂ شبیری

علامہ اقبال ایک جگہ فرماتے ہیں :-

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی سرمایۂ شبیری

پہلے دو اشعار سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں کے فقر کی دو قسمیں ہیں۔ اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں ایک ہی فقر ہے۔ جس کے اوصاف صفحات ماقبل میں مذکور ہوئے۔ اور آئندہ صفحات میں بھی بیان ہوں گے۔ ان اشعار میں علامہ نے اسلامی فقر کا مقابلہ عیسائیوں، ہندوؤں اور بدھ مت والوں کی رہبانیت سے کیا ہے۔ دوسرے شعر میں لفظ "قوموں" کا استعمال اس کا بین ثبوت ہے۔

تیسرا شعر صاف وضاحت کر رہا ہے کہ "شبیری" اور "فقر" مترادف ہیں اور وہی "میراث مسلمانی" ہے لوگ عموماً واقعۂ کربلا کے ظاہری اسباب و نتائج یعنے ایک فاسق و فاجر بادشاہ کی بیعت و اطاعت نہ کرنے یا باطل سے جنگ کرنے اور حق کی راہ میں اپنا ظاہری ساز و سامان اور عزیز و اقرباء کو قربان کر دینے ہی کو "سرمایۂ شبیری" سمجھتے ہیں لیکن باطنی حقائق بالخصوص ان کے منصب امامت و ولایت کو فراموش کر جاتے ہیں۔ یاد رہے۔ کہ جناب شبیر علیہ السلام مسلمانوں کے امام بھی تھے"۔ امامت نام ہے ہر کمال میں انبیاء

Marfat.com

کے ساتھ مشابہت تامہ ہونے کا۔ بعض کو ایک کمال میں مشابہت ہوتی ہے۔ بعض کو دو میں اور بعض کو جمیع کمالات میں۔۔۔۔۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ حقیقی اور حکمی۔۔۔۔ امامت حکمی تامہ خلافتِ راشدہ ہے"۔ ل

واضح رہے کہ امام اور خلیفۂ راشد کا ولی ہونا ضروری ہے۔ یہ امامت اور خلافت راشدہ چند نفوس قدسیہ کے لئے مخصوص تھی۔ البتہ ولایت کا دروازہ سب کے لئے کھلا ہوا ہے۔ اور اس کے مختلف درجات سے مختلف نفوس حسب مرضی الٰہی قیامت تک فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ لہذا "امامت" شبیریؑ تو نہیں البتہ ولایت عامہ اور دیگر امور متعلقہ ولایت "فقر کی صورت" میں اسی جذبۂ خلوص و عشق کے ساتھ جو جناب شبیرؑ میں تھا "میراثِ مسلمانی" بن سکتے ہیں۔

لہذا حضرت شبیر علیہ السلام کے مقلدین پر یہ فرض عائد ہوتا ہے۔ کہ وہ کمالات ولایت کے حصول کو بھی "میراثِ مسلمانی" میں شامل سمجھیں۔ بلکہ ان پر لازم آتا ہے کہ وہ حصول ولایت (قرب حق) کی سب سے پہلے کوشش کریں کیونکہ اصل سرمایہ شبیریؑ قرب حق کی نعمت ہی تھی جس کی بدولت انہوں نے بکمال خندہ پیشانی جامِ شہادت نوش فرمایا اور زندۂ جاوید بنے۔ جب تک مسلمان عشق الٰہی کے جذبے سے اسی طرح سرشار نہ ہوں گے جس طرح جناب شبیرؑ تھے۔ اور جب تک انہیں بھی قرب و دیدارِ حق کی دولت نصیب نہ ہو گی نہ وہ باطل سے جنگ کر سکتے ہیں۔ نہ اپنا سب کچھ راہِ خدا میں قربان کر سکتے ہیں۔ نہ شبیر علیہ السلام کی تقلید کا حق پوری طرح ادا ہو سکتا ہے۔

آئندہ صفحات میں دولتِ قربِ حق (ولایت) سے متعلق چند نکات کی وضاحت کی گئی ہے۔

ل مضامین ذوقی صفحہ ۴۵۵ بحوالہ منصب امامت از مولانا اسماعیل شہیدؒ۔

Marfat.com

منصب ولایت اور اولیاء اللہ

اسلامی روایات اس امر کی شاہد ہیں کہ فقیر کی توجہ کبھی مخلوقِ خدا کی طرف زیادہ ہوتی ہے (تاکہ وہ اسے کسی مصیبت سے نکالے یا اس کی خدمت کرے) اور کبھی وہ صرف خدا کے خیال میں اس طرح مستغرق رہتا ہے۔ کہ اسے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں رہتی۔ وہ اس وقت ایسی منزل پر ہوتا ہے۔ جہاں پہنچ کر فرشتوں کے پر جلتے ہیں۔ حدیث لِیْ مَعَ اللّٰہِ اس پر شاہد ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اللہ کی نظر میں اس کا مقام بلند سے بلند تر ہوتا جاتا ہے۔ اور اسے وہ قوت حاصل ہو جاتی ہے۔ جو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس مقام پر وہ "فانی فی اللہ" اور "باقی باللہ" ہوتا ہے۔ اور بموجب حدیث قدسی "بِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ .... الخ" اس کا ہر کام خدا کا کام ہوتا ہے ؎

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز (اقبال)

اسلام میں ایسی ہی بزرگ و برتر ہستیوں کو اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ جن کے زریں کارناموں پر اسلام اور مسلمان جس قدر فخر کریں کم ہے۔ عارفِ رومیؒ انہی کی شان میں فرماتے ہیں :-

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبداللہ بود
ہست قدرت اولیاء را از اِلٰہ
تیر جستہ باز گرداند ز راہ

علامہ اقبال نے الفاظ ولایت یا اولیاء اللہ شاید کہیں استعمال نہیں کیے۔

Marfat.com

لیکن وہ فقر و قلندری کے تحت اولیائے کرام ہی کے اوصاف بیان کرتے ہیں۔ ان کا نظریۂ خلافت یا نیابت بھی نظریۂ ولایت پر مبنی ہے۔ اور ان کا "مردِ مومن" بھی پہلے "ولی اللہ" ہے بعد میں کچھ اور ہے۔ میں نے زیر نظر مضامین میں مختلف مقامات پر ان حقائق کو مع امثلہ بیان کیا ہے۔ لہذا یہاں تفصیل غیر ضروری ہے۔ ایک قطعہ میں البتہ علامہ ایک آیتِ قرآنی کا حوالہ دیتے ہیں جو اولیاء اللہ کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ فرماتے ہیں :-

عطا اسلاف کا سوزِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لَا یَحْزَنُوْن کر
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال عقل و خرد یعنے حکمت کے مقابلہ میں ولایت و معرفت کو ترجیح دیتے تھے۔ اور اسی "جنوں" کے طالب تھے جو اولیاء اللہ کو عزیز تھا۔

عقل استدلالی کی حیرت

انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کے علوِ مراتب پر عقل استدلالی کو متحیر ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا۔ زندگی میں قدم قدم پر قلبِ ماہیت کے ذریعہ ارتقاء کا سلسلہ جاری ہے۔ مثلاً کون نہیں جانتا کہ قطرۂ آب، صدف میں پہنچ کر گوہر نایاب اور مسِ خام اکسیر سے مل کر کندن بن جاتا ہے۔ اسی طرح کوئلہ ہیرا بنتا اور خونِ نافِ آہو، نافۂ مشک بن جاتا ہے۔

اسی طرح جمادات، نباتات میں فنا ہو کر، نباتات حیوانات کا جزو بن کر اور

یہ سب انسان میں فنائیت حاصل کر کے ارتقاء پاتی رہتی ہیں - یہ فنا اس طرح واقع ہوتی ہے کہ قوی تر ہستی کمزور ہستی کو خود اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ بالفاظ دگر کمزور ہستی اس "فنا" کے ذریعہ قوی تر ہستی بن جاتی ہے۔

کیا یہ سب کچھ کسی قانون الٰہی کے تحت نہیں ہوتا۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ ہمیں اس قلب ماہیت یا ارتقاء کی درمیانی کڑیاں نظر نہ آتی ہوں۔ کیونکہ وہ پوشیدہ رہتی ہیں۔ لیکن اس سے ارتقاء یا قانون الٰہی کا انکار لازم نہیں آتا۔

اسی قانون کے تحت انسان بھی اپنے سے بلند و برتر اور "قوی تر" وجود میں "فنا" ہو کر مدارج روحانی کی بلندیوں پر پہنچتا ہے۔ جسے اصطلاح میں منصب ولایت پر فائز ہونا یا اللہ کے قریب ہونا کہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ نباتات و حیوانات جسمانی حیثیت سے بھی فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن انسان جسم کے ساتھ ارتقاءِ روحانی حاصل کرتا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہے کہ بعض منتخب ہستیاں، قلب و روح کی مخصوص قوتوں کے لحاظ سے زندگی کی اس اعلیٰ سطح پر پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں عام انسان اپنی علمی و ذہنی ترقیوں کے باوجود نہیں پہنچتا۔ اس قانون کے تحت عقل جزوی، عقل کلی بن جاتی ہے۔ اور عقل کلی عشق یا معرفت الٰہی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مادے سے لے کر الوہیت تک یہ سلسلہ جاری ہے[1]۔ البتہ اس طرح ارتقاء پانے کی درمیانی کڑیاں عام نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہیں۔

اَوْلِیَائِیْ تَحْتَ قَبَائِیْ لَا یَعْرِفُهُمْ غَیْرِیْ۔

یعنے میرے اولیاء میرے دامن میں پوشیدہ رہتے ہیں۔ انہیں میرے سوا

---

[1] اسلامی لٹریچر میں آدم یعنے آدمی کی حقیقت، تخلیق آدم "آدم صفی اللہ" اور نزول آدم علیہ السلام کی بابت بہت خلط مبحث ہے۔ اسلامی تصوف اور ولایت کے سلسلہ میں عموماً حقیقت انسانیہ اور ارتقائے روحانی سے بحث ہوتی ہے۔

Marfat.com

کوئی دوسرا نہیں پہچان سکتا۔

ان امور کے پیشِ نظر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ادنیٰ سطح وجود۔ انسانوں کے عمل طرزِ عمل، اور مقصودِ عمل کا اعلیٰ سطح وجود کے انسانوں کے عمل، طرزِ عمل اور مقصودِ عمل سے مختلف ہونا ضروری ہے۔

فقیر کی زندگی اور اس کے عمل کی بنیاد عشقِ حقیقی پر قائم رہتی ہے۔ یہی اس کا وہ "جنوں" ہے۔ جس کے طالب علامہ اقبال بھی ہیں :-

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولیٰ مجھے صاحب جنوں کر

یہی اس کا دین و مذہب ہے۔

دین عاشق از ہمہ دیں ہا جدا است
عاشقاں را مذہب و ملت خدا است

فقیر کا مطلوب و محبوب فقط اللہ ہوتا ہے۔ اور جس میں فنائیت[1] حاصل کر کے وہ "باقی باللہ" بنتا ہے۔ زندگی کی اس سطح پر خاص خاص افراد پہنچتے ہیں۔ اس لئے عوام کے "عمل" اور "مقصودِ عمل" سے ان کے "عمل" اور "مقصودِ عمل" کا کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

امر نبوت اور امر ولایت

طریقت میں تو ایک نبی کے منصب نبوت اور اس کے منصبِ ولایت کے درمیان بھی فرق کیا جاتا ہے۔ اس میں امر ولایت عروج[2] الی اللہ، اور امر نبوت نزول الی الخلق ہے۔ امر ولایت قرب و وصال حق ہے۔ اور نبوت فراق یا دوری

[1] پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ یہ فنائیت جسمانی نہیں ہوتی۔ ۱۲ [2] عروج و نزول تصوف کی اصطلاحات ہیں اور ان کا وہی مفہوم لینا چاہئے جو فقرا نے بیان کیا ہے۔

Marfat.com

ہے۔ کیونکہ امرِ نبوت احکام خداوندی کا مخلوق تک پہنچانا ہے۔ جس میں خلق کی طرف زیادہ توجہ رکھنا ہوتی ہے۔ اور ولایت تمام امور سے بے نیاز ہو کر مشاہدۂ حق میں محو ہونا ہے

"کہاں حضور کی لذت کہاں حجاب دلیل" (اقبال)

اس لئے کہا گیا ہے کہ نبی کی ولایت اس کی نبوت سے افضل ہوتی ہے۔ اور افرادِ امت کی ولایت فیض نبوت کے تحت ترقی پاتی ہے۔

خلافت فی الارض اور سلطنت فی الارض کا فرق

دراصل ولی کی حیثیت سے خلق اللہ کی مدد کرنے کا دوسرا نام خلافت فی الارض یا نیابتِ الٰہیہ ہے۔ اور اسی کو "فقر" کہتے ہیں۔ اس کے لئے سلطنت ضروری نہیں ہے۔ سلطنت تنظیم ملت کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اگر انتظامِ سلطنت کا بار "فقیر" کے سر پر ڈال دیا جائے تو وہ امتِ رسولؐ کی بہبودی کی خاطر اسے بھی اس طرح انجام دیتا ہے کہ وہ ملوکیت نہیں بننے پاتی۔ اس کی بہترین مثال خلافتِ راشدہ ہے۔ خلفائے اربعہؓ پہلے اولیاءِ حق تھے۔ بعد میں خلیفہ، سلطان یا حاکم تھے۔ اُن کی فضیلت اس راز کی بدولت تھی۔ جو ان کے سینوں میں رکھا گیا تھا۔ نہ کہ اقتدارِ سلطنت کی وجہ سے۔ اس پر اضافہ شرف صحابیت نے کیا تھا۔ جس طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پہلے اللہ تعالےٰ کے حبیب و رسولؐ تھے۔ بعد میں حاکم، فاتح اور مُقنّن وغیرہ سب کچھ تھے۔

خلافت راشدہ کے بعد کسی اسلامی سلطنت کو وہ درجہ نہیں دیا گیا جو خلافتِ

Marfat.com

راشدہ کو حاصل تھا۔ کیونکہ خلفائے راشدین اصحاب رسولؐ تھے۔ آپ کے عین بعد بار خلافت ان کے کاندھوں پر رکھا گیا تھا۔ اور وہ بہترین ولی حق۔ نائب حق۔ جانشینِ رسولؐ اور خلفائے رسولؐ تھے۔ ظاہری سلطنت میں بھی اور روحانیت کی دنیا میں بھی یہی تینوں فضیلتیں (امر ولایت، صحابیت، اور خلافت) ان کی ذات میں مجتمع ہو گئی تھیں۔

ان کے بعد مسلم حکمران "باستثنائے چند" محض سلطان یا بادشاہ تھے۔ اور ان کی حکومت، دنیاوی حکومت (ملوکیت) تھی۔ وہ صحیح معنوں میں نائب حق نہ تھے ان کی حکومت نہ شانِ فقر کی تبلیغ کے لئے تھی نہ شوکتِ اسلام کے استحکام کے لئے بلکہ خود اپنی شہرت اور اپنے عیش و آرام کے لئے تھی۔ وہ اپنے آپ کو "خلیفۂ وقت" کہلواتے ضرور تھے۔ لیکن دراصل "وہ خلیفۂ راشد" نہ تھے۔ بلکہ محض مسلم سلاطین تھے۔ ان میں بعض سلاطین کی حکومت اسلامی اصولوں پر قائم رہی لیکن بعض نے اسلامی اصولوں کی بھی مطلق پروا نہ کی۔ ایسی حکومت کو "اسلامی سلطنت" بھی نہیں کہہ سکتے۔ خلافت فی الارض کہنا تو بڑی بات ہے۔

نظریۂ اقبال

علامہ اقبال بھی خلافت و نیابت کے مذکورۂ بالا مفہوم سے الگ کوئی نیا مفہوم نہیں پیش کرتے۔ چنانچہ ان کے مردِ مومن کے وہی اوصاف ہیں۔ جو خلفائے راشدین کے تھے (بلحاظ ولایت و نیابت) اور جو ہر مردِ فقیر کے ہونے چاہئیں۔ لیکن چونکہ وہ غیرتِ ملی کے جذبے سے بے حد متاثر ہیں۔ اس لئے زمانۂ حاضر کے خلاف جنگ کرنے کے لئے فقیر کو مسلح دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسی کے ذمے انتظامِ سلطنت بھی رکھنا چاہتے ہیں۔

Marfat.com

یا بالفاظ دیگر ان کے نظریے کے مطابق :-

(۱) ہر مسلم حکمران کو صاحب فقر ہونا چاہئیے۔ اور اتنا طاقتور کہ دنیا کی کوئی دوسری قوم اس کی سلطنت کو مٹا نہ سکے۔ وہ خود پیٹ پر پتھر باندھے۔ اور لباس میں پیوند لگائے۔ جب تک کہ اس کی قوم سے بھوک، پیاس اور افلاس و غربت کی لعنت بالکل دور نہ ہو جائے۔ اور معاشرے میں قرآن و سنت کے اصول پوری طرح رائج نہ ہو جائیں۔ اور

(۲) ہر مسلم بھی مرد مومن (صاحب فقر) بن کر استحکام ملت کے لئے جہد و جہاد میں مصروف رہے۔ انفرادی طور پر نہیں بلکہ منظم ہو کر اپنے مرکز کے تحت۔

اس بے پناہ جذبۂ ملی سے مغلوب ہو کر علامہ نے نہ صرف جاہل و کاہل نام نہاد صوفیوں پر اعتراضات کئے ہیں۔ بلکہ ہر ناکارہ جماعت، بے جان آرٹ، مردہ شاعری افیونی فلسفہ، گمراہ کن تعلیم و تربیت اور تخریبی خیال و عقیدہ پر بھی تند و تلخ تنقید کی ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ کس طرح نکل سکتا ہے کہ وہ اسلامی فقر و تصوف اکابر صوفیہ، اولیاء کرام یا صحیح قسم کے آرٹ، شاعری، فلسفہ اور تعلیم و تربیت وغیرہ سب کے خلاف تھے۔ بالخصوص جب کہ یہ تمام چیزیں حیاتِ انسانی میں اپنے اپنے مقام پر مخصوص اہمیت رکھتی ہیں۔ اور سب کی تعریف میں علامہ کے سینکڑوں اشعار موجود ہیں۔

علامہ کے نظریۂ "فقر و خلافت" کے بموجب ایسی تمام برسر اقتدار ہستیاں اور ارباب حکومت بھی جو صاحب فقر نہ ہوں قابل الزام ہیں۔ کیونکہ وہ نائب حق اور خلیفۂ رسول ﷺ ہونے کے بجائے ملوکیت نواز، عیش پرست اور یادگار چنگیزیت ہیں۔ ع

"جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"

Marfat.com

نظریۂ اقبال کی بنیاد

"سلطنتِ اہلِ دل" فقر ہے شاہی نہیں" (اقبال)

ذرا غور کرنے سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔ کہ نظریۂ اقبال کی بنیاد اسلامی فقر و تصوف پر قائم ہے۔ اس کی تردید یا مخالفت پر نہیں۔ جب تک مسلمان اپنی زندگی کو اسلامی فقر و تصوف کے سانچہ میں نہ ڈھالے گا۔ فوز و فلاح کی منزل پر ہرگز نہ پہنچ سکے گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ پہلے اسلامی فقر و تصوف کو سیرت اولیاء اللہ و فقرائے اسلام کی روشنی میں سمجھے۔ کسی نے سچ کہا ہے:۔

جہاں دل ہے وہاں وہ ہیں جہاں وہ ہیں وہاں سب کچھ
مگر پہلے مقامِ دل سمجھنے کی ضرورت ہے

جب یہ ثابت ہو چکا کہ علامہ اقبال کا مقصد "خلافتِ راشدہ" ہی کا احیاء ہے۔ اور وہ اسی مبارک دور کی خصوصیات کو زندہ کرنا چاہتے ہیں۔ تو یہ کہنا ہی غلط ہے۔ کہ انہوں نے کوئی "نیا نظریہ" دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا پیغام یہ ہے کہ دنیا میں خلافتِ راشدہ کی خصوصیات کو از سرِ نو زندہ کیا جائے۔ اور دورِ جدید کے تقاضوں کے پیشِ نظر ان خصوصیات میں وسعت پیدا کر کے انسانیت کا رُخ قومیت، بین الاقوامیت، زر، زن، زمین ملوکیت، ملوک، اور نفسِ امّارہ کے بتوں کی پرستش سے ہٹا کر کائنات کے خالق و مالک کی پرستش کی طرف پھیرا جائے۔ تاکہ دنیا ایک بار پھر کُنتُم خَیرَ اُمَّۃٍ اُخرِجَت لِلنَّاسِ تَأمُرُونَ بِالمَعرُوفِ وَتَنہَونَ عَنِ المُنکَرِ وَتُؤمِنُونَ بِاللّٰہِ ط (۳-۱۱۰)

Marfat.com

(تم بہترین امت ہو جو جملہ انسانوں کے لئے اس لئے منتخب کر کے بھیجے گئے ہو
تاکہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرو۔ اور یہ کہ اللہ پر ایمان لاؤ) اور اللہ پر ایمان لاؤ) اور
وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ o

(۳ - ۱۳۹)

(اور تم ہمت نہ ہارو۔ اور غم نہ کرو۔ اور تم ہی غالب رہو گے اگر مؤمن رہے۔)
کا نظارہ دیکھ لے۔

واضح رہے کہ قرآن کی اصطلاح میں اولیاء اللہ ہی مومنین ہیں۔

---

(۶)

خودی اور عمل

Marfat.com

۷۸۶

اِلٰی رَبِّكَ كَدۡحًا فَمُلَاقِیۡهِ ط

(۸۴-۶)

اپنے پروردگار کی ملاقات کے لئے خوب محنت کریں ملنا ہے تجھے اس سے۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ
(اقبالؒ)

Marfat.com

خودی اور عمل

انائے انسانی یا خودی کے متعلق علامہ اقبال کے خیالات کا جائزہ لینے کے سلسلے میں ضروری ہے۔ کہ چند امور ذہن میں رہیں۔

(۱) یہ کہ اس سے متعلق علامہ کے خیالات ان کے سارے کلام اور لیکچروں میں منتشر ہیں۔

(۲) یہ کہ خود علامہ نے اعتراف کیا ہے کہ ان کا نظریۂ خودی مسلمان حکماء اور صوفیاء کے عقائد سے ماخوذ ہے۔ نہ کہ حکمائے مغرب کے خیالات سے۔

(۳) یہ کہ اس کی توضیح میں قرآن واحادیث اور عقائد صوفیائے کرام سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے اہل مغرب کے فلسفہ پسند افراد کے لئے فلسفیانہ طرز بیان اختیار کیا۔

(۴) یہ کہ مثنوی اسرار خودی کی تصنیف کے بعد اسلامی فقر و تصوف کے متعلق ان کے نظریات میں اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں اور بعض مسائل سے جن کی انہوں نے پہلے مخالفت کی تھی بعد میں اتفاق کیا۔ مثلاً پہلے انکی رائے تھی کہ تصوف نفی خودی کا حامی ہے۔ لیکن آخر میں اُن کی رائے یہ ہو گئی کہ "اسلامی تصوف نے خودی کے لئے نئے باب کھولے ہیں"۔[1] پہلے وہ وحدت الوجود کے خلاف تھے۔ لیکن آخر میں پکے وحدت الوجودی بن گئے۔[2]

---

[1] خطبات اقبال۔

[2] پروفیسر یوسف سلیم چشتی "شرح اسرار خودی"۔ پروفیسر طاہر فاروقی "سیرت اقبال"۔ ص ۲۶۸، ص ۲۶۹۔ تفصیل کے لئے میرے مضامین "تصوف اور اقبال" اور "حقیقت انسانیہ" دیکھئے۔

Marfat.com

جس کتاب پر انہیں پی-ایچ-ڈی کی ڈگری ملی-اس کے بیشتر حصہ کو بعد میں خود انہوں نے قابل تنقید قرار دیا[1]

خودی کی توضیح و تشریح کے سلسلہ میں شارحین نظریۂ اقبال عموماً حکمائے مغرب مثلاً ہیگل، نطشے، برگساں اور اسپنوزا وغیرہ کے فلسفیانہ خیالات پیش کر کے سیدھی سادی باتوں کو الجھا دیتے ہیں-اور یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں-کہ خودی کے متعلق افکار اقبال کا ماخذ حکماء مغرب کے نظریات ہیں-حالانکہ خود علامہ اقبال کا دعوی یہ ہے کہ ان کا نظریہ مسلمان صوفیہ و حکماء سے ماخوذ ہے-بعض اشخاص نے علامہ کی زندگی ہی میں ان کے نظریۂ خودی کی تشریح کے سلسلہ میں یہ کہنا شروع کر دیا تھا-کہ یہ نظریۂ مذکور حکماء مغرب کے خیالات سے ماخوذ ہے چنانچہ اس کے رد میں علامہ حضور سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم سے ان الفاظ میں فریاد کرتے ہیں:-

محفل از شمع نوا افروختم
قوم را رمز حیات آموختم
داستانے گفتم از یاران نجد
نکہتے آوردم از بستان نجد

---

[1] میر حسن الدین صاحب بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) فلسفہ عجم کے دیباچہ میں فرماتے ہیں"۱۹۲۷ء میں علامہ اقبال سے اس ناچیز نے اس کتاب کا ترجمہ شائع کرنے کی اجازت چاہی تھی-علامہ موصوف نے ازراہ کرم اجازت دیتے ہوئے تحریر فرمایا تھا کہ یہ کتاب اب سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی-اس وقت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے-اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آچکا ہے-میرے خیال میں اب اس کتاب کا صرف تھوڑا سا حصہ باقی ہے جو تنقید کی زد سے بچ سکے"-

(دیباچہ فلسفۂ عجم)

Marfat.com

گفت برما بند و افسونِ فرنگ
ہست غوغائش ز قانونِ فرنگ
ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را
ایں کہ نشناسد متاعِ خویش را
گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
خشک گرداں بادہ در انگورِ من
زہر ریز اندر مئے کافورِ من
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے نظریۂ خودی کا سرچشمہ فلسفہ ہائے مغرب نہیں بلکہ قرآن و سنت ہیں۔ لہذا اس کی شرح بھی قرآن و سنت ہی کے حوالوں سے کرنا چاہیے۔ اس کی کوئی وضاحت مسلمانوں کے کام کی نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ قرآن پاک اور احادیث نبوی، سیرت رسول اللہ و جانشینانِ رسول اللہ کی روشنی میں نہ کی جائے۔ خودی کی شرح کے سلسلے میں محض حکماء یا فلاسفہ کے خیالات کا اظہار (جب کہ اس کے مخاطب مسلمان ہوں) خود علامہ کے مقصد کے خلاف ہے۔ کیونکہ ایسی شرح مسلمانوں کے لئے کارآمد نہیں ہو سکتی۔ علاوہ بریں ایسی شرحیں پڑھنے سے پڑھنے والوں کا رجحان قرآن و سنت اور سیرت اولیاء اللہ سے ہٹ کر اہل فلسفہ کی جانب ہوتا ہے۔ اور وہ پیغامِ حق اور اولیاء اللہ سے دور ہو کر مغرب کے فلسفہ و حکمت اور اُن کے علَم برداروں کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں۔

Marfat.com

میں حقیقت انسانیہ اور اس کی معراج کے تحت "اَنَا" یا خودی کی شرح قرآن وسنت اور اقوال اولیاء اللہ کی روشنی میں کر چکا ہوں۔ اور یہ بھی بتا چکا ہوں کہ صوفیائے کرام کے نظریۂ اَنَا میں طریقت، حقیقت اور معرفت کے تحت قرب حق کے حصول پر خاص زور دیا گیا ہے۔ باقی امور کو شریعت کے تحت رکھا گیا ہے۔ جو عالم انسانیت کے لئے بہترین قانون حیات ہے۔ لیکن علامہ نے اپنے نظریۂ خودی میں قومی و سیاسی مصلحتوں کے باعث دنیاوی زندگی میں سخت کوشی، مسلسل جہد وجہاد اور اسلامی اصولوں کے مطابق سیاسی و معاشی تعمیر ملی پر خاص زور دیا ہے۔ اور قرب حق کی فضیلت کو خودی سے الگ فقر و قلندری کے تحت خاص طور پر بیان کیا ہے۔ اس طرح اکابر صوفیہ کا نظریۂ حیات - شریعت + (طریقت حقیقت و معرفت) کا مجموعہ ہے اور علامہ کا نظریہ حیات خودی + (فقر و قلندری) کا مجموعہ ہے۔ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ فرق صرف ترتیب اجزاء، اسلوب بیان، اور اختصاص و تخصیص کا ہے۔ نہ اکابر صوفیہ خودی کے مخالف ہیں۔ نہ علامہ اقبال طریقت، حقیقت اور معرفت کے۔ اعتراضات غلط فہمی کا نتیجہ ہیں۔

یہاں تفصیل کا اعادہ موجب طوالت ہوگا۔ لہذا اس سے اجتناب کیا جاتا ہے اور صرف "عمل" کی وضاحت کی جاتی ہے۔

علامہ نے دیباچہ اسرار خودی میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "خودی اپنی حقیقت کی رو سے مضمر اور عمل کی رو سے ظاہر ہے"۔

اسلامی عقیدہ کے بموجب جسمانی موت واقع ہونے پر عمل انسانی کا سلسلہ مسدود ہو جاتا ہے۔ یعنے خودی بلحاظ عمل ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن حقیقت کی رو سے باقی رہتی ہے۔ اکابر صوفیہ بھی یہی کہتے ہیں۔ لیکن ذرا الفاظ بدل کر ان کے عقائد کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کا باطنی وجود ہی اصل وجود ہے۔ موت اُسے فنا نہیں

Marfat.com

کرتی ...... وہی منزل قرب پر فائز ہوتا ہے .... اس لئے انسان کی اصل توجہ کا مستحق قلب یا انسان کا باطنی وجود ہے (وہی جسے علامہ "خودی کی حقیقت" "نقطۂ نوری" "مرکزِ وجود" یا "جوہر انسان" کہتے ہیں ......)

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

یا

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

مختصر یہ کہ خودی کی وہ حیثیت جو اعمال سے متعلق ہے۔ انسان کی جسمانی موت پر ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ حیثیت جو اس کی حقیقت سے متعلق ہے باقی رہتی ہے۔ یہاں تک اکابر صوفیہ اور علامہ کے نقطۂ نظر میں کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوا لیکن چونکہ عیسائی محققین و مبلغین نے بالارادہ ہمارے صوفیۂ کرام کی جماعت پر "بے عملی" کا الزام لگایا ہے۔ تاکہ ان کے راہبوں کی راہبانہ زندگی اور حقوق العباد سے کنارہ کشی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے راہ ہموار ہو جائے۔ اور چونکہ بعض مسلمانوں نے غلط فہمیوں کی بنا پر ان کے اس الزام کو صحیح سمجھ لیا ہے۔ لہذا "عمل" پر مختلف "زاویوں سے روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

"عمل" کی وضاحت

واضح ہو کہ ہمارے عقیدے میں وجود (انا یا خودی) بالقوۃ اور بالفعل دونوں صورتوں میں متحقق ہے۔ اور جس طرح "ظہورِ وجود" کی مختلف سطحیں یا صورتیں ہیں۔ اسی طرح "عمل" اور اس کے اظہار کی نوعیت بھی مختلف سطح حیات پر مختلف

Marfat.com

ہوتی ہے۔

عالم حس و شہادت میں "وجود" کی ادنیٰ ترین سطح "عالم جمادات" ہے۔ اس سے اعلیٰ "عالم نباتات" ہے اور اس سے اور سب سے اعلیٰ عالم حیوانات ہے۔ ہر سطح پر وجود و حیات کے آثار و صفات اور اعمال و افعال مختلف نوعیت رکھتے ہیں۔ اپنی سطح پر ہر شے خالق کائنات کے مقرر کردہ قانون کی پابند ہے۔ اور رفتہ رفتہ اپنے سے بالاتر ہستی میں فنا یا جذب ہوکر خود بالاتر ہستی بنتی رہتی ہے (الا ذ الا یا فنا و بقا کا قانون) یہی قانون تمام کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اور اسی کی پابندی پر ہر سطح حیات یا ہر عالم وجود میں متعلقہ شے کا عمل ہے۔

انسان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ خالق کائنات نے اسے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ زمین و آسمان کو اس کے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس کے صلہ میں اس کی جان و مال کو خرید لیا ہے۔ اور اپنے قرب کو اس کے تمام پیکار حیات کا منتہیٰ قرار دیا ہے۔[1]

لیکن چونکہ خود عالم انسانیت مقصود حیات کے لحاظ سے مختلف سطحوں پر منقسم ہے۔ لہذا ضروری ہے۔ کہ ہر سطح انسانیت پر عمل کے آثار و صفات بھی دوسری سطح انسانیت کے عمل اور اس کے آثار و صفات سے مختلف ہوں۔ ایسا نہ ہونا قانون فطرت کے خلاف ہوگا۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ہر اعلیٰ سطح حیات کا انسان ادنیٰ تر سطح حیات کے انسانوں کو اپنے قوی اثرات کے ذریعہ اپنے اندر جذب کرتا رہے۔ جماعتوں اور قوموں میں بھی یہی قانون کار فرما ہے۔ مگر اس طرح کارخانۂ عالم کی ظاہری ہیئت، مادی تغیرات کے باوجود بحیثیت مجموعی جوں کی توں رہتی ہے۔ اسی طرح انسان کا روحانی یا باطنی ارتقا بھی جاری رہتا ہے۔ اس ارتقاء کا بہترین ذریعہ شریعت، طریقت اسلامیہ پر عمل درآمد اور بہترین

---

[1] یہ تمام باتیں قرآن پاک سے ثابت ہیں۔

Marfat.com

نمونہ حضور ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جانشینوں کا اُسوۂ حسنہ ہے جس سطحِ حیات پر خودی کا دعویٰ ہے

خودی کی زد میں ہے ساری خدائی یا

یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ ۔۔۔۔ ہو

یا صوفیائے کرام کا اَنَا کا نعرہ اَنَا الحق یا سُبْحَانِی مَا اَعْظَمَ شَانِی ۔۔۔۔ ہو اس سطحِ حیات پر عمل کی نوعیت وہ نہیں ہو سکتی جو غفلت عن اللہ، مادہ پرستی، محکومیت مجبوریت اور جبر کی سطح پر ہوتی ہے ۔ سفر میں راکب و مرکب دونوں سرگرم عمل ہوتے ہیں لیکن دونوں کے "عمل" میں وہی فرق ہے ۔ جو ایک مختار اور مجبور کے عمل میں ہوتا ہے ۔

علامہ اقبال نے عبد اور عبدہٗ کے فرق کو حضرت منصورؒ کی زبانی اچھی طرح واضح کیا ہے اور آخر میں کیا پتہ کی بات کہدی ہے کہ ؎

مدعا پیدا نہ گردد زیں دو بیت
تا نہ بینی از مقامِ مَا رَمَیْت

بے شک ادنیٰ مقام پر رہ کر کوئی شخص اعلیٰ مقام کے عمل یا حالات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا ۔ جب تک خود اس مقام پر نہ پہنچ جائے ۔

علامہ اقبال کے پیغام عمل کی حقیقت یہ ہے ۔ کہ بندۂ مجبور (اور ملت مجبور) جہد و جہاد کے ذریعہ صاحب اختیار بن جائے ۔ وہ ادنیٰ سطح انسانیت سے اعلیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر سطح انسانیت پہ پہنچے ۔ کسی ایک مقام پر رک نہ جائے ۔ ان کے نظریۂ حیات و عمل کے بموجب "انائے انسانی" کو زمان و مکان کے حدود سے بھی آگے نکل جانا چاہیئے ۔

ابھی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا ؏ کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

Marfat.com

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر

ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

تخلیق آرزو، سخت کوشی، پیکار مسلسل، تسخیر مادہ، قوتِ تخلیق کا استعمال، سیاسی اقتدار وغیرہ یہ تمام چیزیں مذکورہ بالا مقصد حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ اصل مقصود نہیں۔ ان کا استعمال کر کے بندۂ مومن نائب حق بنتا ہے۔ یا مقامِ قلندری پر فائز ہوتا ہے۔ لیکن یہ تمام امور اسلامی فقر و تصوف سے ماخوذ ہیں۔ فرق عبارت کا ہے۔ معنے کا نہیں۔ "نیابتِ حق" اور "قلندریت"، دونوں کی بنیاد ولایت (قرب حق) پر قائم ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسانیت الوہیت سے اس طرح واصل ہو جاتی ہے کہ دونوں میں تمیز مشکل ہے۔ یہاں بندہ کے ہاتھ کو خدا خود اپنا ہاتھ اور اس کے فعل کو خود اپنا فعل فرماتا ہے:۔

آیاتِ قرآنی یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ .... وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ نیز احادیث نبوی صلے اللہ علیہ وسلم سے یہی ثابت ہے۔ اسی کو صوفیائے کرام وصل الی اللہ، قُربِ حق، فنا فی اللہ، بقا باللہ وغیرہ کہتے ہیں۔ یہی منزل اقبال کے مرشد معنوی نے ؎

"منزلِ ما کبریاست"

کہہ کر ہمارے سامنے رکھی۔ چنانچہ اسی کی طرف اقبال راہنمائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں

آتش در گیر زد در خس و خاشاک من

مرشدِ رومیؒ کہ گفت منزلِ ما کبریاست

غرض یہ کہ جب دونوں (علامہ اقبال اور صوفیائے کرام) کی اصل منزل مقصود ایک ہی ہے۔ تو دونوں کے "عمل" کی نوعیت بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ کم از کم نیابتِ حق" اور" قلندری" کی سطح پر اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔

Marfat.com

ہر شے کی "خودی" اور اس کی "منزلِ مقصود" اس کے مرتبے کے مطابق ہوتی ہے اور اسی لحاظ سے اس کے "عمل" کا مرتبہ ہوتا ہے۔ مثلاً

شیطان کی خودی شیطانی ہے۔ اور اس کا عمل انسان و انسانیت کی تخریب ہے۔ انسانوں میں بعض کی خودی حیوانی ہوتی ہے اور اس کا عمل فسق و فجور، حیوانیت اور صرف مادی لذائذِ حیات کے لئے جان دینا ہے۔ بعض کی خودی ملکوتی، روحانی ہوتی ہے۔ اور اس کا "عمل" زیادہ تر توجہ الی اللہ ہوتا ہے۔ ایسا انسان بقدرِ ضرورت مادی وسائلِ حیات سے بھی استفادہ کرتا ہے۔ لیکن اس کے عمل کا یہ پہلو بھی روحانی و اخلاقی بنیادوں پر قائم رہتا ہے۔ یہی خودی ترقی کر کے خدا کا قرب حاصل کرتی ہے۔

قرآن پاک بھی نفس کی تین قسمیں بتاتا ہے:۔

(۱) نفسِ امارہ (۲) نفسِ لوامہ (۳) نفسِ مطمئنہ۔

صوفیائے کرام کی خودی روحانی ملکوتی ہوتی ہے۔ لہذا ان کا عمل بھی اُنکے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے۔ جن افراد کی خودی ان کی خودی سے مختلف ہوگی ان کی نظر میں "عمل" کی نوعیت بھی ان کے عمل سے مختلف ہوگی یہ بھی ممکن ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے کو بُرا کہیں۔

علامہ اقبال نے خودی کی یہ تقسیم نہیں کی لیکن چونکہ "مسلمان" خودی یا ملکوتی روحانی خودی کے اخلاقی و روحانی اوصاف وہی ہیں۔ جو صوفیائے کرام کے نظریۂ اخلاق کے ہیں۔ اور جو قرآن پاک میں نفسِ لوامہ اور نفسِ مطمئنہ کے بیان کئے گئے ہیں۔ اور چونکہ "شیطانی خودی" کا ذکر بھی مختلف طور پر دونوں کرتے ہیں۔ اور قرآن پاک میں بھی نفسِ امارہ اور شیطان کے نام سے موجود ہے۔ میں نے خودی کی بھی یہی تقسیم

---

۵۱ البتہ حکیمی اور کلیمی کی نسبت سے خودی کی تقسیم یوں کی ہے ؎

حکیمی نامسلمانی خودی کی ٭ کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی (بالِ جبریل)

Marfat.com

کی ہے۔ تاکہ مقابلہ کرنے میں سہولت ہو۔ قرآن پاک اور سنتِ نبوی سے باہر خودی کے نہ کوئی اوصاف ہو سکتے ہیں۔ نہ اس کی کوئی قسم ہو سکتی ہے۔ سورۂ واقعہ میں بھی انسان کو بلحاظِ عمل تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے ؛۔

(۱) اصحاب یمین (۲) اصحاب شمال اور (۳) مقربین۔ اور تینوں کی حیات بعد الممات کی خصوصیات بھی بتا دی گئی ہیں۔

علامہؒ "نیابتِ الٰہی" کو خودی کی اعلیٰ ترین منزل قرار دیتے ہیں۔ لیکن ولایت کا ذکر نہیں کرتے حالانکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ نیابتِ الٰہی ولایت حقہ پر قایم رہتی ہے کیونکہ اللہ کا نائب وہی ہو سکتا ہے جسے اللہ کا قرب بھی حاصل ہو۔ علامہ نے سیاسی و ملی مصلحتوں کی بناء پر "قربِ حق" (ولایت) کا ذکر نظریۂ خودی کے تحت نہیں کیا۔ بلکہ نظریۂ قلندری کے تحت اور دیگر مقامات پر کیا ہے۔

صوفیائے کرام کا نظریۂ فنا بھی نیابتِ حق اور اس عروج پر مشتمل ہے جو حدیث لِی مَعَ اللّٰہِ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور ان کا عمل شریعت و طریقت کے احکام کی پابندی ہے۔ اسلام میں کوئی عمل جو حدود شریعت و طریقت کے باہر ہو۔ خدا اور رسولؐ کے نزدیک مقبول نہیں۔ عشقِ خدا و رسولؐ اور اطاعتِ خدا و رسولؐ میں جو درجہ صوفیہ کرام کو حاصل ہے۔ اس کی نظیر دیگر افراد میں مشکل ملیگی۔
البتہ عرصہ تک وہ سیاسیات سے اجتناب کرتے رہے۔ اس کا سبب وہ ناگفتہ بہ واقعات ہیں جو دورِ خلافت راشدہ ہی میں رونما ہونے لگے تھے۔ اور جن کے باعث اللہ والوں نے سیاسیات کو خیر باد کہہ دیا۔ گندی سیاسیات سے بچ کر اللہ کی یاد میں زندگی گزارنے کو "بے عملی" یا "زندگی سے فرار" نہیں کہہ سکتے ورنہ اہل بیت اطہارؓ، آلِ رسولؐ اور دیگر صلحائے امت پر بھی جو معاویہ، یزید اور بعد کے دنیا دار سلاطین و ملوک سے اور ان کی سیاسیات سے بیزار ہو کر علیحدہ ہو گئے تھے۔ یہی الزام عائد ہو گا۔

Marfat.com

موجودہ زمانے کے صوفیائے کرام "بے عمل" نہیں ہیں وہ زندگی کے ہر شعبہ میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔ اور اسلامی سیرت و کردار رکھتے ہیں۔ وہ ان "مسٹروں" سے کہیں بہتر ہیں۔ جو خدا اور رسولؐ کی طرف پشت کر کے بے تحاشا مغرب کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ اور ان کی بھی نقالی اچھی طرح نہیں کر سکتے۔

صوفیائے کرام اور علامہ اقبال دونوں کے یہاں ارتقاء روحانی معنوی" ہے ڈاروِن کا ارتقاء یا مغرب کی مادی ترقی نہیں۔ ایسی مادی ترقی کہ جس کی بنیاد اخلاق و روحانیت پر نہ ہو۔ دونوں مخالف ہیں۔ لہٰذا "عمل" بھی دونوں کی نظر میں وہی محمود ہو سکتا ہے۔ جو انسان کے روحانی ارتقاء میں مدد دے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں :-

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے سکندری سے نہیں

یہ کافری تو نہیں، کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود

خودی کا سرّ نہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
خودی ہے تیغ فساں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اک شرعِ مسلمانی ایک جذبِ مسلمانی
ہے جذبِ مسلمانی سرّ فلک الافلاک

بعض لوگوں کا سب سے بڑا اعتراض صوفیوں پر یہ ہے کہ وہ تعمیر ملت کے کاموں

Marfat.com

میں حصہ نہیں لیتے۔ اسی کو وہ "بے عملی" کہتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض غلط فہمی پر مبنی ہے اور خود علامہ اقبال کی رائے کے پیش نظر جو مندرجہ ذیل واقعات سے ظاہر ہوتی ہے کوئی وزن نہیں رکھتا۔

"بلوچیوں کا ایک وفد علامہ کی خدمت میں آیا۔ مختلف سیاسی معاملات پر دیر تک گفت و شنید ہوتی رہی۔ وفد کے ایک ممبر نے کہا۔ کہ آپ کی تعلیمات نے مدت کی سوئی ہوئی قوم کو بیدار کر دیا اور آپ نے انسانیت اور اسلام کے تمام اسرار و رموز ہم کو سکھا دئے۔ لیکن ہمیں شکایت ہے کہ آپ نے خود نمونہ عمل پیش نہیں کیا۔ سر اقبال نے جواب دیا۔ کیا یہ میرا عمل نہیں ہے کہ میں نے قوم کو بیدار کر دیا۔ اور تمہارے سامنے عمل کی شاہراہ پیش کر دی۔ میرا کام ہے درس دینا۔ آگے یہ تمہارا ذمہ ہے کہ ان تعلیمات پر عمل کرو اور میدان زندگی میں جہاد کرتے رہو۔" [۱]

صوفیائے کرام کا عمل تو "درس دینے" اور صرف "شاہراہ عمل پیش کرنے" سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ وہ سالکین راہِ خدا کی تربیت کرتے اور انہیں اپنے نقش پر چلا کر خدا رسیدہ بناتے ہیں۔ وہ جس فن کے ماہر اور جس شعبۂ حیات سے متعلق علوم کے استاد ہوتے ہیں۔ اسی کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہیں۔ دوسرے امور سے انہیں بھی اسی طرح تعلق نہیں ہوتا۔ جس طرح دنیا کے ہر دوسرے ماہر خصوصی کو نہیں ہوتا۔ دنیا تقسیم کار کے اصول کی پابند ہے اور کوئی ماہر فن کسی دوسرے فن کے ماہر خصوصی کو "بے عمل" نہیں کہتا۔

مجھے تو ہے مرغوب مجنوں کو لیلیٰ
پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی

---

[۱] سیرت اقبال۔ از پروفیسر طاہر فاروقی ص۱۱۱

اچھا یا برا ہونا ایک امر اضافی بھی ہے :-

حُوران بہشتی را دوزخ بود اعراف

از دوزخیاں پُرس کہ اعراف بہشت است

اب عوام اور موجودہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کے متعلق بھی علامہ کی رائے سُنئے :-

"ایک ملاقات میں حکیم محسن علی صاحب عرشی نے ان سے کہا کہ آپ کے مدراس والے لیکچرز بے حد مشکل ہیں۔ اگر اسلام یا قرآن کا منشاء یہی ہے جو آپ نے ان لیکچروں میں بیان فرمایا ہے۔ اور جس کو اس ترقی یافتہ زمانے کے بڑے بڑے اہل علم سمجھنے سے قاصر ہیں تو قرن اول کے صحرانشینوں نے اسے کیا سمجھا ہوگا۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ کسی قوم کی تشکیل و تعمیر کے لئے اسلام کے پانچ ارکان مشہورہ کا اجراء و انضباط کافی ہے۔ چنانچہ اس کی محسوس عملی صورت عہد سعادت سے بہتر کہیں نظر نہیں آ سکتی۔ اور تاریخ کا حافظ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا"۔ [1]

زمانہ جانتا ہے۔ کہ شریعت اسلامیہ بالخصوص "پنج ارکانِ مشہورہ" کی پابندی جتنی سختی اور پرخلوص محبت رسول ؐ کے ساتھ حضرات صوفیہ کرتے ہیں۔ اتنی کوئی دوسری جماعت نہیں کرتی۔ اس لحاظ سے بھی "بے عملی" کا الزام اُن پر نہیں عائد ہو سکتا "بے عملی" کا الزام دراصل ایسے غیر صوفی حضرات پہ عائد ہو سکتا ہے۔ جو "پنج ارکانِ اسلام" کے پابند نہ ہوں۔ یا جو ان کے اجراء و انضباط کے ذمے دار تو ہوں لیکن اس ذمہ داری کو عملی جامہ نہ پہناتے ہوں۔

تخریب ملت کی ذمہ داری کن حضرات و حالات پر عائد ہوتی ہے۔ علامہ ہی کی زبان سے سنئے :-

وہ ایک خط میں حضرت سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں :- "میں خود مسلمانوں

---

[1] اقبالِ کامل ص۸۵

کے انتشار سے بے حد دردمند ہوں۔ مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ نہایت پست فطرت ہے۔ [۱]

خواجہ عبدالوحید صاحب کا بیان ہے کہ حضرت علامہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق فرمایا۔ کہ "میرا مُدۃُ العمر کا مطالعہ اور مشاہدہ مجھے یقین دلا چکا ہے۔ کہ یہ لوگ بالکل بے کار ہیں۔ بالخصوص ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمان'..." [۲]

نیاز احمد صاحب کو لکھتے ہیں:۔

"مذہبی مسائل بالخصوص اسلامی مذہبی مسائل کے فہم کے لئے ایک خاص تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں کی نئی پود اس سے بالکل کوری ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ تعلیم کا تمام تر غیر دینی ہو جانا اس مصیبت کا باعث ہوا ہے۔ [۳]

ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا اِلٰہ اِلّا اللہ

ایک اور جگہ ارشاد ہے:۔

گرچہ ملت کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مُردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس

ان خطوط اور اشعار کے پیش نظر تخریب قوم کی ذمہ داری صوفیہ کرام کی نام نہاد "بے عملی" پر نہیں بلکہ ناموافق سیاسی حالات کے علاوہ خاص طور پر ہندوستان اور

---

۱ مکاتیب اقبال
۲ ملفوظات اقبال
۳ مکاتیب اقبال

دیگر ممالک کے مسلمانوں کی پست فطرتی، مغرب زدگی، ان کی ناکارہ غیر دینی تعلیم و تربیت ان کی مذہب دشمنی حتیٰ کہ پنج ارکانِ اسلام سے بھی ان کی بیزاری پر عائد ہوتی ہے اور سب سے زیادہ ہر ملک کی اس با اقتدار ہیئت اجتماعیہ پر جو مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی پالیسی کے تعین و انضباط اور اس پر عمل درآمد کرانے کے اختیارات و وسائل رکھنے کے باوجود کچھ نہ کرتی ہو۔ نہ ہی یہ ذمہ داری اسلامی تصوف پر عائد ہوتی ہے۔ جس کا منشاء اسلام کی اخلاقی و روحانی بنیادوں پر مسلمانوں کی تربیت کرنا ہے۔ کیونکہ زندگی کی اخلاقی اور روحانی بنیادیں ہی انسان کی معنوی و روحانی ترقی کی ضامن ہیں، اور انھیں نائب حق بنا سکتی ہیں۔

جن "صوفیوں" کا کردار مذکورہ بنیادوں پر قائم نہ ہو دراصل وہ صوفی ہی نہیں ہوتے نہ ان کے غلط کردار کی وجہ سے تصوف یا صوفیائے کرام پر اعتراض عائد ہو سکتا ہے۔

خود علامہ اقبال نے اپنی زندگی کو صوفیائے کرام ہی کے اخلاق حسنہ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے اور جا بجا اشعار میں اس کا ذکر کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں :۔

پر سوز و نظر باز و نکوبین و کم آزار
آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند

ہر حال میں میرا دل بے قید ہے خرم
کیا چھینے گا غنچہ سے کوئی ذوق شکر خند

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند

Marfat.com

ان میں اور اسی قسم کے دیگر اشعار میں جو اوصاف بیان ہوئے ہیں۔ وہ صوفیائے کرام ہی کے ہیں۔ غیر صوفی حضرات کے نہیں۔ علاوہ بریں ڈاکٹر صاحب کے اخلاق و عادات کی نہایت عمدہ تصویر جو حیاتِ اقبال کے ساتویں باب میں کھینچی گئی ہے۔ اُسے ملاحظہ فرما کر فرمائیے کہ اس میں وہ کونسے خد و خال ہیں۔ جن میں صوفیائے کرام کے اخلاق و عادات کا حُسن نمایاں نہیں ہے۔ اور وہ کون سی خصوصیت ہے جسے سلف صالحین اور اولیاء اللہ ہی کے اخلاقِ حسنہ کا پرتو نہیں کہا جا سکتا۔ قلندری جس کے اقبال اس قدر شیدا ہیں۔ کن حضرات کی صفت ہے۔ حضور رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت جس کا ذکر اقبال اس قدر جوش و خروش کے ساتھ کرتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ اولیاء اللہ اور صوفیاء کرام سے زیادہ من حیث الافراد یا من حیث الجماعت کسی شخص یا جماعت میں ثابت نہیں۔ حق کی اشاعت احکام الٰہی کی تبلیغ اسوۂ رسولؐ کی پابندی۔ تزکیۂ نفس، تطہیر قلب، تربیت اخلاق، اور بوقتِ ضرورت جہاد بالسیف بھی وہ اوصاف ہیں۔ جو ہمیشہ صوفیائے کرام ہی میں پائے گئے۔ اور آج بھی اس گئے گذرے دور میں جہاد کے سوا (کیونکہ اب بین الاقوامی جنگ کا دور ہے اور اس کی تنظیم ہر ملک کی حکومت کے اختیار میں ہے) یہ تمام اوصاف بیک وقت صرف صوفیائے کرام میں پائے جاتے ہیں۔ اور بوقت ضرورت دشمنان دین سے جنگ کرنے میں انشاء اللہ وہ اپنے بزرگوں کی روایات قدیمہ کو زندہ رکھیں گے۔

وہ اپنے پیروؤں سے انہی باتوں پر بیعت لیتے ہیں اور اس طرح اللہ سے ڈرنے والوں اور پاکیزہ زندگی بسر کرنے والوں کی ایسی جماعت تیار کرتے ہیں۔ جس میں اطاعت شیخ کی وجہ سے بے مثال ضبط و نظم قایم رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ملک میں اس کے خلاف بھی مثالیں موجود ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ

Marfat.com

خدا اور رسول سے ڈرنے والوں کا وجود بالکل ہی ختم ہو گیا ہے اور جماعت صوفیہ کو من حیث الجماعت مطعون کیا جائے۔ گندی سیاست، نفسانیت، خود غرضی، فتنہ انگیزی و خون ریزی وغیرہ اور دیگر رذائل قلبی سے بندگان خدا کو بچانا۔ ظالم۔ جابر اور مستبد حکمرانوں کے ظلم سے ملک کے غریب باشندوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرنا۔ ظالم بادشاہوں کے منہ پر ان کے ظلم و ستم، جَور و تعدی اور استحصال بالجبر جیسے قبیح افعال کے خلاف لعن طعن کرنا۔ انہیں عاقبت کا خوف دِلا کر افعال قبیحہ سے باز رکھنا۔ کفرستانوں میں اسلام و احسان کی تبلیغ کرنا اور حق کا نام بلند کرنا۔ وغیرہ وغیرہ[۱]۔ ان میں سے کون کون سے افعال ایسے ہیں جن کی وجہ سے تصوف، درویشی یا صوفیائے کرام کو موردِ طعن و تشنیع بنایا جائے۔ اور ان کی ایسی کوششوں کو بھی "زوال ملت" کا سبب بتایا جائے۔ جو خدا اور رسول ؐ کی مرضی کے عین مطابق۔ بنیادِ صالحہ پر تعمیر ملت کے لئے کی گئی ہوں۔ اگر بہترین انسانی صفات کا حصول اور تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ کے حکم کی تعمیل "ترقی" کے منافی ہے تو ایسی ترقی منشائے اسلام کے خلاف ہے اور اگر ایسا نہیں تو انصاف سے فرمائیے کہ مندرجہ بالا کاموں اور اصولوں میں کونسا فعل، اصول یا طریقۂ کار تھا۔ یا اب ہے جس کے باعث تصوف یا صوفیائے کرام پر "بے عملی" کا الزام لگایا جائے۔ اور وہ "ترقی پسند" ادارے کون سے ہیں (خصوصاً ہندوستان یا پاکستان میں) جو اخلاقی و روحانی اصولوں پر انسانی سیرت و کردار کی تعمیر کر رہے ہیں۔ یا کر سکتے ہیں۔

یاد رکھئے کہ ہر ملک میں حکومت کے تمام قانونی، اصلاحی اور تعزیری اداروں کے باوجود اخلاقی و روحانی بنیادوں پر انسانی سیرت کی تعمیر کے اداروں اور معلموں کا ایک خاص مقام ہے۔ اور یہ اہم فرض صرف صوفیائے کرام کی جماعت انجام

---

[۱] ان کی مزید خدمات کا ذکر "مقدمہ" اور "روحانیت اور سیاست" کے تحت دیکھئے۔

Marfat.com

دے سکتی ہے۔ علاوہ بریں معرفت الٰہی اور عشق الٰہی جو حیات اسلامی کا نصب العین ہے۔ اس سے کسی نظام حکومت کو کیا تعلق؟ اس کے لئے ہر مسلمان روحانی پیشواؤں اور روحانی نظام تربیت کا محتاج ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی

دین ہوتا ہے کتابوں سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اور علامہ اقبال فرماتے ہیں :۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب دیں از نظر
شکوہ کم کن از سپہر گرد گرد
زندہ شو از صحبت آں زندہ مرد
صحبت از علم کتابی خوشتر است
صحبتِ مردان حُر آدم گر است
مے نہ رُوید تخمِ دل از آب و گل
بے نگاہے از خداوندانِ دل
اندریں عالم نیرزی با خسے
تا نیاویزی بدامانِ کسے

معاشی و سیاسی امور

جن ممالک میں مسلمانوں کو آزادی اور سیاسی اقتدار حاصل ہے۔ وہاں معاشی اور سیاسی اصلاحات نافذ کرنا دفاعی قوت کو فروغ دینا اور بوقت ضرورت جنگ و جہاد کے فرائض انجام دینا متعلقہ مُلک کی حکومت کا فرض ہے۔ علاوہ بریں

Marfat.com

ملک کے اندر ایسے حالات پیدا کرنا اور ایسے مواقع بہم پہنچانا بھی حکومت کا فرض ہے۔ کہ مسلمان اپنی تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں کو روبہ عمل لا سکیں اور مخلص مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کر سکیں۔

حرفِ آخر

فرداً فرداً مسلمان ان تمام حقوق کی ادائیگی کے ذمہ دار ہیں جن کی تعئین خدا تعالیٰ و رسولؐ نے "حقوق العباد" اور "حقوق اللہ" کے تحت فرمادی ہے۔ ان دائروں سے باہر کوئی "عمل" اسلامی عمل نہیں کہلا سکتا۔ فرد، جماعت، حکومت ہر ایک کا دائرۂ عمل ایک دوسرے سے الگ اور واضح ہے۔ اسلامی تصوف ان میں سے کسی کو "بے عمل" نہیں بناتا۔ (ہر دائرے میں "بے عملی" کے اسباب مختلف ہوتے ہیں) تصوف تو الف سے ی تک خیر و برکت اور جہد و جہاد کی راہ ہے۔ مگر انہی کے لئے جن کی منزل مقصود خدا و رضائے خدا ہو۔

از جنبشِ ایں دریا ہر موج کہ بر خیزد
بر وادیٔ جاں آید بر ساحلِ جاں ریزد

Marfat.com

صحیح راہِ عمل

(الف) سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد ملتِ اسلامیہ کو بہت تھوڑا زمانہ ایسا ملا جس میں وہ اپنی تاریخ کو زریں بنا سکی۔ نسلی، مذہبی اور مقامی تعصبات کے پرانے نقوش پھر ابھرنے لگے۔ اور فتوحاتِ ملکی کے ساتھ ساتھ نئے نئے نزاعی مسائل نے پیچیدگیوں میں اضافہ کر دیا۔ یہاں تک کہ اسلام کا معاشی نظام صحیح معنے میں وسیع پیمانہ پر نافذ نہ ہو سکا۔ نہ قرآن وسنت کی روشنی میں مفتوحہ ممالک میں عوامی ادارے قائم ہو سکے۔ خلافتِ راشدہ کا خاتمہ بہت جلد ہو گیا اور ملتِ اسلامیہ ملوکیت اور اس کی لعنتوں میں گرفتار ہو گئی۔ افراتفری کا طوفان اس شدومد کے ساتھ اٹھا کہ اللہ کے نیک بندوں کو کنارہ کشی کے سوا کوئی دوسرا چارۂ کار نظر نہ آیا۔

اس دورِ ملوکیت کی تاریخ دنیا پرستوں کی سفاکیوں، جفا کاریوں اور خونریزیوں کی طویل داستان ہے۔ اس دور میں سرکارِ دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت اطہار، آپ کے قریب ترین اعزا واقرباء اور صحابۂ کرام اور دیگر صلحائے امت رضوان اللہ عنہم اجمعین نے جو راہِ عمل اختیار کی وہی ملتِ اسلامیہ کے لئے ان حالات میں بہترین تھی۔ اور ویسے حالات میں ہمیشہ رہے گی۔

اس کے بعد بھی عمل وردِعمل کا سلسلہ جاری رہا اور حالات بد سے بدتر ہوتے رہے۔ ملتِ اسلامیہ چھوٹے چھوٹے ملکوں یعنے جغرافیائی واحدوں اور بادشاہتوں میں تقسیم ہو گئی۔ اور پھر ان اسلامی ممالک کے درمیان بھی وہ خانہ جنگیاں ہوئیں کہ الامان والحفیظ۔

ہر ملک کا حکمران اپنے آپ کو "ظل اللہ"، "نائب حق"، "امیر المومنین"، "سلطان

المسلمین" وغیرہ کہلواتا تھا۔ اور من مانے طور پر اپنے ملک میں حکومت کرتا تھا۔ عوام کی اکثریت کچھ لاعلمی، کچھ خوف اور کچھ مصلحتِ وقت کے سبب اپنے امیر یا سلطان کے اشاروں پر اپنی جان قربان کرتی تھی۔ ان سلاطین میں جو سب سے زیادہ طاقتور ہوتا۔ "وہ خلیفۃ المسلمین" بن بیٹھتا۔ اور باقی سلاطین مصلحتاً یا محض عقیدتاً اسے روحانی پیشوا تسلیم کرتے تھے۔

تاریخ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دور کے بعد بھی ملتِ اسلامیہ اسی طرح طوفانی دور سے گذرتی رہی اور حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ مستثنیٰ شخصیتوں کے سوا ارباب اقتدار و اختیار نے کبھی تعلیمی و معاشی مسائل سے جتنی اور جیسی دلچسپی لینا چاہئے تھی نہیں لی۔ نہ اپنی سلطنتوں میں عوامی ادارے قائم کئے۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ عوام کے اندر حمیتِ دینی اور غیرت ملی کے جذبات سرد پڑ گئے۔ اور وہ ملت کے لئے زندہ رہنے کی بجائے۔ اپنی یا اپنے حکمرانوں کی ہوس پرستیوں کے لئے زندہ رہنے کے عادی ہوگئے۔ رفتہ رفتہ مسلم حکمران عیش پرستی میں ایسے مبتلا ہوئے کہ ان کے ہاتھوں سے بعض ممالک نکل گئے۔

اسی طرح جن ممالک میں غیر مسلم فرمانروا ہوئے وہاں رفتہ رفتہ محکوم مسلمانوں کے تمام اداروں اور تعلیم گاہوں کو نیز ان کے قومی اثرات و روایات کو بلکہ خود مسلمانوں کو مختلف ترکیبوں سے ختم کر دیا گیا۔ اور آج بھی یہی کیا جارہا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

Marfat.com

رُوحِ عمل

مذکورۂ بالا حالات میں ہر جگہ "عمل" کی نوعیت تو مختلف ہو سکتی ہے۔ لیکن "روحِ عمل" ایک ہی ہونا چاہیئے۔ یعنے ہر فرد کے دل میں غیرتِ ملی کا جذبہ موجزن رہے۔ اور وہ ملت کے لئے زندہ رہنا سیکھے۔ جبر و استبداد اور فسق و فجور کے مٹانے کی ان تھک کوشش کرے خواہ ایسا کرنے میں اسے حضرت امام حسین علیہ السلام کی طرح خود اپنی اور اپنے عزیزوں کی جان ہی کیوں نہ قربان کرنا پڑے۔ یہی حُریت و آزادی ہے۔ یہی مسلمان کا دین و ایمان ہے۔ یہی اصل اسلامی زندگی ہے۔ یہی خُدا و رسولؐ کی خوشنودی کی راہ ہے۔ بشرطیکہ یہ سب کچھ اللہ کی محبت میں کیا جائے۔ جو مسلمان اس نظرئے کا مخالف ہو وہ نہ مسلمان ہے نہ صوفی۔ اسلام نے معذور و مجبور مسلمان کو جہاد میں حصہ لینے سے ضرور معاف کر دیا ہے۔ لیکن نظریۂ جہاد کی مخالفت اسے بھی جائز نہیں۔ ذلت اور پستی کی زندگی بسر کرنا دوسروں کا بالخصوص فاسق و فاجر حکمران و فراعنۂ وقت کا دستِ نگر بن کر جینا موت سے بدتر اور اسلامی زندگی کے منافی ہے۔ علامہ اقبال انہی امور کے انتھک مبلغ ہیں۔ فرماتے ہیں :۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کے تجلّی زار میں آباد ہو

حدیث بے خبراں ہے تو "با زمانہ بساز"
زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

عالم ہے فقط مومن جاں باز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

Marfat.com

پختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

رزقِ خویش از نعمتِ دیگر مجو
موجِ آب از چشمۂ خاور مجو!
تا نباشی پیشِ پیغمبر خجل
روزِ فردائے کہ باشد جاں گسل
ہمت از حق خواہ با گردوں ستیز
آبروئے ملّتِ بیضا مریز!

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن
اے مسلماں مردن است ایں زیستن
مردِ حق باز آفریند خویش را
جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را
بر عیارِ مصطفیٰؐ خود را زند
تا جہانے دیگرے پیدا کند

Marfat.com

موجودہ آزاد و خود مختار

اسلامی مملکتوں کی کوتاہیاں

(ب) محکوم مسلمانوں کے مسائل و وسائل حیات آزاد و خود مختار مسلمانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن جن ممالک میں آج مسلمانوں کی حکومت ہے اور انہی کی اکثریت بھی ہے۔ وہاں عدل و انصاف قائم کرنے سے انہیں کون روکتا ہے۔ اسی طرح تمام اسلامی ممالک کا ایک اسلامی وفاق بنا کر اجتماعی دفاع قائم کر کے سیاسی معاشی امور کو اجتماعی طور پر حل کرنے اور خلق اللہ کے لئے ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے میں کون سا تصوف حائل ہے۔ آزاد اور با اختیار مسلمانوں کے لئے صحیح اسلامی ترقی کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ وہ جتنی مادی، علمی اور معاشی ترقی چاہیں کر سکتے ہیں۔ بہترین ضابطۂ حیات (قرآن و سنت) بھی ان کے پاس موجود ہے۔ پھر ان آزاد اور با اختیار مسلمانوں کی راہ میں کونسا عربی یا عجمی تصوف حائل ہے۔ اور وہ کیوں اقوام عالم میں ذلیل ہیں۔ کیوں ہر اسلامی ملک کی اندرونی حالت نازک ہے۔ کیوں مسلمان عموماً جہالت و افلاس، بداخلاقی اور فسق و فجور میں مبتلا ہیں۔ ان امور پر اگر حق و انصاف کی نظر ڈالی جائے تو ہم اسی نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ آج مسلمانوں کے قلب برباد ہو چکے ہیں۔ اور ان میں عشق الٰہی کے بجائے نفس و نفسانیت کی م جاگزین ہے۔ جب تک یہ نہ نکلے گی اور محبتِ خدا اور رسول کا غلبہ نہ ہوگا۔ نہ غیرت جوش میں آئے گی۔ نہ صحیح راہِ عمل ملے گی۔ اسلام کا اصلی منشا ف حصول ہے۔ تاکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد اس طرح ادا ہو سکیں جس چاہتا ہے۔

Marfat.com

ارشاد ربّی ہے۔

اَلْيَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ط (۲۶-۸۸-۸۹)

(جس دن کہ مال اور اولاد کام نہ آئیں گے۔ مگر وہ شخص جو اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر آیا۔)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے:-

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا ط (۹۱-۹-۱۰)

(بے شک جس نے اس کا یعنے اپنے قلب کا تزکیہ کیا۔ اس نے فلاح پائی۔ اور جس نے اسے خراب کر دیا۔ وہ نقصان میں رہا۔)

پس صحیح راہِ عمل تزکیۂ نفس ہے جس کا دوسرا نام تصوف یا طریقت ہے۔ اس کے بغیر نہ مسلمان مؤمن بن سکتا ہے۔ نہ اس کا کوئی کام خدا کے لئے ہو سکتا ہے۔ نہ ملتِ اسلامیہ کو عروج حاصل ہو سکتا ہے۔ خلوص نیت اور سلامتی قلب پر دونوں جہان کی نعمتوں کا انحصار ہے۔

(ج) مسلمانوں کا دوسرا امتیازی نشان اللہ کی عبادت ہے۔ جو اس طریقہ سے کی جائے۔ جسے اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین رسول صلے اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضؓ نے اختیار کیا۔ کیونکہ عبادت اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری و شکر گذاری کی خاص علامت ہے۔ [1]

یاد رہے کہ عبادت اور خدا و رسولؐ کی محبت ہی ایسے امور ہیں جن میں غلو جائز ہے۔ اصحابِ صفہ رضؓ رسول اللہ کے زمانے میں موجود تھے۔ وہ آپ کی موجودگی میں ہر

---

[1] جب آنحضرتؐ سے کہا گیا۔ کہ آپ محبوب حق ہیں۔ آپ کو شب بیداری اور عبادت گزاری کی کیا ضرورت ہے؟ تو آپ نے فرمایا۔ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ ۱۲

وقت مسجد نبویؐ میں بیٹھے رہتے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے انہیں دنیا کے کسی دوسرے کام سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اور حضور ختمی مرتبتؐ ان پر فخر فرماتے تھے۔ اگر کسی شخص یا جماعت کو عبادت میں اتنا ہی غلو پسند ہو تو اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ خود محبوبِؐ خدا کے پائے مبارک شب میں قیام کی وجہ سے متورم ہو جاتے تھے۔ مردانِ حق وہی ہو سکتے ہیں۔ جنہیں رسول پاک صلے اللہ علیہ وسلم سے عشق ہو اور جو آپ کی اتباع میں ایک طرف دنیا کی طاغوتی طاقتوں کو للکار سکتے ہوں اور دوسری طرف قربِ حق کی منزل پر بھی فائز ہوں۔ صوفیائے کرام کا مسلک بالعموم یہی ہے۔ وہ ملوکیت کی لعنتوں سے اپنے دامن کو ملوث نہیں کرتے۔ لیکن جبر و استبداد کو ہمیشہ للکارتے ہیں۔ اور وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ط[1] (۷۳-۸) پر بھی پورے انہماک کے ساتھ عمل پیرا رہتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ پہلے مذکور ہوا۔ اگر زندگی کی کسی منزل میں کسی شخص کو صرف توجہ الی اللہ میں غلو، انہماک، یا کلی استغراق پیدا ہو جائے۔ تو وہ عین قرآن و سنت کے مطابق ہے اور اس پر ہرگز کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ جب اصحاب صفہؓ کی کثرتِ عبادت و استغناء پر آنحضرتؐ کو اعتراض نہ تھا تو دوسرا کس شمار میں ہے۔ علامہ اقبال اپنے فلسفۂ خودی کے تحت اس کا ذکر نہیں کرتے۔ لیکن "فقر و قلندری" کے تحت اس کی طرف اشارات موجود ہیں۔

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدریؓ تجھ میں نہ استغناءِ سلمانیؓ
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغناء میں معراجِ مسلمانی

---

[1] ترجمہ:۔ اور ہر طرف سے منقطع ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جا۔

Marfat.com

(۷)

عشق

Marfat.com

۷۸۶

كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِياً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ (حدیث قدسی)

ترجمہ:-

تھا میں ایک خزانہ مخفی۔ پس چاہا میں نے کہ پہچانا جاؤں۔ پس خلق کیا میں نے مخلوق کو۔

Marfat.com

عشق

ہست بے صورت جناب قدس عشق
لیک در ہر صورتے خود را نمود
(جامیؒ)

صوفیائے کرام نے اپنے نظریۂ عشق کی توضیح میں ہزاروں اشعار اور متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ اقبال کے مرشد معنوی عارف رومیؒ کی مثنوی کا اہم ترین موضوع بھی عشق ہی ہے۔ جس کی مختلف کیفیات کو وہ ہزاروں طرح بیان کرتے ہیں۔ اُن کے یہ اشعار کافی مشہور ہیں۔

مرحبا! اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علّت ہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما
اے تو افلاطون و جالینوسِ ما
جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد
کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق آں شعلہ است کوچوں بر فروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت
در نگنجد عشق در گفت و شنید
عشق دریائیست قعرش ناپدید
شرحِ عشق ار من بگویم بر دوام
صد قیامت بگذرد آں ناتمام

Marfat.com

ملتِ عشق از ہمہ دینہا جُداست
عاشقاں را مذہب و ملت خُداست (رومیؒ)

لیکن ان بزرگوں کا عشق وہ عشق نہیں ہے۔ جسے عرف عام میں بوالہوسی کہتے ہیں۔ بلکہ وہ اعلیٰ ترین عشق ہے جو خدا سے کیا جاتا ہے۔ وہی ان کا مذہب و مشرب ہے۔

ان کا نظریۂ عشق بے حد وسیع ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کا ظہور عشق کی بدولت ہوا۔ اس کا قیام عشق کی بدولت ہے۔ انسان عشق کی بدولت ہی بنا اور اس کا عروج روحانی معنوی بھی عشق ہی کی بدولت جاری رہتا اور تکمیل کو پہنچتا ہے گویا وحدت حقیقی نے عشق کی بدولت کثرت کا جامہ اختیار کیا۔ اس جامے کے تار پود بھی عشق کی بدولت برقرار ہیں اور کثرت سے وحدت کی طرف رجوع کرنے اور واصل الی اللہ ہونے کا واحد راستہ بھی عشق ہے۔ اس کو وہ عشق حقیقی کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ انسان میں صحیح ذوقِ معرفت پیدا کرتا، ذمائم سے اس کا تزکیہ کرتا۔ زوال سے کمال کی طرف بڑھاتا، اور بالآخر اس حقیقت اعلیٰ سے واصل کرتا ہے جو جامع جمیع کمالات ہے۔

جب تک عشق حقیقی نہ پیدا ہو انسان اپنے آپ کو نہیں پاتا۔ نہ خدا کو پاتا ہے۔ کیونکہ اپنی شناخت دریافت ہی خدا کی شناخت دریافت ہے۔ لیکن صوفیائے کرام کے نظریے کے مطابق یہ عُقدہ عقلِ استدلالی سے حل نہیں ہوتا عقل استدلالی سے انسان توحید عقلی تک تو پہنچ جاتا ہے۔ توحید حقیقی تک عشق حقیقی ہی پہنچا سکتا ہے۔ اللہ خود اپنے مخلص بندوں کا عاشق ہے۔ اگر وہ اس کی طرف ایک قدم چلتے ہیں۔ تو وہ تعالیٰ ان کی طرف دس قدم چلتا ہے۔ حضرت غوث الاعظم قدس سرہٗ کے الہامات میں سب سے پہلا الہام یہ ہے:۔

نِعْمَ الطَّالِبُ انا وَ نِعْمَ الْمَطْلُوبُ الْاِنْسَانُ

Marfat.com

یعنی بہترین طالب میں ہوں اور بہترین مطلوب انسان ہے۔

یہ شرف انسان کو اس لیے حاصل ہوا کہ وہ اللہ کے اسماء و صفات اور اس کے حسن و جمال کا بہترین آئینہ ہے۔

صوفیائے کرام کے نظریۂ عشق کے مطابق آسمان و زمین، شمس و قمر، شجر و حجر حتی کہ ذراتِ عالم تمام عشق کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اور ان میں عشق ہی کی بدولت نظام قائم ہے۔ ان کے نظریے کے بموجب کائنات کے ذرہ ذرہ میں زندگی ہے۔ اور ہر شئے خدا کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہے البتہ ہم نہیں سمجھتے۔ قرآن پاک میں صاف طور پر اس کا ذکر موجود ہے۔ اس زندگی کے مدارج میں البتہ تفاوت ہے۔ جملہ اشیاء رُوح ہی کے مظاہر ہیں اور روح کی حقیقت خدا ہے۔ خدا سے روح کی دوری روح کے اضطراب کا باعث ہے۔ اور وہ اپنے اصل کی طرف رجوع کرنے کے لئے بے تاب رہتی ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ ط

یہ اضطراب بھی عشق ہی کا نتیجہ ہے۔

صوفیائے کرام نے نور کے معنے ہستی کے کئے ہیں جس سے مابہ الموجودیت مراد ہے۔ ہم نور کہیں یا روح اس کی حقیقت دراصل فہم انسانی سے بالاتر ہے۔ پس یہ سمجھ لیا جائے۔ کہ جس شئے کو اس نور مطلق یا روح اعظم سے جتنا حصہ ملتا ہے۔ اتنی ہی وہ صفات الٰہیہ کی حامل اور ذات خداوندی کے قریب ہوتی ہے۔ لوہا جس قدر آگ کی صفات کو اپنے اندر جذب کرے گا۔ اسی قدر وہ آگ سے قریب ہوگا۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ انسان کو اللہ کے اسماء و صفات اور اس کے حسن و جمال کے قبول کرنے کی صلاحیت تمام مخلوق سے زیادہ عطا ہوئی۔ اسی لئے اسے "اشرف المخلوقات" اور بہترین محبوب و مطلوب خدا بننے کا شرف حاصل ہے۔ لیکن وہی انسان اس شرف

Marfat.com

کا حامل ہو سکتا ہے۔ جس کی عبادت و عبدیت جس کی جد وجہد اور جس کی موت و زندگی سب کی بنیادیں عشق حقیقی پر قائم ہوں اور سب کا مقصدِ واحد محبوب حقیقی کے وصال کی خواہش ہو۔ (انسان کا قرآنی تصور باب منلہ میں دیکھئے)

یہاں صوفیائے کرام کے نظریۂ عشق کے تحت ان کے تصور فنا و بقا، کی بابت کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ ان کی "فنا" "بقا" کے لئے ضروری ہے بقا ہی نہیں بلکہ وسیع معنے میں ارتقاء کے لئے ضروری ہے۔ لیکن ان کا ارتقاء ڈارون کا ارتقاء نہیں ہے۔ ان کے نظریے کے بموجب اللہ پاک نے اس رُوح کو جس کے لئے "احسن تقویم" ارشاد ہوا ہے اور جسے وہ "اپنی رُوح" فرماتا ہے۔ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (۱۵-۲۹) اپنی خاص مصلحت کی بنا پر اَسْفَلَ السَّافِلِيْنَ کے درجے میں پھینک دیا۔

صوفیائے کرام اس منزل سے "عالم جمادات" مراد لیتے ہیں اور اسے حیات یا رُوح کا سب سے نیچا درجہ قرار دیتے ہیں (اب تو اہل سائنس بھی یہ تسلیم کرنے لگے ہیں۔ کہ مادہ روح ہی کی ایک شکل ہے) بہرحال ان کے یعنے صوفیائے کرام کے نظریے کے بموجب کائنات میں سلسلۂ ارتقاء اس طرح جاری ہے کہ جمادات فنا ہو کر نباتات کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ نباتات حیوانات میں جذب ہو کر ارتقاء پاتی ہیں اور حیوانات و نباتات انسانی غذا کی شکل میں انسان کا جزو بنتے ہیں۔ اور یہی ان کا ارتقاء ہے۔

یہ قانون فطرت کائنات میں جاری و ساری ہے۔ اس سے انسان کس طرح مستثنیٰ رہ سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی ارتقاء بھی یہی ہے کہ وہ عشق حقیقی کے ذریعہ ذاتِ حق میں فنا ہو جائے۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ (۲-۱۵۶)

ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اسے اس عالم سے گذرنا اور یہ سفر ارتقاء پورا کرنا ہے۔ انسان ہی نہیں، ہر شئے

Marfat.com

انسان میں سے ہوتی ہوئی اسی راہ پر گامزن ہے۔ اور جب تک اللہ تعالےٰ چاہے رہے گی۔ یہ صرف انسان ہے۔ جو سرکشی کرکے مقررہ راستہ چھوڑ دیتا ہے۔ اسی لئے عذاب کے راستے پر ڈالا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اللہ کی مرضی پوری ہو۔[۱]

اللہ تعالےٰ ہر شخص کو اسلام پر پیدا کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنے آباد و اجداد کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔ لیکن بعد میں اگر وہ عقل سلیم سے کام لے تو پھر صحیح راستہ اختیار کرتا۔ اور حسب توفیق ایزدی اسی پاک ذات سے عشق و محبت کے رشتے جوڑتا اور اسی کی طرف بڑھتا ہے۔

عشق سے اسرارِ حیات کھلتے اور انسان وحی و الہام کا حامل بنتا ہے۔ اب سلسلۂ وحی ختم ہو چکا ہے۔ البتہ کشف و الہام کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ منزلِ عشق اور اس کی برکتیں جواب صرف مدارج اولیاء اللہ اور شہدائے کرام کی صورتوں میں ظاہر ہو سکتی ہیں۔ عقل استدلالی اور علم ظاہری سے ماوریٰ ہیں (تملاف نہیں)

---

۱ واضح ہو کہ اصل انسان روح اعظم یا نفس ناطقہ ہے جس کا مرکب نفس حیوانی یا نسمہ ہے۔ روح حیوانی لطیف خون کے ابخرات سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا مرکب جسم خاکی ہے۔ موت عرفی کے بعد روح حیوانی ختم ہو جاتی ہے۔ یعنے بالعموم اس دنیا میں اس کا وجود اور کام ختم ہو جاتا ہے۔ اور جسم کے عناصر اپنے مبداء اصلی کی طرف لوٹتے۔ اور روح اعظم اپنے مبداء اصلی کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اس طرح روح اعظم جو جوہر نورانی ہے۔ باقی رہتی ہے۔ اور اس کے ساتھ حس و ادراک اور شعور و تمیز بھی نہایت لطیف حالت میں باقی رہتے ہیں۔ اسی لئے عالم برزخ میں دنیاوی اعمال کے مطابق سزا کی تکلیف اور انعاماتِ الٰہیہ کی لذتیں محسوس ہوتی ہیں۔ اس میں کافر و مومن سب شریک ہیں۔ لیکن کبھی پاک روحوں کا اثر جسم خاکی تک بھی پہنچتا ہے اور وہ (باقی صفحہ ۲۴۷ پر)

Marfat.com

اس لئے انکا مقابلہ عشق سے مختلف طور پر کیا جاتا اور ان پر عشق کی فضیلت ثابت کیجاتی ہے۔
واضح رہے کہ صوفیائے کرام علم وعقل کو بالکل ہی مسترد نہیں کرتے بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ ہر سطح حیات پر نیز مختلف شعبہ ہائے حیات میں علم وعقل کے درجات مختلف ہوتے ہیں جہاں ان سے کام لیا جانا ضروری ہے۔ ایک سطح حیات یا ایک درجۂ حیات کی عقل اس سے اعلیٰ تر سطح حیات پر پوری طرح کام نہیں آتی۔ اسی طرح جہاں عشق کی ضرورت ہے وہاں عقل استدلالی کام نہیں آتی۔ عشق کے ابتدائی مدارج مثلاً احکامِ شریعت تزکیۂ نفس، معرفت کے طریقے اور توحید علمی کی تفصیل معلوم کرنے اور سمجھنے کے لئے علم وعقل اشد ضروری ہے۔ عشق کی اعلیٰ منزلوں میں البتہ ان سے کام نہیں چلتا جو اشخاص صرف محسوسات کے خارجی صفات میں اُلجھے رہتے ہیں اور اسی کو مقصودِ حیات سمجھ لیتے ہیں۔ ان کی مثال اہل دل کے مقابلہ میں اس شعر کے مصداق ہوتی ہے۔

بو علی اندر غبار ناقہ گم
دستِ رومیؒ پردۂ محمل گرفت

معراج سرکارؐ دوعالم بھی عشق کا ایک کرشمہ تھا جس کی بدولت آپ مادی عالم اور زمان ومکان سے آن کی آن میں گذر گئے۔ معراج اوپر جانے یا نیچے آنے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ عروج باطنی معنوی ہے۔ عالم احدیت سے واصل ہوتا ہے ؎

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۶:- گھنا سڑتا نہیں۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام، اولیاء کرام اور شہدائے عظام کے اجساد سے ظاہر ہوا ہے۔ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کا تو عجیب وغریب حال ہے۔ انہیں پیکر نورانی کے علاوہ اللہ کے ہاں ہر قسم کا آرام و عزت حاصل رہتی ہے۔ بعض حضرات نے کہا ہے کہ نسمۂ سابق سے بھی ان کا عجیب تعلق باقی رہتا ہے۔ اور اس نورانی صورت کو بھی جسمانی صورت کے ساتھ مشابہت حاصل رہتی ہے۔ انہیں اللہ کے پاس سے رزق بھی دیا جاتا ہے۔ ان کے (باقی صفحہ ۲۴۸ پر)

Marfat.com

عشق نے بالا و پستی رفتن است
عشقِ حق از جنس ہستی رستن است

تصوری فلاسفر برگساں اپنے اور غیر مسلم دنیا کے خیال میں گویا بہت دور کی کوڑی لایا ہے جو یہ کہتا ہے۔ کہ اصل حقیقت ارتقاء پسند حیات ہے۔ اور اس تک عقل کے ذریعہ نہیں بلکہ وجدان یا عشق کے ذریعہ پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے نظریے سے دنیائے فلسفہ میں انقلاب برپا ہو گیا ہے۔ اس کی تعریف میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دئے گئے اور کئے جا رہے ہیں۔

لیکن ہمارے آقا و سردار مخبر صادق صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک مختصر حدیث قدسی
كُنْتُ كَنْزاً مَخْفِيًّا فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُكَ يَا مُحَمَّدُ (يا فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ ط)
نے ظہور حیات و کائنات اور عشق و عرفان کی بابت صدیوں پہلے اور برگساں سے کہیں زیادہ اسرار فاش کر دئے ہیں۔ لیکن انہی کے لئے جو غور کرتے اور ایمان لاتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴۷ :- متعلق باری تعالے کا ارشاد ہے :-
وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ (اور جو اللہ کی راہ میں شہید ہوتے ہیں، انہیں مردہ نہ کہا کرو۔ بلکہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تم نہیں سمجھتے)
یہ پاک نفوس بارگاہ قدس میں جہاں تک چاہتے ہیں طیران کر کے ترقی کرتے ہیں۔ اور جب چاہتے ہیں اس عالم کی طرف بھی نزول کرتے ہیں۔ کبھی لوگوں کو نظر بھی آجاتے ہیں۔ بخاری اور مسلم کی ایک حدیث سے ثابت ہے کہ شہدائے کرام کے اعمال حسنہ کا سلسلہ بھی موت ظاہری کے بعد جاری رہتا ہے۔ (دیکھو تفسیر حقانی آیۂ مذکورہ بالا)

Marfat.com

خدا کا "کنز مخفی" ہونا۔ اس پوشیدہ دولت کا کائنات کی صورت میں ظہور یعنے "ذات محمدیؐ" کے توسّل سے کائنات کا ظہور" حق تعالیٰ کا اول و آخر، ظاہر و باطن ہونا۔ اس کا جامع جمیع صفات ہونا۔ بالقوّۃ بھی اور بالفعل بھی۔ ظہور کے لئے صفت عشق کا امام بننا پھر اسی کی بدولت تمام صفات کا کائنات کی شکل میں ظہور و برقراری یعنے قیامت تک کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِیْ شَاْنٍ کا ثبوت "حقیقتِ محمدی کا قرب الی اللہ ہونا عاشق کے لئے مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کی شاہراہ یعنی ارتقائے حقیقی معنوی کا وقوع ذاتِ گرامی محمدؐ صلے اللہ علیہ وسلم میں فنا ہو کر ممکن ہونا[1]......

.....غرض کہ وہ کیا ہے جو اس مختصر حدیث قدسی میں نہیں ہے۔

برگساں اور اس کے ہم نوا صرف "تخلیق" تک پہنچے (وہ بھی کن فیکونی نہیں) وہ خالق حقیقی کی حیّ و قیوم ذات پر ایمان لانے کے۔ بجائے تخلیق عالم کو محض "حیات" سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ "حیات" کہاں سے اور کس طرح آگئی۔ انہیں اس کی خبر نہیں کہ عالم تخلیق کے علاوہ عالم امر بھی ہے۔ "روح" سے اہل فلسفہ کی مراد عموماً رُوح حیوانی ہے۔ اور ان کا ارتقاء بھی ارتقاء جسمانی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ انسان کی حقیقت کیا ہے۔ وہ کدھر جا رہا ہے۔ اس کی حد پرواز کیا ہے۔ اور اس کے سفر کی درمیانی منازل کیا ہیں وغیرہ وغیرہ[2]

بہرحال وہ آگے نہیں بڑھ سکتے جب تک اولیاء اللہ کی تعلیمات و تصریحات پر ایمان نہ لائیں۔ کیونکہ اولیاء اللہ کا علم و شعور ان فلسفیوں کے علم و شعور سے بہت آگے ہے۔ برگساں نے مذہب و اخلاقیات کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ انبیاء و اولیاء کے علم و شعور کو عام انسان کے علم و شعور یعنے "عقل استدلالی

---

۱ کیونکہ جو صورت نزول کی ہے۔ وہی عروج کی ہونا چاہیئے۔

۲ مزید تفصیل کے لئے "حقیقت انسانیہ کی جانب سائنس و فلسفہ کی رہنمائی" دیکھیے۔

Marfat.com

سے کہیں بہتر و برتر سمجھتا ہے۔ عجب نہیں کہ اس نے اپنا نظریۂ وجدان و عشق اولیاء اللہ کے نظریۂ عشق ہی سے لیا ہو۔ کیونکہ وہ اسے اصل روحانیت اور ولایت و نبوت کا جوہر قرار دیتا ہے۔

اقبال کا نظریۂ عشق

اقبال ابتداء میں داغ کے نظریۂ عشق کے مداح تھے۔ جیسا کہ ان کے مرثیہ داغ کے اس شعر سے معلوم ہوتا ہے :۔

ہو بہو کھینچے گا اب اس عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

لیکن فکر میں بلندی اور وسعت پیدا ہو جانے پر جبکہ انہوں نے عارف رومیؒ کو اپنا مرشد معنوی بنایا۔ ان کا عشق صوفیائے کرام کے عشق میں تبدیل ہو گیا۔ اور پھر انہوں نے اس امر کا اظہار جا بجا اپنے اشعار میں کیا۔ کہ حیات و کائنات کی تکوین، بقاء اور ارتقاء سب کا ضامن عشق ہے

اس عقیدے کی تفصیل وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے۔ لہذا اب اعادہ غیر ضروری ہے۔ صرف اقبال کے چند اشعار بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ سطور بالا سے مطابقت معلوم کرنے میں آسانی ہو۔ [1]

وہ ضرب کلیم میں فرماتے ہیں :۔

عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات

---

[1] یہاں یہ بتانا مقصود نہیں کہ اقبال کا نظریۂ عشق کن مراحل سے گزرا ہے۔ لہذا اشعار کی ترتیب میں زمانہ کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ نہ ان کی تمام تصانیف سے مثالیں لی گئیں۔

علم مقام صفات عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُم الکتاب

بالِ جبریل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

کبھی تنہائی کوہ و دمن عشق
کبھی سوز و سرور و انجمن عشق
کبھی سرمایۂ محراب و منبر
کبھی مولا علیؓ خیبر شکن عشق

محبت خویشتن بینی محبت خویشتن داری
محبت آستانِ قیصر و کسریٰ سے بے پروا

Marfat.com

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں
کہ بر فتراکِ صاحب دولتے بستم سرِ خود را
وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

اِک شرعِ مُسلمانی اک جذبِ مُسلمانی
ہے جذبِ مُسلمانی سرِّ فلک الافلاک

خرد نے مجھ کو عطا کی نظرِ حکیمانہ
سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

مقامِ عقل سے آساں گذر گیا اقبال
مقامِ شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام
عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفےٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تابناک

Marfat.com

عشق صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہہ حرم عشق امیر جنود
عشق ہے ابن السبیل اسکے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات
عشق سے نور حیات عشق سے نار حیات

ابھی کلام اقبال سے سینکڑوں اشعار اسرار عشق کی وضاحت کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں۔لیکن بخوف طوالت اس سے احتراز کیا جاتا ہے۔اس سلسلے میں بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔

اول یہ کہ اقبال نے بعض جگہ حیات اور اس کی تخلیقی ارتقاء کا ذکر برگساں کے انداز میں کیا ہے۔ اس لئے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ وہ برگسان کی ہم نوائی کر رہے ہیں۔ اور ان کا فلسفہ عشق بھی برگسان کے نظریات سے ماخوذ ہے۔لیکن ہمیں یہ نتیجہ نکالنے کا کوئی حق نہیں ہے ۔ کیونکہ اقبال نے خود اسکی تردید کی ہے۔اور ہیگل اور برگسان وغیرہ کے فلسفوں کو ہیچ قرار دیا ہے۔ ممکن ہے کہ خود برگسان جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے ۔ اپنے نظریہ کی تشکیل میں بہت بڑی حد تک صوفیائے کرام کے نظریۂ عشق سے متاثر ہوا ہو۔ اصطلاح "عشق" تو یقیناً اس نے تصوف اسلام ہی سے لی ہے ۔ اور یہ خیال بھی کہ حقیقت حیات تک عقل کے ذریعے نہیں بلکہ وجدان کے ذریعے پہنچ سکتے ہیں۔ عشق کو وہ اصل روحانیت اور ولایت و نبوت کا جوہر قرار دیتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار اس سے بہت پہلے ہمارے صوفیائے کرام اپنی کتابوں میں کر چکے ہیں۔ بلکہ انہوں نے اس سے کہیں زیادہ باریک نکتے بیان کئے ہیں۔ لہذا یہ باور کرنے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ برگسان نے مذہب و اخلاق ، ولایت و نبوت اور بذریعہ وجدان حقیقت حیات تک پہنچنے کی بابت اپنے خیالات مرتب کرنے کے سلسلے میں ہمارے صوفیائے کرام کی کتابوں

Marfat.com

یا ان کے تراجم کا مطالعہ نہیں کیا۔ نہ ان سے متاثر ہوا۔ بالخصوص جبکہ وہ ان امور میں زیادہ تر انہی کا ہم خیال ثابت ہو رہا ہے۔ اس قسم کی غلط فہمیوں کے سد باب کا بہترین طریقہ یہی ہے۔ کہ اللہ کی باتوں کو اللہ والوں ہی کی زبان میں بیان کیا جائے۔ فلسفہ کی راہ وحی و نبوت اور ولایت کی راہ سے مختلف ہے۔ ہاں فلسفہ اگر مسلمان ہو جائے تو فلسفہ نہیں رہتا۔

رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا۔ کہ شیطان ہر شخص کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ ایک صاحب نے ذرا جرأت کر کے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ کے ساتھ بھی؟ آپؐ نے جواب دیا۔ ہاں۔ میرے ساتھ بھی لیکن میں نے اُسے مسلمان کر لیا ہے۔

دوسری بڑی غلط فہمی یہ ہے۔ کہ قرآن پاک میں اصولوں کی بجائے اصطلاحات تصوف اور عصر حاضر کے تقاضوں کے بموجب تفصیلات تلاش کی جاتی ہیں۔ اور نہ ملنے پر سمجھ لیا جاتا ہے۔ کہ صوفیائے کرام نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ غیر قرآنی یا غیر اسلامی ہے۔ لیکن معترضین یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ تفسیر قرآن۔ تدوین حدیث وفقہ۔ اسماء الرجال علم تجوید۔ تدوین فقہ و تصوف اور ان کے ہزار ہا اصطلاحات وغیرہ سب کچھ بعد کی پیداوار ہے۔ ابتدائے زمانہ اسلام میں صرف سرور کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس ایمان و عقائد کا مرکز اور براہِ راست اکتسابِ نور روحانیت کا سرچشمہ تھی۔ صحابۂ کرامؓ کا جذبۂ عمل بے چون وچرا اس مرکز اصلی کے گرد گھومتا تھا۔ اور وہ اپنے علم وعرفان کے سلسلے میں اسی سرچشمۂ روحانیت سے سیراب ہوتے تھے۔ ان کی پر خلوص اطاعت خالص عشق رسولؐ پر مبنی تھی۔ "کیوں" اور "کس لئے" سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ قلبِ رسولؐ کے راست اثرات اور آنحضورؐ کی صحبت با برکت نے ان کے قلوب کو اس طرح منور فرمایا تھا۔ اور اسرارِ حیات و معارف الٰہیہ اس طرح ان پر منکشف فرما دیئے تھے کہ انہیں استدلال یا اکتسابی علم کی ضرورت

Marfat.com

ہی نہ تھی۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا۔ ہر چیز کی تدوین و تفصیل کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس طرف حسب اقتضائے زمانہ توجہ کی۔ علمائے ظاہر نے اپنی کوششیں قالِ رسولؐ تک محدود رکھیں۔ لیکن علمائے طریقت اور اولیاء کرام نے قالِ رسولؐ کے علاوہ حالِ رسولؐ و قلبِ رسولؐ سے بھی اپنا رابطہ مضبوط رکھا۔ اس طرح جو کچھ جسے معلوم ہوا۔ ہر زمانے میں عوام و خواص کو بقدر ضرورت و استطاعت بتاتے رہے۔ اب اس ضخیم ذخیرہ معلومات کو جو صدیوں میں فراہم ہوا ہے۔ نظرانداز کر کے جزئیات یا تفصیلات کو صرف قرآن پاک میں تلاش کرنا مہمل سی کوشش ہے۔

آخر ہزارہا علمائے اسلام بالخصوص اولیاء کرام کے صدیوں کے مساعی جمیلہ اور ان کے مکشوفات کو اسلام سے کس طرح خارج کیا جا سکتا ہے؟

"مکشوفات" کے لفظ پر شاید "چار پائے بر و کتابے چند" کے مصداق "ذی علم" حضرات چونک پڑیں اور فرمانے لگیں۔ کہ قرآن و سنت کے ہوتے ہوئے مکشوفات یا ملفوظاتِ اولیاء کے حوالوں کی کیا ضرورت ہے۔ گویا قرآن و سنت میں اُنکے نزدیک "کشفِ صدر" اور "علم لدنی" کا کہیں ذکر ہی نہیں ہے۔ اور اولیائے اسلام کے اقوال و ارشادات گویا قرآن و سنت سے بے تعلق ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اولیاء اللہ کی روحانی قوت اور ان کے مکشوفات و ملفوظات کو قرآن و سنت سے باہر کیوں سمجھا جائے۔

عصر حاضر میں جب کہ مادّہ پرست بھی اس بات کے قائل ہیں کہ مادّہ کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے بلکہ وہ رُوح ہی کی ایک غیر ترقی یافتہ شکل ہے۔ جب کہ اہل فلسفہ عقل منطقی پر الہام و وجدان کو ترجیح دیتے ہیں۔ درحیب کہ یورپ میں ارواح سے رابطہ پیدا کرنے کے تجربات کامیاب ہو چکے۔ ہماری مُلّائی ذہنیت کشف و الہام

Marfat.com

اور نورِ ولایت کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

ایسی تنگ ذہنیت والے حضرات کو یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ حواسِ ظاہری کے علاوہ انسان کے اندر حواس باطنی بھی ہیں۔ جن کے ذریعے ہستی کے وہ پہلو ظاہر ہوتے ہیں۔ جن کے انکشاف و ادراک سے انسان کے حواسِ ظاہری قاصر ہیں۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن کی فراست سے ڈرو۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔ یہ نورِ بصیرت نبیؑ اور ولی کی ذات میں کمال حاصل کرتا ہے۔ اور وہ ایسے ایسے اسرار الٰہی کی خبر دیتے ہیں۔ جنہیں معمولی شخص کی عقل یقین نہیں کرتی۔ معمولی شخص کیا ظاہری علم رکھنے والوں کی استدلالی عقل بھی انہیں سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ عارف رومیؒ فرماتے ہیں۔

آئینۂ دل چوں شود صافی و پاک
نقش ہا بینی بروں از آب و خاک

روزنِ دل گر کشا دست و صفا
می رسد بے واسطہ نورِ خدا

انہوں نے پوری مثنوی میں ان نکات کو مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے جنہیں شوق ہو مثنوی شریف اور اس کی شرحوں کی جانب رجوع کریں۔

امام غزالی علیہ الرحمتہ نے اپنی مشہور کتاب احیاء العلوم میں علم مکاشفہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور اسی کو وہ "علم نافع" قرار دیتے ہیں۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں۔ کہ انبیاء و اولیاءؒ کے لئے بیداری کی حالت میں عالمِ غیب کے حقائق منتش اور مصور ہو جاتے اور ان سے باتیں کرتے ہیں۔ اور اس طرح ان سے کسی شی کی حقیقت پوشیدہ نہیں رہتی۔ حضرت ابو سعیدؒ ابوالخیر اور بو علی سینا کی ملاقات کا قصہ کافی مشہور ہے۔

Marfat.com

بو علی سینا حکیم تھے۔ مگر صوفیائے کرام کے نظریۂ کشف کے منکر نہ تھے۔ انہوں نے دلائل عقلی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ارواحِ قدسیہ میں اسرارِ غیب منعکس ہو سکتے ہیں دیر تک وہ اسی سے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرتے رہے۔ آخر میں حضرت ابو سعید ابو الخیرؒ نے فرمایا کہ "ہر چہ تو میدانی من می بینم" بس یہی فرق حکیم اور صوفی میں رہتا ہے حکیم علم کی مدد سے جانتا ہے اور صوفی (اہل دل) حقیقت کو دیکھتا ہے اقبال نے بھی عقل و دل کے مکالمے میں یہی فرمایا ہے۔ جب عقل اپنے اوصاف بیان کر چکی تو دل نے اس سے کہا۔

رازِ ہستی کو تو سمجھتی ہے

اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں

مختصر یہ کہ اولیاء اللہ اور اکابر صوفیہ کے ارشادات و ملفوظات اسی لئے صحیح ترین تفسیر قرآن و حدیث کا درجہ رکھتے ہیں کہ وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی ترقی یافتہ قوتِ روحانی کی مدد سے اپنے قلب کو قلب نبوی صلعم سے مربوط رکھتے ہیں۔ اور اسی مرکزِ نور سے بطور "علم لدنی" نورِ ہدایت حاصل کرتے ہیں۔ اس مقام سے ترقی کر کے وہ مقام آتا ہے جسے مشہور حدیثِ قربِ نوافل میں واضح کیا گیا ہے[1] یہی مقام، مقامِ مَا رَمَیْت ہے اور یہیں پہنچ کر بندہ بندے کے بھیس میں خدائی کرتا ہے لیکن ؎

مدعا پیدا نہ گردد ازیں دو بیت

تا نہ بینی از مقامِ مَا رَمَیْت (اقبال)

لہذا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم کو اللہ والوں کے حال و قال میں تلاش کیا جائے نہ کہ علوم ظاہری و دنیوی اور کتب فلسفہ وغیرہ میں۔ اسی لئے زمانہ قدیم سے یہی طریقہ رائج ہے۔ کہ ایسے علماء جو شمع ایزدی کے پروانے ہوتے ہیں۔ ظاہری علوم دین کی تکمیل کے

---

[1] دیکھو مقالہ "تصوف اور اقبال" ص۲۳

بعد حصولِ معرفت کے لئے اہل باطن کی طرف رجوع کرتے ہیں چنانچہ صرف ایک مثال دے کر یہ مضمون ختم کیا جاتا ہے۔

حضرت امام حنبلؒ تفسیر حدیث اور فقہ کے امام تھے۔ لیکن حضرت بشر حافیؒ کی خدمت میں گھنٹوں مؤدب بیٹھے رہتے اس پر بعض علماء اور ان کے تلامذہ نے ان سے کہا کہ آپ تفسیر و حدیث اور فقہ کے امام ہونے کے باوجود اپنا وقت ایک دیوانے کی صحبت میں کیوں برباد کرتے ہیں اس پر امام صاحب نے جواب دیا کہ جن علوم کا تم نے نام لیا ہے۔ بے شک میں انہیں حضرت بشر حافیؒ سے زیادہ جانتا ہوں۔ لیکن وہ خدا کے علم کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔

اقبال نے سچ فرمایا ہے:۔

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جسمیں حور نہیں

(۸)

بیعت واطاعت

۴۸۶

وَابْتَغُوْا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ (القرآن)
(۵-۳۵)

اور تلاش کرو اس کی طرف وسیلہ

مولوی ہرگز نہ شد مولائے رومؒ
تا غلامِ شمسِؒ تبریزے نہ شد

(رومیؒ)

Marfat.com

بیعت و اطاعت

روحانی نظامِ تربیت کی بنیادی شرطیں

ہر نظامِ تعلیم و تربیت میں خواہ وہ نظامِ تربیت جسمانی ہو یا ذہنی، سیاسی ہو یا صنعتی اخلاقی ہو یا روحانی دو چیزیں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں۔ (۱) بیعت (۲) اطاعت

بیعت سے مراد ہے۔ استادِ فن سے مکمل اطاعت کا اقرار کرنا۔ طریقت میں جان و مال خدا کے ہاتھ پر فروخت کر دینا اصل بیعت ہے۔

امور دینی ہوں یا دنیاوی جہاں تعلیم و تربیت یا استادی و شاگردی کی ضرورت ہو بیعت و اطاعت کے بغیر چارہ نہیں۔ سول محکمے ہوں یا فوجی نظام، مکاتب و مدارس ہوں یا کالج اور یونیورسٹیاں۔ صنعتی ادارے ہوں یا فنی تربیت گاہیں سیاسی انجمنیں ہوں یا معاشی ادارے۔ علما کی درسگاہیں ہوں یا فقراء کی خانقاہیں ہر جگہ کسی نہ کسی نام سے اور کسی نہ کسی شکل میں بیعت و اطاعت ہی کی بنیاد پر کام ہو رہا ہے الفاظ البتہ دوسرے ہیں لفظ "بیعت" اب صرف دینی امور بالخصوص فقر و تصوف کے لئے مخصوص ہے۔

دنیاوی شعبوں میں اطاعت کا تحریری، اور بعض اوقات حلفیہ اقرار لیا اور کیا جاتا ہے۔ لیکن طریقت میں سنت نبویؐ پر عمل کرتے ہیں یعنے تحریری اقرار لینے کے بجائے شیخ طریقت کے ہاتھ پر اقرار کرتے ہیں۔ جس کی سند قرآن پاک میں موجود ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ (۴۸-۱۰)

"یعنے بے شک جو لوگ تم سے اے محمدؐ! بیعت کرتے ہیں۔ وہ سوائے اس کے نہیں کہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے۔ اللہ کا ہاتھ اوپر ہوتا ہے ان کے ہاتھوں کے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کو اللہ نے خود اپنا ہاتھ فرمایا۔

Marfat.com

شیخ طریقت نائب رسولؐ ہوتا ہے اس لئے اس کا ہاتھ بھی خدا کا ہاتھ سمجھا جاتا ہے۔

گروہ کثیر کے نزدیک بیعت سنت ہے اور آنحضرتؐ کے زمانے سے لے کر آج تک متواتر مشائخ میں رائج ہے لیکن نفس انسانی کی ایک قسم وہ ہے جو اطاعت سے گریز کرتی ہے اور کسی قسم کی پابندی کو پسند نہیں کرتی۔ اسی کو نفس امارہ کہا گیا ہے آزاد خیالی کے موجودہ دور میں عوام الناس کی اکثریت نفس امارہ کی غلام ہے اور پابندیوں سے دور بھاگنے کی کوشش کرتی ہے سرکاری احکام سے مجبور ہو کر اور فوری سزا کے خوف سے لوگ عموماً قانون وضابطہ کی اطاعت کرتے ہیں اور ملازمین اپنے افسروں کا حکم مانتے ہیں۔ لیکن جہاں کوئی سرکاری حکم نہ ہو۔ جہاں فوری سزا کا خوف نہ ہو۔ جہاں ملازمت جانے کا اندیشہ نہ ہو اور جہاں معاشرے کی گرفت ڈھیلی ہو وہاں نفس کی سرکشی کے مظاہرے ہر وقت دیکھے جا سکتے ہیں۔

دینی امور میں نافرمانی کرنے سے نہ ملازمت جانے کا خطرہ ہے نہ فوری نقصان کا اندیشہ، لہذا انسان بالعموم سرکشی کرتا اور ہر قسم کی پابندی کو ٹھکراتا ہے۔ صرف ایسے اشخاص جو خدا سے ڈرتے ہیں اور اس کی خوشنودی کی تمنا رکھتے ہیں وہی خدا اور رسول اور شیخ طریقت کے فرمانبردار ہوتے اور پابندی کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔

افسوس کہ فتنوں کے موجودہ دور میں آج کل ایسے مسلمان زیادہ نظر آنے لگے ہیں جو دشمنان اسلام کے سامنے قرآن وسنت کا (نعوذ باللہ) مذاق اڑاتے ہیں احادیث کا انکار کرتے ہیں اور بزرگان دین کو مطعون کرتے ہیں (وہ حشر ونشر، عذاب وثواب اور جنت ودوزخ وغیرہ کسی کے قائل نہیں ایسے ہی منکرین ومنافقین کیلئے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ۝ (۷ - ۱۷۹)

Marfat.com

ترجمہ:۔ ان کے دل ہیں لیکن سمجھتے نہیں ان کی آنکھیں ہیں۔ لیکن ان سے دیکھتے نہیں ان کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں یہ لوگ چوپایوں کے مانند ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ یہ لوگ وہ ہیں جو غافل ہیں۔

ایسے منکرین یا منافقین ہمارے مخاطب نہیں نہ بیعت و اطاعت کے ذکر سے انہیں کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ ان کے تمسخر سے اطاعت گزاروں کا کوئی نقصان ہوتا ہے

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (۱۰۹-۶)

ترجمہ:۔ تمہارے واسطے تمہارا دین میرے واسطے میرا دین۔

وسیلۂ شیخ

ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔ يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ط (۵-۳۵)

یعنے اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ ڈرو اللہ سے اور ڈھونڈو اس کیطرف وسیلہ اور مجاہدہ کرو اس کی راہ میں تاکہ تم فلاح پاؤ۔

متقدمین اکابر صوفیہ و علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں "وسیلہ" سے "مرشد" کا توسل مراد ہے۔ متاخرین میں شاہ عبدالرحیمؒ، شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ سب نے یہی معنی لئے ہیں۔ حتیٰ کہ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اپنی کتاب منصب امامت مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی کے صفحہ ۵۵ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

"قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى يَاۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ

و مراد از وسیلہ شخصے است کہ اقرب الی اللہ باشد در منزلت کما قال اللہ تعالیٰ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ ۰

و اقرب الی اللہ باعتبار منزلت اول رسولؐ است بعد ازاں امام کہ نائب اوست"

یہ دوسری آیت بنی اسرائیل کے رکوع ۶ میں واقع ہے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ

نے بھی شخص اقرب الی اللہ کے لئے وسیلہ کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اس لفظ کا استعمال قرآنی معلوم کرنے کے بعد کسی مسلمان کے لئے شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ مقربین بارگاہ رب العزت ہی کا وسیلہ وہ وسیلہ ہے جس کے حاصل کرنے کی ہدایت اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمائی ہے[۵۱]۔

تقرب الی اللہ کیلئے مقربین کو وسیلہ بنانا قرآن پاک سے ثابت ہوگیا۔ صحابہ کرامؓ۔ تابعینؒ تبع تابعینؒ۔ اکابر صوفیہؒ۔ اولیاء، علماءؒ و صلحائے امتؒ سب کا اسی پر عمل رہا ہے اور ان بزرگوں کے خلفاء و جانشینان آج تک اس اصول کے پابند ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ اکابر صوفیہؒ علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد علم طریقت کے حصول کی جانب متوجہ ہوتے تھے بعض علماء ایسے بھی گزرے ہیں۔ جو پہلے تصوف و طریقت کے مخالف تھے۔ لیکن بعد میں نہ صرف تائب ہوئے۔ بلکہ علم تصوّف کے زبردست مبلغ بھی بن گئے۔ مثلاً امام مالکؒ۔ امام احمدؒ۔ امام غزالیؒ۔ امام ابوالحسنؒ وغیرہ وہ ان نکات کو صحیح سمجھنے پر مجبور ہوگئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان تک باہم تک سلسلہ بہ سلسلہ اور واسطہ بواسطہ صرف قرآن و احادیث ہی نہیں پہنچیں بلکہ اسرار و انوار رسولؐ اور اتصال قلوب کے ذریعہ حضوری کی نعمت اور دیگر باطنی نعمتیں بھی پہنچی ہیں" ایک گروہ بخاریؒ و مسلمؒ و ابوحنیفہؒ و شافعیؒ کی قیادت میں اگر اخبار رسولؐ و آثار رسولؐ کو اپنے ضخیم دفتروں میں مدون کرتا رہا تو دوسری طرف کچھ لوگ حسن بصریؒ اور ابوطالب مکیؒ کی امامت میں اسرار رسولؐ اور انوار رسولؐ سے اپنے قلب و سینہ کو گلزار کرتے رہے ادھر رسولؐ کا قال ایک سفینہ سے دوسرے سفینہ میں نقل ہوتا رہا ادھر رسولؐ کا حال ایک سینہ سے دوسرے سینہ کو طور سینا بناتا رہا[۵۲]۔

صوفیائے کرامؒ اس بات کے قائل ہیں کہ "مرشد کا قلب واسطہ در واسطہ مرشد کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک سے ملا ہوتا ہے۔ اس کا رابطہ روحانی بھی زنجیر کی کڑیوں کی طرح مہر چشمہ

[۵۱] سرِّ دلبراں ص۲۰۸ [۵۲] مرشد کی تلاش "ضمیمہ تصوف اسلام" از مولانا عبدالماجد دریابادی۔

تقدیس و روحانیت سے جڑا ہوتا ہے" ان معنی[1] میں ذات مرشد کا قبول کرنا گویا سلسلہ کی تمام کڑیوں کی روحانی مدد حاصل کرنا اور جملہ اولیاء سلسلہ کے سایۂ عاطفت میں آجاتا ہے۔ اس راہ میں برکات روحانی اور فیضان قدس کا نزول اسی طرح ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالہ القول الجمیل میں تحریر فرماتے ہیں کہ "بیعت سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ بیعت کا اطلاق صرف بیعت خلافت تک محدود نہیں بلکہ عہد نبوت میں بیعت کی مختلف صورتیں تھیں مثلاً بیعت خلافت، بیعت جہاد، بیعت توبہ، وغیرہ صوفیہ کی مروجہ بیعت" بیعت تقویٰ" میں داخل ہے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں اس بیعت کی علیحدہ ضرورت نہ تھی اس لئے کہ ان سے جو بیعت خلافت ہوتی تھی اس میں یہ بیعت بھی داخل و شامل ہوتی تھی اس کے بعد ایک عرصہ تک یہ بیعت بیعت خلافت کے ساتھ التباس و اشتباہ کے اندیشہ سے ملتوی و موقوف رہی اور گروہ صوفیہ اس بیعت کا قائم مقام خرقہ کو سمجھتا رہا پھر جب ملوک و سلاطین کا دور دورہ پوری طرح ہو گیا۔ اور خلافت رسول کی بیعت بند سی ہو گئی تو صوفیہ نے بیعت تقویٰ کی "سنت مردہ" کو پھر سے زندہ کیا[2]

معلم اور ہادی کے بغیر محض کتاب اللہ کافی نہیں

بعض حضرات کا (بالخصوص ایسے حضرات کا جن کا نفس انہیں اساتذہ اور بزرگوں کی اطاعت سے بہکاتا ہے۔ کیونکہ اطاعت میں نفس مغلوب ہوتا ہے) خیال ہے کہ کتاب اللہ کے ہوتے کسی شیخ کی کیا ضرورت ہے[3] لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ :-

---

[1] مرشد کی تلاش "ضمیمہ تصوف اسلام" از مولانا عبدالماجد دریابادی [2] تصوف اسلام [3] کتب سیر میں یہ قول حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے مگر روئے سخن ان کی جانب نہیں ہے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ اپنے قول کی مصلحت سے خود واقف تھے ان کے درجے پر کوئی فائز ہو لے تو بلاشک اس کے لئے ایسا دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے۔ تاہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی مرشد کے وسیلہ سے مستغنی نہ تھے۔

Marfat.com

وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ (۵-۳۵) اللہ کی طرف وسیلہ ڈھونڈو) اور
فَاسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۱۶-۴۳) پس اگر تم نہیں جانتے ہو تو پوچھو اہل ذکر سے)
بھی تو اسی قرآن پاک کے احکام ہیں۔ حق تعالیٰ نے بھی محض قرآن پاک نازل فرمانے پر
اکتفا نہیں کی بلکہ اس کا معلم اور ہادی بھی ساتھ ساتھ مبعوث فرمایا اور اس کی اطاعت
ہم پر لازم قرار دی۔ نیز صاف صاف فرمایا۔ جو کچھ تمہیں وہ دے وہ لے لو اور جس سے
منع فرمائے اسے چھوڑ دو کتاب اللہ کے ہوتے ہوئے خود اس کتاب میں ایسے حکم کی کیا ضرورت تھی
وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (۳-۱۶۴) اور پاک کرتا ہے انکو اور سکھاتا ہے انکو کتاب و حکمت)
بھی اسی کتاب اللہ میں ہے علماء معرفت کے نزدیک یہاں "کتاب" سے ظاہری احکام دین
اور "حکمت" سے اسرار توحید و معرفت مراد ہیں[1]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کا تزکیہ فرمایا اور انہیں کتاب و حکمت" کی
تعلیم دی۔ اس طرح زندہ شخصیتوں کی جماعت تیار کی جن میں بلحاظ رموز باطنی و روحانی
بعض کو بعض پر فضیلت حاصل تھی انہیں "کتاب و حکمت" کی تعلیم دینے اور ان کا تزکیہ
کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا۔ کہ وہ اسطرح دوسروں کا تزکیہ کریں اور دوسروں کو "کتاب و حکمت"
سکھائیں چنانچہ ان بزرگوں نے ایسا ہی کیا اور ان کے جانشین سلسلہ و رسلسلہ یہی خدمت
سرانجام دیتے چلے آرہے ہیں۔

اسی لئے علماء طریقت جانشین رسول اللہ کہلاتے ہیں صرف کتاب اللہ" پڑھ لینے"
سے فیض ذاتی باطنی حاصل نہیں ہوتا۔ یہ شرف صحبت نبویؐ ہی کا تھا جس نے صحابہ کرام
کو صحابہ کرامؓ بنا دیا اور بدویوں کی جاہل قوم ایسی زندہ قوم بن گئی جس نے دنیا میں انقلاب عظیم
برپا کر دیا۔ وہی قرآن آج بھی موجود ہے اس میں زیر و زبر تک کا فرق نہیں ہوا۔ یورپ کا "علم
دوست" طبقہ اسے پڑھتا ہے اس پر بزعم خود تحقیقی مقالے اور اس کی تفسیریں بھی لکھتا ہے
پھر بھی "ہدایت" سے دور اور توحید و رسالت کا منکر ہے آخر وجہ کیا ہے؟ وجہ یہی ہے کہ

[1] تفصیل کیلئے دیکھو حکمت رومیؒ از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لاہور۔

Marfat.com

صحیح ہادی اور اس کے ذاتی قرب کے فیض سے محروم ہیں۔ وہ قرآن پاک کے مطالب کو اپنی رائے اپنے قیاس اور اپنی منطقی عقل کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ حالانکہ روحانی انقلاب کے لئے صورت سے معنیٰ اور ظاہر سے باطن کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے جو مرشد کے بغیر ناممکن ہے

یہی حال مسلمانوں کا ہوا۔ اور ان میں بھی بے شمار فرقے ہو گئے کیونکہ انہوں نے مقربین حق سے منہ موڑ لیا اور قرآن پاک کے من مانے معنے سمجھنے لگے۔ اسی لئے مرکزی نقطۂ خیال سے ہٹ کر جنگ و جدال میں مبتلا ہو گئے۔ بقول حضرت قبلہ شاہ نیاز احمد قدس سرہ العزیز

اسرارِ حقیقت سے خبردار جو ہوتے ہفتاد و دو ملّت میں کبھی جنگ نہ ہوتی

انہوں نے ان اہم نکات کو فراموش کر دیا کہ صحیح فہم قرآن کے لئے تزکیۂ باطن اور کشف صدر کی ضرورت ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ صرف منتخب بندوں کو اللہ تعالےٰ یہ نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت فرمانا چاہتا ہے۔ تو کھول دیتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے (۶ - ۱۲۶)

نیز یہ ہے کہ جب وہ کسی کو شرح صدر کی نعمت دیتا ہے تو اسے اپنے نور خاص سے نوازتا ہے (۳۹-۲۲)

غرض کہ ہدایت کا انحصار شرح صدر پر ہے اور شرح صدر کا نتیجہ انشراح قلب ہے۔ جس کا نتیجہ وہ انوارِ الٰہی ہیں جو غیب سے قلب پر وارد ہوتے ہیں۔ لیکن انہی مقربین خاص کے قلب پر جنہیں اللہ چاہتا ہے۔ اسی لئے اولیاء اللہ کو وہ ادراک و بصیرت حاصل ہوتی ہے جس سے دوسرے محروم رہتے ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی بڑے "ذی علم" اور "محقق" کیوں نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے اس خاص فضل و کرم کی بدولت عالم قدس سے اولیاء اللہ کے قلب پر کشفِ حقائق اور رموز معرفت کی بارش ہوتی ہے انہی کے سینے نور عرفان سے منور ہوتے ہیں وہی اسرار معرفت کے حامل اور ذات حق سے واصل ہوتے ہیں وہی صحیح معنے میں خدا کی طرف دعوت دینے کی اہلیت رکھتے ہیں اور انہیں مناقشانہ قیل و قال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ بقول اقبال ؎

Marfat.com

؎ قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا   فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

ان ہی کی شان میں متعدد آیات قرآنی اور احادیث نبوی موجود ہیں۔ لہٰذا علم باطن اور تقرب الی اللہ کے حصول کیلئے ان ہی کا ہاتھ پکڑنا ضروری ہے۔ ارشاد نبوی ہے:۔

عَنْ عَبْدُ اللّٰہِ بِنْ عُمَرَ مَنْ مَاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِہٖ بَیْعَۃٌ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً وَمَنْ خَلَعَ یَدًا مِّنْ طَاعَۃٍ لَقِیَ اللّٰہُ یَوْمِ الْقِیَامَۃِ وَلَا حُجَّۃَ لَہٗ[1]

ترجمہ۔ یعنی جو شخص مرگیا اور اس کی گردن میں طوق بیعت نہیں ہے تو وہ مرگیا جاہلیت کی موت اور جس نے ہاتھ اللہ کی اطاعت سے اٹھائے وہ بروز قیامت اللہ سے اس طرح ملے گا کہ کوئی حجت اس کے پاس نہ ہوگی۔

ایک دوسری روایت یہ ہے کہ جس نے امام کے بغیر علم شریعت و حقیقت سیکھنے کی کوشش کی اس نے کفر کیا۔ ایک اور روایت ہے کہ جس کا کوئی شیخ نہیں۔ اس کا شیخ شیطان ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ مذکورہ بالا روایات میں جس بیعت یا امام کا ذکر ہے۔ وہ بیعت امیر ہے۔ اصطلاحی بیعت صوفیہ نہیں۔ لیکن اکابر علمائے طریقت اس خیال سے متفق نہیں ہیں۔ کیونکہ اوّل تو یہاں صورت عمومیت کی مذکور ہے کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے۔ دوم۔ امام سے مراد امیر امت، قائد عسکر، مرشد طریقت اور امام جماعت سب ہی ہو سکتے ہیں۔ اگر امیر ملت یا فوجی قائد مراد ہو۔ تو جن ممالک میں مسلمانوں کی حکومت ہی نہ ہو جیسے غیر منقسم ہندوستان میں نہیں تھی یا اب وہاں نہیں ہے۔ تو لاکھوں مسلمان جو اب سے پہلے وہاں انتقال کر چکے یا آئندہ فوت ہونگے کیا ان کی موت بھی "جاہلیت کی موت" سمجھی جائے گی؟ سوم امیر ملت جب تک خلفائے راشدینؓ کی طرح منصب ولایت پر بھی فائز نہ ہو (یا کم از کم مستند عالم باعمل اور متشرع و متدین نہ ہو) "دین میں" اس کی بیعت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا لازم ہونا تو بہت دور ہے۔ خلافت راشدہ

[1] مسلم۔ مشکوٰۃ شریف۔ بحوالہ تعلیم غوثیہ ۳۵

کے بعد یہ "امامت" "دنیاوی ملوکیت" میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اسی لئے اہل ایمان بیعت تقویٰ کے لئے اہل اللہ ہی کو مرشد بناتے رہے۔ جیسا کہ اوپر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حوالہ سے مذکور ہو چکا ہے۔ لہٰذا ہر زمانے، ہر ملک میں اور ہر وقت قابل عمل یہی ہے کہ علم اسرار الٰہیہ سیکھنے کے لئے کسی مستند اہل طریقت کو رہنما بنایا جائے اور پوری طرح اس کی اطاعت کی جائے۔

زمانہ حال کے سب سے بڑے مفکر علامہ اقبال کے مرشد معنوی عارف رومیؒ فرماتے ہیں

قال را بگذار و مرد حال شو   پیش مرد کاملے پامال شو

اور خود علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

کیمیا پیدا کن از مشت گلے   بوسہ زن بر آستانِ کاملے

یا

اندریں عالم نیرزی با خسے   تا نیاویزی بدامانِ کسے

لیکن موجودہ دور میں ہر اچھی چیز کی طرح "کاملین" کی بھی قلت ہے۔ تاہم مستند سلسلوں سے نسبت رکھنے والے بزرگوں کے جانشین وخلفا اب بھی موجود ہیں۔ ان کے توسل سے۔ کم از کم اکابرؒ سلسلہ سے تو "نسبت" حاصل ہو ہی جاتی ہے۔ اور متعدد غلط عقائد کی اصلاح بھی ہو جاتی ہے اصحیح "نسبت" ہی اس راہ میں کام کرتی ہے۔

اس کے بعد سالک کی اپنی محنت ہے جس کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ اس مستحسن اقدام کے چند انعامات یہ ہیں:۔

— تنگ نظری دور ہو کر دل میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

— وہ فرقہ پرستی کی لعنتوں میں گرفتار نہیں رہتا نہ کسی سے خواہ مخواہ الجھتا ہے۔

— "دین" کی گہری معنویت کے نور سے اس کا دل روشن ہو جاتا ہے اور اسے کلمہ توحید کے صحیح مفہوم سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

— وہ اپنے مرشد معنوی کی اطاعت کر کے نفس پر قابو پاتا اور ضبط و نظم کا عادی بنتا ہے۔

— رسول اللہﷺ کی صحیح "حقیقت وعظمت" سمجھ میں آتی اور آنحضورﷺ سے صحیح معنی میں عشق پیدا ہوتا ہے۔

Marfat.com

—— "انسان" انسان" بن جاتا اور کل بنی نوع انسان سے محبت کرنا سیکھتا ہے۔

—— اسے اپنی "حقیقت" (انا - خودی) کا صحیح عرفان حاصل ہوتا ہے۔

—— وہ ذرہ ذرہ میں خدا کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے اور اس طرح "توحید خداوندی" کے متعلق اسکی شہادت جو وہ کلمۂ شہادت کے ذریعہ دیتا ہے" بامشاہدہ" ہونے کی وجہ سے "سچی" ہوتی ہے (شہادت بلا مشاہدہ ناقابل اعتبار ہے۔ اسے کوئی دنیاوی عدالت بھی تسلیم نہیں کرتی پھر وہ خدا کی عدالت میں کیونکر قابل قبول ہو سکتی ہے)

—— گنہگار بندہ بیعت کرتے ہی "مومن" بنتا اور محنت و مجاہدہ کے بعد "مقربین" میں شامل ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ کسی مستند سلسلے میں داخل ہو کر اسکی تعلیمات پر عمل کرنے کی یہ سب ادنیٰ "کرامات" ہیں ان کے بعد دیگر "کرامات" کی ضرورت بھی نہیں رہتی کیونکہ یہی ہماری دنیا و آخرت کی درستی کیلئے کافی ہیں (نگران کیلئے جو فرقہ پرستی کی اندھی تقلید سے نکل کر ان باتوں پر غور کریں۔)

مذکورۂ بالا امور کے پیش نظر کسی "مرد کامل" کی محض "تلاش و جستجو" میں عمر عزیز ضائع کرنے اور بالآخر "جاہلیت کی موت مر جانے" سے یہ کہیں بہتر ہے کہ کسی مستند سلسلے میں داخل ہو کر کاملینِ سلسلہ سے نسبت پیدا کر لی جائے تاکہ آئندہ زندگی میں جو قدم اٹھے وہ صحیح راہ پر ہو اور عاقبت بھی بخیر ہو جائے:

شنیدم کہ در روز امید و بیم　　　بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم (شیخ سعدیؒ)

اور حضرت قبلہ شاہ نیاز احمدؒ بریلوی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں

؎ با اولیاست حشر محبان اولیاء

نظر بریں "عاشقان الٰہی" کے زمرے میں داخل ہونا انسانی زندگی کی سب سے اہم ضرورت و سعادت ہے اور اسی لئے "بیعت" و "اطاعت مرشد" کو تمام صالحینِ امت اسلامیہ نے ضروری قرار دیا اور اس پر عمل کیا ہے۔

Marfat.com

(۹)

روحانیت
اور
سیاست

Marfat.com

۷۸۶

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ۝

(پارہ ۲۷)

اور نہیں پیدا کیا میں نے جن و انس کو مگر عبادت کیلئے۔

Marfat.com

رُوحانیت اور سیاست

پروفیسر عزیز احمد صاحب اپنی کتاب "اقبال نئی تشکیل" میں لکھتے ہیں "اقبال کو مارکس کے سیاسی نظریوں سے پورا اتفاق ہے۔ مگر ہیگل کے جدلیاتی نظام سے اتفاق نہیں جس نے مارکس کی معاشیات کو فلسفیانہ طور پر جنم دیا ہے۔ خواجہ غلام الدین کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت کے مذہب کے مخالف ہیں۔ اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاءاللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے سیاسی مفہوم کا........ جو روحانیت میرے نزدیک مغضوب ہے۔ یعنی افیونی خواص رکھتی ہے۔ اس کی تردید میں نے جابجا کی ہے باقی رہا سوشلزم تو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے۔ جس سے مسلمان سوسائیٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔[۵]

کارل مارکس یا علامہ اقبال کے معاشی نظریات سے اس وقت بحث مقصود نہیں بلکہ یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ اسلام میں روحانیت کا کوئی سیاسی مفہوم نہیں ہے کیونکہ وہ نہ سیاست کی محتاج ہے۔ نہ سیاسی اقتدار کی وجہ سے کسی شخص کی روحانیت میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ اگر سیاسی غلبہ و اقتدار کے بغیر روحانیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ تو حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت موسٰی کلیم اللہ اور فتح مکہ سے قبل خود سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم کی روحانیت کو بھی نعوذ باللہ بے حقیقت اور نمرود و فرعون اور مکہ کے کفار و مشرکین کے سیاسی اقتدار کو ہر طرح قابل قدر تسلیم کرنا پڑے گا۔ لیکن ہے کوئی

۵؎ اقبال نئی تشکیل صـ۲۸۷، صـ۲۸۸

مسلمان جو اس صورتِ حال کو صحیح تسلیم کرے؟

"حق تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے۔ کہ وہ متمدن و ترقی یافتہ لیکن نافرمان اقوام کے مقابلے کے واسطے اوران کا تختہ الٹنے کے لئے اپنے برگزیدہ بندوں کو بھیجتا رہا ہے جن کے پاس لیٹنے کے لئے سوائے بوریئے کے، اوڑھنے کے لئے سوائے کمبل کے۔ اور کھانے کے لئے سوائے سوکھے لقمے کے کچھ نہ تھا"[۱] اور انہی برگزیدہ ہستیوں نے ترقی یافتہ ذی اقتدار لیکن خدا فراموش اقوام کا تختہ الٹ دیا۔[۲] حضرات انبیاء کرام اور اولیائے عظام ظاہری بے سروسامانی کے باوجود با اقتدار حکمرانوں پر ہمیشہ غالب رہے ہے۔ میدانِ کربلا میں یزیدیوں کو ظاہری سیاسی فتح تو حاصل ہو گئی۔ لیکن حقیقی فتح حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کی مقدس جماعت کو ہوئی۔ ان کی مظلومی و شہادت نے اسلام کے زریں اصولوں کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ اور مسلمانوں کو یہ بتا دیا۔ کہ جب اسلام کے بنیادی[۳] اصول خطرے میں ہوں تو خدا کی خالص محبت کیلئے اقتدار سے کس طرح اور کس حد تک ٹکرایا جا سکتا ہے۔ یہ کرشمہ خالص روحانیت کا تھا۔ نہ کہ روحانیت کے سیاسی مفہوم کا۔

ہمارا صحیح نصب العین "سیاسی روحانیت" نہیں بلکہ "روحانی سیاست" ہونا چاہیئے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی اقتدار اعلائے کلمۃ الحق کے لئے ہو تاکہ اس کے تحت جو تعلیمی و معاشی نظام قائم ہو وہ افرادِ معاشرہ کو خدا فراموش بنانے کی بجائے خدا کے فرمانبردار بندے بنائے۔ کیونکہ اسلام کی غرض و غایت یہی ہے۔ اسلام محض کسی سیاسی یا معاشی نظام کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایسے اخلاقی و روحانی

۱؎ ایک قرآن از قاری محمد طیب صاحب۔

۲؎ تمام انبیاء کرامؑ اور ان کے مخالفین کے حالات سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

۳؎ حضرت امام حسینؑ اور یزید کا جھگڑا امامت اور بیعت امامت پر تھا۔ جو خالص روحانی مسئلہ ہے۔ سیاست روحانیت کے تابع تھی۔ یزید اسے الگ کر دینا چاہتا تھا۔

Marfat.com

اصولوں کا مجموعہ ہے۔ جن پر عمل کرنے سے انسان صحیح معنوں میں انسان بنتا اور انسانیت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ انہی اصولوں پر عمل کرنے سے انسان میں اخلاق الٰہیہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ اللہ کا مقرب بنتا ہے۔

اسلام کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی اصول سب اس کے مخصوص نظام اخلاق و روحانیت کے تابع ہیں۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ انسانیت کو فروغ حاصل ہو جیسے قرآن پاک میں یہ سیاسی، معاشی اور معاشرتی اصول مذکور ہیں۔ اس میں بار بار یہ تاکید بھی کی گئی ہے کہ ہماری زندگی کا نصب العین صرف سیاسی اور معاشرتی عروج نہیں۔ بلکہ رب کی ملاقات ہے۔ جو فنا فی الرسولؐ ہو کر ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ یہی اسلام کی روحانیت ہے۔ جس کا راستہ خواہ کسی شعبۂ حیات سے شروع ہوتا ہو۔ لیکن میدان اخلاقِ محمدیؐ ہی سے گذر کر خدا تک پہنچتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں۔ کہ اسلام میں جس طرح انسان اور انسانیت کا مخصوص تصور ہے اسی طرح خلیفۃ اللہ فی الارض کا بھی مخصوص تصور ہے۔ چنانچہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ (۱) ایک طرف تو اللہ کا مقرب ہو اور (۲) دوسری طرف اس کے بندوں کے درمیان رہ کر اس کے نائب کے فرائض ادا کرتا ہو۔ ملحوظ رہے کہ اللہ کے تقرب کا معاملہ بالکل انفرادی ہے۔ اس کے لئے کسی اجتماعی نظام کی ضرورت نہیں۔ البتہ فرائض نیابتِ الٰہیہ کی ادائیگی کے لئے تمام نظامہائے اجتماعی اور تمام علوم و فنونِ ضروری ہیں لیکن ان سب کی غرض و غایت اور مقصود اصلی بھی یہی ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کے احکام کے مطابق زندہ رہنے کا عادی بنایا جائے۔ تاکہ انہیں اللہ کی خوشنودی حاصل ہو اور وہ اس کے مقرب بن سکیں۔ اسی کام کے لئے تمام انبیاء کرام دنیا میں مبعوث ہوئے اور یہی فریضہ ملّتِ اسلامیہ کے ہر فرد کا ہونا چاہیئے۔

تاریخ اسلام میں شروع سے آج تک ہزارہا ایسے بزرگ گذرے ہیں جن کے

Marfat.com

ہاتھوں میں سیاسی اقتدار نہ تھا۔ لیکن سیاسی اقتدار رکھنے والے ان کی غلامی پر فخر کرتے تھے۔ علامہ اقبال خود ان کے معتقد تھے اور اپنے کلام میں جابجا ان کا اور ان کی تعلیمات کا ذکر کرتے ہیں۔ ذکر ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی مدح و ثناء کے گیت گاتے ہیں۔ ان کے تمام نظریے۔ بالخصوص نظریۂ خودی اور نظریۂ فقر و قلندری ان ہی کی تعلیمات سے ماخوذ ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں کوئی سیاسی اقتدار نہ تھا۔ میں نے اپنے تمام مضامین میں اسی حقیقت کو مفصل مثالوں کے ساتھ واضح کیا ہے۔ اور اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ موجودہ دور کے لحاظ سے علامہ کا اصل پیغام اخلاقی و روحانی ہے۔

سیاسی اقتدار اور اخلاقی و روحانی قوتوں کا ایک ہی ذات میں مجتمع ہونا افضل ضرور ہے۔ لیکن اس سے ان اشخاص کی فضیلتِ اخلاق و روحانیت پر کوئی حرف نہیں آتا جن کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار نہ ہو۔ سیاسی اقتدار مل جانے کے بعد اسلامی اخلاق و روحانیت سے بے نیاز ہو جانا البتہ مذموم ہے۔ چنانچہ علامہ اقبال خود فرماتے ہیں :۔

جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہ خیال بھی غلط ہے کہ ہماری روحانیت کی ایک قسم افیونی خواص رکھتی ہے۔ یعنی روحانیت سے انسان خدانخواستہ نکما اور ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اور عمل سے گریز کرتا ہے۔ عمل کی تعریف میں سیاسی، معاشی، ثقافتی، نفسیاتی اور مذہبی غرض ہر قسم کا عمل شامل ہے۔ ممکن ہے کہ روسی اشتمالیت اور سوشلزم کے قائل افراد "عبادت" کو عمل کے دائرے سے خارج کر دیں۔ لیکن قرآن و سنت سے "عبادتِ الٰہی" ہی تخلیقِ کائنات کا واحد مقصد ثابت ہوتی ہے :۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

Marfat.com

نیز "عبادت" کے دائرے میں تمام اعمالِ صالحہ آجاتے ہیں۔ اسلام راستہ سے کانٹا ہٹا دینے کو بھی عبادت کہتا ہے۔ عبادت ہی کی اعلیٰ ترین قسم وہ دینی وجدان ہے جس سے روح ارتقاء پاتی ہے اور بندہ اللہ کا مقرب بنتا ہے۔ اسلام میں عبادت کا اصل مدعا یہی ہے کہ روحانی ارتقاء حاصل ہو اور بندہ اللہ کا مقرب بن جائے۔

اگر عمل انسانی سے عبادت کو یکسر خارج کر دیا جائے تو انبیاء کرام اور اُنکے جانشینوں نے اللہ کی پرستش کے جو اصول اور طریقے دنیا کو سکھائے ہیں وہ سب غیر ضروری ہو جائیں گے اور انسان کا روحانی ارتقاء ہی رُک جائے گا۔

اسلام نے ہر عمل کی بنیاد حُسنِ نیت پر اور انسانی خدمت کی بنیاد حُسنِ اخلاق پر رکھی ہے۔ سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کو تکمیل اخلاق کے لئے مبعوث فرمایا گیا۔ لہذا لازم ہے کہ جو افراد اسلامی اصولوں پر ایمان رکھتے ہوئے عبادت، اخلاق حسنہ اور روحانیت جیسی اہم اقدار و اوصاف کی ترقی و ترویج میں مصروف ہوں۔ انہیں "بے عمل" یا "نشۂ افیون میں خود فراموش" نہیں کہا جا سکتا۔ بقول اقبال لفظ "افیون" مذہب کے لئے سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ اس نے بجا کیا تھا۔ کیونکہ ان کے پادریوں نے رہبانیت کو داخل کر کے مذہب کو افیون ہی بنا ڈالا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں رہبانیت نہیں ہے۔ ہمارا اسلام دینِ فطرت ہے اور شروع سے آخر تک وہ عمل صالح پر زور دیتا ہے۔ ہماری روحانیت اس کے خلاف نہیں ہے۔ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن پاک صاف الفاظ میں کہہ رہا ہے۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۶۲-۲)

Marfat.com

ترجمہ :۔ اللہ وہ ہے جس نے بھیجا ان پڑھوں کے درمیان پیغمبر ان ہی میں سے جو پڑھتا ہے ان لوگوں کے سامنے آیات اللہ کی۔ اور پاک کرتا ہے ان کو۔ اور سکھاتا ہے ان کو کتاب و حکمت۔

اس آیت میں رسول کریم کی ذات گرامی سے تین امور منسوب کئے گئے ہیں:۔

(۱) تزکیۂ نفس (۲) کتاب یعنے قرآن پاک کی تعلیم (۳) تعلیم حکمت۔

صوفیاء کرامؒ (۲) سے مسائل شریعتِ اسلامیہ اور (۳) سے علم معرفت مراد لیتے ہیں۔ ان امور میں وہ تمام نظری و عملی تعلیم آگئی جو امت اسلامیہ کے لئے ضروری تھی۔ اور جس کے لئے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ لہذا ہمارے دین یا مذہب یا مشرب کو افیون کہنا کسی لحاظ سے درست نہیں ہو سکتا۔ اسلامی روحانیت کو وہی حضرات افیون کہہ سکتے ہیں جو اس کی طرف سے کوئی خاص تعصب رکھتے ہوں۔ یا اس کی حقیقت سے نا آشنا ہوں۔ صرف دنیا پرست اور ریاکار متصوفین کی زبوں حالی کو سامنے رکھ کر خالص اسلامی روحانیت کو ہرگز مطعون نہیں کیا جا سکتا۔

فقرائے اسلام علم شریعت و معرفت کے مبلغین تھے۔ انہیں بے عمل کہنا بھی تعصب پر مبنی ہو سکتا ہے حقیقت پر نہیں۔ اس کے برعکس ان کو محسنین اسلام کہنا چاہیئے۔ کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا میں جتنی اشاعت اسلام فقراءِ اسلام کے ذریعے ہوئی۔ اتنی سلاطین کے ذریعے نہیں ہوئی۔ علاوہ بریں فقراءِ اسلام نے خلق اللہ کی جتنی خدمت جس جس طرح بلا لحاظ مذہب و ملت انجام دی ہے اس کا عشر عشیر بھی کوئی دوسری جماعت انجام نہیں دے سکی۔ تفصیل کے لئے مشائخ کے تحقیقی حالات، بالخصوص خلیق نظامی صاحب کی تالیف "تاریخ مشائخ چشت" کا مطالعہ کیا جائے۔

علاوہ بریں "عمل" کے حدود، درجات، معیار اور اہمیت مقرر کرتے وقت متعلقہ حالات کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ حالات ہر جگہ اور ہر وقت یکساں نہیں رہتے۔ لہذا

Marfat.com

عمل کے حدود، اس کا درجہ و معیار اور اس کی اہمیت بھی ہر وقت اور ہر جگہ یکساں نہیں رہ سکتی "عمل" کے متعلق فیصلہ کرتے وقت عمل کرنے والے کی نیت اور اس کے مقصد کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ تمام اشخاص کے عمل کے لئے ایک ہی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ از روئے اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کے لیے جو کام کیا جائے گا وہی تو عمل صالح ہے۔ اس کے ماسوا لغویت ہے۔ تفصیل مقالہ نمبر ۶ میں گذر چکی ہے۔

سالکان طریقت، علمائے دین، مبلغین کلمۃ الحق، درویش، فقرائے اسلام وغیرہ محتاج خانوں میں بیٹھے دوسروں کی خیرات یا ان کے صدقات[1] پر گذر بسر نہیں کرتے۔ ان کی ایک جماعت کے سوا جو درس و تدریس کے ذریعہ روزی حاصل کرتی ہو وہ زندگی کے ہر شعبہ میں دیگر افراد کے دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اتباع شریعت و طریقت میں مصروف ہیں یہی حضرات خدا سے زیادہ ڈرتے اور مخلوق خدا سے زیادہ محبت کرتے نظر آئیں گے۔ یہی وہ افراد ہیں جو بالعموم محنت و مشقت سے حاصل کئے ہوئے رزق پر قانع رہ کر اللہ کا شکر کرتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے روحانی پیشوا کی اطاعت کرتے ہیں۔ اس طرح ان میں ایک مخصوص قسم کا ضبط و نظم پایا جاتا ہے۔ اور ان میں وہ خطرناک آزادی نہیں ہوتی جو انسان کو گمراہ کر

---

[1] علامہ اقبال کے نظریئے میں تو خراج اور سرکاری محصول بھی صدقہ و خیرات ہی ہے (خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے)۔ رعایا سے جو کچھ بالجبر لیا جائے وہ سوال یا گداگری ہے جس سے خودی کمزور ہوتی ہے۔ کسی حکمران کا اکرام و انعام اس کی خدائی کی زکوٰۃ ہے۔ ان اصولوں کے بموجب ملازمین سرکار کی تنخواہیں جو محاصل سے ادا کی جاتی ہیں۔ کیا وہ بھی خیرات و صدقات، سوال یا گداگری میں شمار ہوں گی؟

Marfat.com

دیتی ہے۔جس سے نہ وہ دین کا رہتا ہے نہ دنیا کا۔

علماء و مشائخ کی ایک جماعت علم دین سکھانے میں مصروف رہتی ہے۔اسلام میں اس کی بڑی فضیلت ہے۔اسی لئے متعدد آیات و احادیث میں علماء و مشائخ کی خدمت کی سخت تاکید آئی ہے۔

بعض حضرات مشائخ کے نذر قبول کر لینے پر معترض ہوتے ہیں۔اور اسے گداگری سمجھتے ہیں۔لیکن انہیں چاہیئے کہ اعتراض کرنے سے پہلے نذر، تحفہ، صدقہ اور خیرات کا فرق اچھی طرح سمجھ لیں۔جیسا کہ پہلے مذکور ہوا۔علماء، فقراء اور مشائخ کی خدمت کرنے کی تاکید میں آیاتِ قرآنی، احادیث نبویؐ اور دیگر اکابرین اسلام کے اقوال لاتعداد ہیں۔"نذر" بھی فیس کی طرح خدمت کی ایک صورت ہے۔وہ اللہ کے نام ہوتی ہے اور مشائخ عظام اور علماء کرام کو بکمال خوشی اور رضامندی علم دین سکھانے کے صلہ میں بطور تحفہ پیش کی جاتی ہے۔نہ اس کی مقدار مقرر ہوتی ہے نہ نوعیت، اور نہ اس کے دینے میں کسی قسم کا جبر ہوتا ہے۔ان امور کے پیش نظر مروجہ تعلیمی فیسوں سے "نذر" کہیں بہتر ہے۔مروجہ تعلیمی فیس کی مقدار عموماً اوسط درجہ کے آدمی کی استطاعت سے زیادہ معین ہوتی اور نہایت سختی و پابندی کے ساتھ وصول کی جاتی ہے لیکن "نذر" کو ان امور سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔سرکار دوجہاں صلے اللہ علیہ وسلّم، صحابہ کرامؓ اور ہر زمانے کے علماء و مشائخ نے نذر، تحفہ اور دعوت قبول فرمائی ہے نہ یہ "سوال" ہے، نہ "گداگری"۔ نہ "صدقہ" نہ "خیرات"۔بلکہ خدمت مشائخین کی بہترین شرعی صورت ہے۔اگر سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دنیاوی تعلیم دینے کو زندگی کا پیشہ بنانا اور فیس پر گذر اوقات کرنا جائز ہے۔تو علماء و مشائخ کا دینی تعلیم اور روحانی تربیت کو بطور پیشہ اختیار کر لینا یا ان امور کو زندگی کا مشن بنانا اور نذر و تحفہ پر گذر اوقات کرنا کیوں ناجائز ہو گیا؟

Marfat.com

یہ الزام بھی غلط ہے کہ سالکانِ طریقت علوم عقلی حاصل نہیں کرتے۔ یا یہ کہ وہ سیاسی تحریکات یا اجتماعی قومی ترقی کے کاموں میں حصہ نہیں لیتے۔ ان امور میں حصہ لینا ملکی و انفرادی حالات اور فرد کے ذہنی رجحانات پر منحصر ہے۔ اس کی ذمہ داری نہ روحانیت پر عائد ہوتی ہے۔ نہ روحانی تربیت کے طریقوں پر، جو صوفیائے کرام نے مقرر کئے ہیں۔ کیونکہ ہر سلسلۂ طریقت میں متعلقہ شخص کے حالات (طبعی، معاشی، علمی وغیرہ) اس کی عمر اور سمجھ بوجھ کا لحاظ رکھ کر اُسے روحانی ترقی کے طریقے تعلیم کئے جاتے ہیں۔ وہ ہرگز دنیاوی کاروبار یا ترقی میں حائل نہیں ہوتے اگر بچے اپنے والدین کے سایہ عاطفت سے محروم ہو جائیں۔ یا والدین میں اعلیٰ تعلیم دلانے کی استطاعت نہ ہو۔ یا حکومت کا نظامِ تعلیم ناقص یا گراں ہو تو علوم دنیوی سے محروم رہنے کی ذمہ داری مشائخ کے نظام تربیت پر یا ان کے اخلاق و روحانیت پر کس طرح عائد ہو سکتی ہے؟

یہ صحیح ہے کہ اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے۔ لیکن یہ بھی فراموش کرنے کی چیز نہیں کہ اس کو دنیا کے سامنے حتی المقدور اسلامی اخلاق و روحانیت کے علم برداروں ہی نے پیش کیا ہے۔ نہ کہ اہل سیاست نے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنی خدمات کو وسیع پیمانے پر منظم نہ کر سکے ہوں کیونکہ تاج و تخت کے مالکوں اور ان کے جی حضوریوں کی جماعت نے تقریباً ہمیشہ ان کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ اسلامی سوشلزم کا بہترین نمونہ ہمیں سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور اس کے بعد آپ کے خلفاء راشدین کی زندگیوں میں نظر آتا ہے اگر مسلمان فتوحات ملکی کی کثرت سے دفعتہً دوچار نہ ہوئے ہوتے۔ اگر کثرتِ فتوحات کے بعد وہ عیش و عشرت اور جاہ پرستی کا شکار نہ ہو گئے ہوتے۔ اور اگر انہوں نے فتوحات سے زیادہ اسلام کے معاشی نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہوتی تو آج

Marfat.com

ان کی تاریخ دوسری ہوتی سیاسی اور معاشی نظاموں کا نفاذ وسیع پیمانے پر اُن لوگوں کا فرض تھا جو حکومت اور اقتدار کے مالک تھے اور آج بھی انہی کا فریضہ ہے دنیا جانتی ہے کہ خلافتِ راشدہ کا زمانہ بہت جلد ختم ہو گیا اور اس کی جگہ ملوکیت[1] و شہنشاہیت نے لے لی۔ اسی طرح جب حالات علمائے امت کے قابو سے باہر ہو گئے۔ تو انہوں نے سیاست اور اہل سیاست سے کنارہ کشی اختیار کی اور اس امر کی جانب پوری توجہ کی کہ کم از کم نظام اسلامی کی اخلاقی و روحانی بنیادیں استوار رہیں جن کے لئے خاص طور پر اسلام دنیا میں آیا ہے۔ چنانچہ چند مستثنیٰ مثالیں چھوڑ کر جنہوں نے نظام حکومت کو اسلامی اخلاق و روحانیت کی بنیادوں پر قائم کرنے اور اسلامی اخوت اور مساوات کو عالمگیر بنانے کی کوشش کی۔ زمانۂ خلافت راشدہ بلکہ یوں کہئے کہ واقعۂ کربلا کے بعد ملوکیت نوازوں اور اسلامی روحانیت کے علم برداروں میں ہمیشہ ایک قسم کی دوری بلکہ منافرت و مخالفت ہی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود آخر الذکر کی دینی، ملّی اور انسانی خدمات قابل قدر ہیں۔ گویا اس طرح اسلامی سوشلزم پر قرونِ اولیٰ کے بعد اگر کسی نے عمل کیا ہے تو وہ مشائخ اسلام، صوفیائے کرام اور اولیائے عظام ہی تھے۔

اگر تاریخ اسلام سے علماء اسلام، صوفیائے کرام اور اولیاء عظام کے حالات نکال دئے جائیں تو وہ محض جنگوں، سازشوں، سیاسی فتنوں اور فتوحات ملوکیت کی داستانوں کا ایک مجموعہ بن کر رہ جائے گی۔ جو اسلام کا مقصود نہیں۔ اسلام تو ایک خاص قسم کا اخلاقی و روحانی نظام قائم کرنے کے لئے دنیا میں آیا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ

---

[1] کتب تواریخ میں بعد کے مسلمان حکمرانوں کو بھی "خلیفہ" کہا گیا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو خلیفہ کہلواتے تھے۔ لیکن صحیح معنوں میں "وہ" سلاطین تھے۔ البتہ بعض "سلاطین" میں اتباع رسولؐ کا جذبہ بہت زیادہ تھا۔

Marfat.com

تمام انسانی برادری منشائے الٰہی کے تابع رہ کر ایک طرف توجتنی چاہے مادی ترقی کرے اور باہمی طور پر امن و مساوات کی زندگی بسر کرے۔ اور دوسری طرف ارتقائے رُوحانی حاصل کر کے مقرب الٰہی بن جائے۔ ان معنی میں اسلام کا سوشلزم عالمگیر ہے۔ ملکی یا نسلی نہیں اس کی بنیاد اخلاق و مذہب یعنے برادرانہ اخوت کے جذبہ اور عقیدے پر قائم ہے ملکی قانون کے جبر و استبداد پر نہیں۔ اور اس کے نفاذ میں منشاء الٰہی کی پابندی کرائی جاتی ہے۔ انسانی مطلق العنانی کی نہیں۔ غرض کہ حقیقی منشاء اسلام یہ ہے۔ کہ دنیا میں اسلامی اخلاق و روحانیت کا نظام قائم ہو۔ باقی تمام چیزیں منشاء مذکور کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہیں ناسخ نہیں —— میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ صوفیاء کرام اور فقرائے اسلام نے حتیٰ الامکان اسلامی سوشلزم کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ کیونکہ

(۱) وہ اخوۃ و مساوات کے زندہ نمونے ہوتے تھے۔ ان کی مساوات، محبت و اخوت اور انسانی ہمدردی کے ساتھ مربوط رہتی تھی۔ وہ خشک ملکی قوانین کا نتیجہ نہ تھی کیونکہ وہ انسانیت کے قائل تھے۔ اور انسانی ہمدردی کی بناء پر بندگان خدا کی خدمت کرتے تھے۔ بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ خدا تک پہنچنے کا یہی راستہ بہترین ہے۔

(۲) ان کا سوشلزم ملک و مذہب اور ہم خیالوں تک محدود نہ رہتا تھا۔ جیسا کہ آج کل عموماً ہر ملک میں ہو رہا ہے۔

(۳) وہ اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ کے قائل تھے۔ اسی لئے ان کی خدمات امیر، غریب کافر، مسلم سب کے لئے وقف رہتی تھیں (سیاسیات سے فقرائِ اسلام کے دور رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عہدہ قبول کر لینے کے بعد وہ مصالح ملکی و شاہی کی قید و بند میں گرفتار ہو جاتا نہیں چاہتے تھے۔)

(۴) وہ بندگانِ خدا کی خدمت اللہ کی محبت و خوشنودی کے لئے کرتے تھے کسی مصلحت یا ذاتی فائدے کے لئے نہیں۔ نہ کسی مجبوری کی وجہ سے۔

Marfat.com

(۵) وہ اپنی ذات پر صرف اتنا ہی خرچ کرتے تھے کہ زندہ رہ سکیں۔ باقی اپنا سب کچھ غریبوں، محتاجوں اور مسکینوں پر خرچ کر دیتے تھے۔ اکابر صوفیہ کے حالات ان حقائق سے پُر ہیں۔

یہ تھا ان بزرگوں کا سوشلزم جن کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار نہ تھا۔ اور اس کے باوجود ان کی شان یہ تھی کہ رعایا فرمانروائے ملک سے زیادہ ان کی گرویدہ رہتی تھی حتیٰ کہ بعض اوقات خود حکمران ان سے خوف کھانے لگتے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اکابر فقراء و مشائخ کو سلاطین وقت اپنا روحانی پیشوا تسلیم کرتے اور نہایت ادب سے ان کی اطاعت کرتے تھے۔

کیا یہ روحانی اور اخلاقی قوت کے سوا کوئی اور قوت تھی جس کے سامنے با اقتدار سلاطین بھی جھکنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ اور کیا ان کی یہ اخلاقی و روحانی قوت کسی سیاسی اقتدار کی محتاج تھی؟ جس اخلاق و روحانیت میں انحطاط کے آثار ہوں اس کی سند نہیں۔ نہ اہل علم کسی علمی بحث کا انحصار غیر مستند عوام کے اقوال و افعال پر رکھتے ہیں دیکھنا یہ چاہیئے کہ مستند اسلامی اخلاق و روحانیت کے علمبرداروں نے دنیا کو کس حد تک فائدہ پہنچایا ہے۔ اور اسی قسم کے فائدے آئندہ بھی دنیا کو پہنچ سکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ تاریخی شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ:۔

(۱) فقرائے اسلام علم و فضل میں کمال رکھتے تھے۔ اور انہوں نے اسلامی علم و فکر میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

(۲) انہوں نے انسانی عمل و کردار کو انسانیت کے لئے وقف کر کے اُسے بلند ترین معیار عطاء کیا۔

(۳) غلط سیاست سے مفاہمت نہ کر کے نفس انسانی کو حقیقی عزت، عظمت آزادی اور اطمینان کی بیش بہا نعمتیں عطاء فرمائیں۔

Marfat.com

(۴) بندوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے لئے زندہ رہنے کا بہترین عملی نمونہ پیش کیا۔

(۵) اخلاقی و روحانی تربیت کے بہترین مراکز قائم کئے۔ اس خدمت کو اپنی زندگی کا نصب العین بنایا۔ اور طالبان حق کو اللہ کے قریب لانے کی ان تھک اور پرخلوص جد و جہد کرتے رہے۔ ان کے وجود گرامی اور مساعی جلیلہ کے بغیر کسی معاشرہ میں فضائل قلبی رکھنے والے صالح بندوں کا وجود بھی نظر نہ آتا۔ کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ ہر ملک میں اخلاقی و روحانی تربیت کے مراکز حکومت کے بجائے زیادہ تر صوفیائے کرام ہی نے قائم کئے۔

(۶) اسلام کے اساسی اصولوں کے خلاف جب کبھی کوئی طوفان اٹھا۔ تو ان ہی بزرگوں نے اپنی پوری قوت سے اس کا مقابلہ کیا اور اسلام کے بنیادی اصولوں کو تباہی سے بچایا۔ انہوں نے ملت کے مردہ جسم میں ہمیشہ نئی روح پھونکی اور زوال و انحطاط کے زمانے میں تجدید و احیاء کے راستے تلاش کئے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی زوال کبھی ان کے دینی نظام کو تباہ نہ کرسکا۔ ؎۱

(۷) انہوں نے دنیا کے استعمال کا صحیح نمونہ پیش کیا۔

(۸) انہوں نے بلالحاظ مذہب و ملت بندگان خدا کی امکانی خدمت کی اور انسانی خدمت ہی میں خوشنودیٔ الٰہی کا راز پایا۔

(۹) ان کی عملی زندگی اور روحانی و اخلاقی قوت کی بدولت کروڑہا انسانوں نے برضا و رغبت اسلام قبول کیا۔

(۱۰) ان کی عملی زندگی اور ان کا مشرب و مسلک فرقہ پرستی کے خلاف زبردست محاذ جنگ ہے۔ دنیا سے فرقہ پرستی کی لعنت اور اسی قسم کی دیگر تنگ

؎۱ مقدمہ۔ تاریخ مشائخ چشت از پروفیسر خلیق نظامی علی گڑھ

Marfat.com

نظریاں دور کرنے کا واحد علاج اسلامی تصوف اور فقرائے اسلام کی تقلید ہے۔

دُنیا ہمیشہ مذکورۂ بالا نعمتوں کی محتاج رہے گی لیکن وہ فقراءِ اسلام کا مسلک اختیار کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں۔ بہ الفاظِ دیگر اسلامی اخلاق و روحانیت کی اہمیت سیاسی اقتدار سے جدا رہ کر بھی اپنا مقام رکھتی ہے جو بہت بلند ہے۔ اس حقیقت کا انکار مذکورہ بالا تمام اقدار کا انکار ہوگا۔

خاقانی نے اس بناء پر لکھا تھا :۔

پس از سی سال این معنیٰ محقق شد بہ خاقانی
کہ یکدم باخدا بودن بہ از ملکِ سُلیمانی

تاریخ اسلام میں ملوکی سیاست کی لعنتوں کے جو نمونے ہم تیرہ سو سال سے دیکھ رہے ہیں ان سے اسلامی اخلاق و روحانیت کو محفوظ رکھنا ہی بہتر ہے۔ ورنہ آیت پاک

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط

(ترجمہ :۔ اور تم میں ایک جماعت ہونی چاہیئے جو خیر کی طرف بلائے اور ممنوعات سے روکے۔)

کی تعمیل ہرگز نہ ہو سکے گی۔ اور عمل میں خلوص و للّٰہیت کا ایسا معیاری جذبہ تا قیامت نہ پیدا ہوگا۔ کہ کسی کی زبان ؎

مقصودِ من خستہ ز کونین توئی
از بہر تو میرم ز برائے تو زیئم

کہنے کے قابل ہو سکے۔

علامہ اقبال بھی زندگی کی مادی تعبیر اور ملوکیت کے خلاف، لیکن خلافت کے قائل ہیں۔ اسی لئے وہ فقر و شاہی یعنے روحانیت اور سیاسی اقتدار کو متحد رکھنا ملت

Marfat.com

کے لئے اشد ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سے انکار نہیں کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ قومی آزادی و خود مختاری کے لئے جان کی بازی لگا دے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خلافت میں حکومت کا عنصر منشائے الٰہیہ کی ترویج و اشاعت کے لئے ہوتا ہے ملوکیت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے نہیں[1]۔ لہٰذا لازماً یہی نتیجہ اخذ کیا جائے گا۔ کہ علامہ اقبال کے نظریے میں بھی حکومت و اقتدار کا حصہ اسلامی نظام اخلاق و روحانیت کی ترویج کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ (اسلامی معاشی اصولوں کی اشاعت بھی اس کا مقصود ہے۔ لیکن اسلامی معاشیات کی بنیاد اسلامی اخلاق و روحانیت کے نظریات پر قائم ہے ان سے جدا نہیں) لہٰذا سیاسی اقتدار و معاشی تجربات ہی کو اصل مقصد حیات قرار نہیں دیا جا سکتا[2]۔ اسلامی اوصاف سے معرّیٰ ہو کر اگر قومی استحکام قیامت تک برقرار رہے تب بھی اسے منشاء الٰہی کی تکمیل نہ کہیں گے۔ نہ ایسی قوم کا شمار ملتِ اسلامیہ میں کیا جائے گا[3]۔ مزید براں روحانیت کی بنیاد محبت الٰہی پر قائم رہتی ہے عموماً دیکھا گیا ہے کہ باہمت افراد مادی حُسن کے ادنیٰ اشارے پر تاج و تخت کو نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ٹھکرا دیتے ہیں۔ پھر تو اللہ کا عشق اللہ کا عشق ہے جب عشق مجازی کی آگ معشوق کے سوا ہر چیز کو جلا کر خاک کر دیتی ہے تو عشق حقیقی کی آگ میں تخت و تاج اور لشکر و سپاہ کہاں ٹھہر سکتے ہیں۔ اس میں تو خود عاشق صادق کی ہستی بھی باقی نہیں رہتی۔ بقول حضرت شاہ نیاز احمد قدس سرہ العزیز:۔

---

[1] سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں۔ (اقبال۔ بالِ جبریل)

[2] دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی (اقبال)

[3] امارت کیا شکوہِ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی (اقبال)

Marfat.com

۴۷ لاگ کی آگ لگتے ہی پنبہ نمط میں جل گیا
رختِ وجود جان و تن کچھ نہ بچا جو ہو سو ہو

دراصل جو روحانیت تخت و تاج کی محتاج اور متمنی ہو وہ روحانیت ہی نہیں وہاں تو طلب جنت کی بھی گنجائش نہیں رہتی۔ غالب نے اسی خیال کے پیش نظر کہا تھا ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

اور علامہ اقبال خود فرماتے ہیں :۔

سوداگری نہیں یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار بھی یہی ثابت کرتے ہیں کہ انہوں نے پہلے کبھی اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ وہ روحانیت کے قائل تو ہیں۔ مگر اس کے سیاسی مفہوم کے۔ لیکن بعد میں یہ خیال تبدیل ہو گیا اور وہ شکوہِ سلطانی کو فقر و روحانیت کے مقابلے میں ہیچ سمجھنے لگے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

باسلاطیں درفتد مردِ فقیر ٭ از شکوہِ بوریا لرزد سریر
از جنونِ مے افگند ہوئے بہ شہر ٭ وارہاند خلق را از جبر و قہر
می نگیرد جز بہ آں صحرا مقام ٭ کاندرہ شاہیں گریزد از حمام
قلب او را قوت از جذبِ سلوک ٭ پیشِ سلطان نعرۂ او لا ملوک

فقر خواہی از تہی دستی منال ٭ عافیت در حال و نے در جاہ و مال
صدق و اخلاص و نیاز و سوز و درد ٭ نے زر و سیم و قماشِ سرخ و زرد

Marfat.com

نہ تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

نہ محتاجِ سلطاں نہ مرعوبِ سلطاں
محبت ہے آزادی و بے نیازی

بغرضِ اختصار دیگر اشعار نظر انداز کئے جاتے ہیں ــــ اشعار کے علاوہ مندرجہ ذیل نکات بھی یہی ثابت کرتے ہیں۔

(۱) وہ فرد کی خودی اور اس کی معیاری ترقی پر بڑا زور دیتے ہیں۔ لیکن اُسے ضبطِ نفس اور اطاعتِ الٰہی کے تابع رکھتے ہیں۔ لیکن ضبطِ نفس اور اطاعتِ الٰہی، تصوفِ اسلامی کے خاص مسائل ہیں۔ اور صوفیوں سے زیادہ کسی نے ان پر عمل نہیں کیا۔ دونوں کا تعلق روحانیت سے ہے۔ مادیت سے نہیں۔

(۲) علامہ کے خیالات پر حکماء مغرب کا بھی زبردست اثر پڑا۔ لیکن انہوں نے ان نظریات کو پوری طرح کبھی قبول نہیں کیا۔ اور بالآخر کہہ دیا ؎

برا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اُسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

یا

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت کہاں حجابِ دلیل

وغیرہ

دراصل ان کے اور حکماء مغرب کے نقطہ ہائے نظر میں صرف اسلام اور تصوف کی روحانی و اخلاقی قدریں امتیاز پیدا کرتی ہیں۔ حکماء مغرب کا احساس صرف حیاتیاتی (بایولوجیکل) ہے لیکن اقبال کا احساس رُوحانی ہے۔

(۳) صوفیاء کرام اور علامہ اقبال دونوں اس پر مُصر ہیں کہ عمل صالح کے ذریعہ ہی فرد اور جماعت دونوں معراجِ کمال پر پہنچ سکتے ہیں...... عمل صالح اخلاقی و

Marfat.com

روحانی نقطۂ نظر کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اور ہر شخص خواہ اُسے سیاسی اقتدار حاصل ہو یا نہ اسے انجام دے سکتا ہے۔

(۴) حُریّت، حمیّت وغیرت اور عزتِ نفس پر اہلِ روحانیت اور علامہ اقبال دونوں یکساں زور دیتے ہیں۔ یہ اوصاف انسان کے قلب اور رُوحانیت ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ خواہ سیاسی اقتدار حاصل رہے یا نہ رہے۔ مختصر یہ کہ مذکورۂ بالا اُمور نہ سیاسی مفہوم رکھتے ہیں۔ نہ سیاسی اقتدار کے محتاج ہوتے ہیں۔ وہ خالص روحانی اور اخلاقی ہیں۔ سیاسی اقتدار دراصل قومی، ملکی اور ملی تنظیم کے لئے ضروری ہے۔ اور روحانیت کا تعلق خدا اور بندے کے درمیان خالص انفرادی ہوتا ہے۔ اس میں اخلاق کا مقصد سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن وہ بھی ذاتی ہوتا ہے (اسی طرح علامہ کا نظریۂ قلندری پوری قوم سے متعلق نہیں ہو سکتا۔ قوم کے مخصوص افراد قلندر صفت ہو سکتے ہیں پوری قوم قلندر نہیں بن سکتی۔ تاہم بلحاظ قدر قلندری کو اقتدار سیاسی پر فضیلت حاصل ہے۔

بہرحال علامہ کے تمام نظریات کے پیشِ نظر (جو بظاہر متضاد معلوم ہوتے ہیں لیکن ہیں نہیں) ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ ملتِ اسلامیہ کی تنظیم اور حفاظت کیلئے سیاسی اقتدار اور معاشی استحکام ضروری ہے۔ لیکن جب تک افراد کے دل بیدار نہ ہوں اور ان میں قلبی فضائل پیدا نہ ہوں۔ نہ سیاسی اقتدار برقرار رہ سکتا ہے اور نہ معاشی استحکام وہ خود کہتے ہیں :-

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ (ضربِ کلیم)

اقبال دراصل دل سے یہ چاہتے تھے کہ ملت اسلامیہ معراج کمال پر پہنچ جائے ان کی تقریباً تمام تصانیف کے محرک تین قسم کے اثرات و جذبات ہیں :-

Marfat.com

(۱) سائنسی ترقیوں کے اثرات۔

(۲) تعلیماتِ صوفیائے کرام کے اثرات۔

(۳) حالاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر احیائے ملت کا جذبہ۔

ان کے دل و دماغ پر ہر سہ محرکات کے اثرات گہرے ہیں۔ نہ وہ تصوف کے اخلاقی و روحانی اقدارِ حیات کو بالکل دماغ سے محو کر سکتے ہیں نہ مغرب کی محیر العقول قوتِ تسخیر کو یکسر نظر انداز کر سکتے ہیں۔ وہ ملتِ اسلامیہ کی خاطر ہر وقت ایک قسم کی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہتے تھے۔ ان کی طبیعت میں بعض اوقات سخت جھلاہٹ پیدا ہوتی تھی۔ اس وقت ان کی تنقید کی زد سے صوفی، ملا، مفتی، شاعر، ادیب، غرض کہ کوئی نہیں بچتا تھا۔ لیکن اس سے ان کا مقصد نہ توہین تصوف تھا نہ تذلیل فن۔ بلکہ اس کی تہ میں ایک مخلص بہی خواہ ملت کی محبت کا جوش اور اس کے دل کا درد پوشیدہ ہے وہ ہر ممکن طریقہ سے ملت کی توجہ کبھی عظمتِ ماضی کی طرف اور کبھی اہلِ یورپ کے جوشِ عمل اور ان کی علمی و سائنسی ترقیوں کی جانب مبذول کراتے ہیں۔ کبھی اس کے سامنے معراجِ زندگی کے لامحدود امکانات اور فطرت کے مقررہ اصول ارتقائے حیات کو بے نقاب کر کے اسے رغبت دلاتے ہیں۔ کہ وہ اسی رنگ و بو میں الجھ کر نہ رہ جائے بلکہ "یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ" کے نصب العین کو اپنے پیش نظر رکھے۔

لیکن جب علامہ کو اہلِ مغرب کی علمی و سائنسی ترقیاں، اخلاقی و روحانی قدروں سے معرا نظر آتی ہیں، جب ان کا جوشِ عمل انہیں ہلاکت کے راستہ پر لے جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور جب انہیں مشینوں کی حکومت میں دل کی موت کا یقین ہو جاتا ہے تو وہ ان چیزوں سے بھی اپنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے سامنے آئینِ پیغمبری پیش کر کے اخلاقی و روحانی اقدارِ حیات کے حصول کی ترغیب دیتے ہیں۔"

غرض یہ کہ ان کے سارے منصوبے کی بنیاد اور ان کے پیغام کی اساس تمام تر

Marfat.com

مذہبی و اسلامی، اخلاقی اور روحانی ہے۔ اقبال خواہ عشق کے نام سے کچھ فرمائیں۔ خواہ خودی کے تحت کچھ کہیں۔ خواہ فلسفۂ تخلیق مقاصد ہو، خواہ نظریۂ تسخیر کائنات ہو۔ حرکت ہو۔ قلندری ہو۔ جوشش عمل ہو۔ جہد و پیکار ہو۔ کچھ ہو سب کی بنیاد اسلام۔ اسلامی اخلاق اور اسلامی روحانیت ہے۔ اور انہی خصوصیات کے مجموعہ کا نام تصوف ہے گویا ان کی تمام تعلیمات ایک دائرے کی حیثیت رکھتی ہیں جس کا مرکزی نقطہ اسلامی تصوف اور اس کی روحانیت ہے۔ لہ

دراصل اقبال کو حکماء مغرب کے فلسفوں اور نظریوں کی دلفریب تاریکیوں میں گم ہو جانے سے اگر کسی چیز نے محفوظ رکھا ہے۔ تو وہ اسلامی روحانیت و اخلاق ہی کی روشنی ہے۔ ورنہ آج اقبال، اقبال نہ ہوتے بلکہ مشرق کے "گیٹے" یا "نطشے" ہوتے۔

علامہ کی رائے میں قیام پاکستان سے قبل ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی کا علاج یہی تھا کہ ان کی اپنی حکومت قائم ہو جائے۔ اور وہ اس قومی ضرورت کی تکمیل کیلئے قوم کے ہر فرد کو سرگرم عمل دیکھنا چاہتے تھے جسے اس جد و جہد کے سوا کسی دوسری جہت میں مصروف عمل پایا۔ اس پر سخت نکتہ چینی کرتے رہے۔ انہی خیالات سے مجبور ہو کر انہوں نے فرمایا تھا۔ کہ میں روحانیت کا قائل ہوں۔ مگر اس کے سیاسی مفہوم کا مطلب یہی تھا کہ حصول آزادی کے لئے اہل تصوف اور ارباب روحانیت بھی جد و جہد کریں۔ نہ یہ کہ روحانیت سیاست کی محتاج ہے۔ اس زمانے کے قومی حالات اسی خیال کے مقتضی تھے۔ اس لحاظ سے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

البتہ اگر قیام پاکستان کے بعد علامہ نے پاکستانی مسلمانوں کی بالخصوص جاہ پرستوں کی اخلاقی پستی کے شرمناک مظاہرے دیکھے ہوتے تو ضرور یہ فرمانے پر مجبور ہوتے کہ میں سیاسی اقتدار کا قائل ہوں بشرطیکہ اخلاق و روحانیت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ یعنی روحانیت کے سیاسی مفہوم کے بجائے وہ سیاست کے روحانی مفہوم

لہ مزید وضاحت کے لئے میرے مضامین "تصوف اور اقبال" "حقیقت انسانیہ" اور "اقبال پر صوفیائے کرام کے زبردست اثرات" ملاحظہ ہوں۔

Marfat.com

پیدا ہو رہے تھے ــــــــ اس میں شک نہیں کہ قومی آزادی و خود مختاری بیش قیمت نعمتیں ہیں۔ اور ان کے بغیر ترقی یافتہ اقوام میں کسی قوم کی کوئی عزت نہیں ہو سکتی لیکن آزادی و خود مختاری کے بعد اگر ملک میں خود غرضی، اقربا پروری، خویش نوازی، بد اعمالی نسلی، صوبائی یا مذہبی عصبیت، لاقانونیت، بے ایمانی، بد دیانتی، چور بازاری، عورتوں اور بچوں کے ساتھ اخلاق سوز سلوک وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ کہ ایسے تمام عیوب کا دور دورہ ہو جائے۔ جو انسان کی قوتِ غضب اور قوتِ شہوت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور جن کا ارتکاب معاشی بدحالی سے مجبور ہو کر نہیں کیا جاتا۔ [حالانکہ انسانیت کا جوہر سب سے زیادہ غربت و افلاس ہی میں چمکتا ہے۔ بقول اقبال ؎

اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے سکندری سے نہیں

تو ایسی آزادی و خود مختاری نعمت کی بجائے لعنت بن جاتی ہے۔ ان برائیوں سے انسان کو اگر کوئی چیز محفوظ رکھ سکتی ہے تو یہی کہ اسے بچپن سے اخلاقی و روحانی تربیت دی جائے۔ تاکہ اس کے دل میں خدا کی محبت گھر کر جائے۔ اسے قوتِ غضبیہ و شہوانیہ پر قابو حاصل ہو جائے۔ اور وہ خلوص و دیانت کے ساتھ خلق اللہ کی خدمت کا عادی بن جائے۔

اس کام میں صوفیائے کرام ہمیشہ مصروف رہے۔ اور آج بھی مصروف ہیں۔ لیکن ضرورت ہے کہ تمام سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اصلاحِ اخلاق اور تعمیر کردار کی طرف خاص توجہ کی جائے۔ لیکن یہ کام یہیں ختم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اخلاقی تربیت کی سب سے بڑی ذمہ داری خود والدین کی ہے اور جب تک والدین اپنے بچوں کے کردار کی تعمیر کی جانب پورے انہماک کے ساتھ توجہ نہ کریں گے۔ خاطر خواہ کامیابی ناممکن ہے۔

Marfat.com

بہرحال یہ ثابت ہوگیا کہ اخلاقی و روحانی تربیت کسی سیاسی اقتدار کی محتاج نہیں ہے۔ نہ سیاسی و معاشی نظاموں کی استواری صوفیائے کرام کا کام ہے۔ ان کی جماعت دراصل ایک قسم کے مدرسین و معلمین کی جماعت ہے۔ اور وہ اپنے مخصوص مشن کی حد تک ہر وقت اپنا فرض ادا کرتے رہتے ہیں۔

کوتاہی دراصل ارباب اقتدار اور والدین کی ہے۔ کہ وہ اپنے فرائض ادا نہیں کرتے۔ اور الزام صوفیائے کرام پر رکھتے ہیں۔ یہی حالت ان "مسٹروں" کی ہے۔ جو تھوڑی سی انگریزی دانی پر اپنا سب کچھ قربان کر چکے ہیں۔ انہیں اسلام اور اسلامی فقر و تصوف پر اعتراضات کا خبط ہے۔ حالانکہ اس کی ابجد بھی نہیں جانتے۔ کم و بیش یہی حال بعض اوقات انگریزی دان فضلاء کا نظر آتا ہے جو "موڈرن" اور "ریشنل" (فیشن پسند اور استدلال پرست) بننے کے شوق میں مبدا و معاد، غیب و باطن، روح و معنی، اخلاق و روحانیت، نماز و عبادت وغیرہ اسی انواع کے دیگر حقائق کا انکار کر بیٹھتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات ان کا تمسخر استہزائے اسلام کی حدود کو چھو لیتا ہے۔ ان کی تقلید کرتے ہوئے عوام الناس بھی خدا و رسول کی نافرمانی اور بزرگان دین کی توہین میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس سے وہ اللہ اور اس کے محبوب بندوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ البتہ اس کا عذاب معاشرے کی لعنتوں کی صورت میں خود ان ہی کے سروں پر نازل ہو رہا ہے۔ جو قوم صحیح راستہ پر نہیں چلتی۔ اور صحیح راستہ بتانے والوں کا مذاق اڑاتی ہے۔ وہ خدا کے عذاب میں اسی طرح گرفتار ہوتی ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ ط

آخر میں ارباب تصوف بالخصوص بلتدیوں سے یہ گذارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ انہیں بھی اس مغالطے میں نہ رہنا چاہیئے کہ قومی آزادی و خودمختاری کو خطرات سے محفوظ رکھنا ان کا کام نہیں ہے۔ بالخصوص زمانہ موجودہ میں جب کہ ہم ہر جگہ استعما

Marfat.com

پرست اقوام کے پنجۂ استبداد میں مختلف طریقوں سے پھنسے ہوئے ہیں جب کہ بعض اسلامی ممالک میں ہمارے نہتے اور کمزور بھائیوں پر، ان کی مجبور ماؤں، بہنوں اور کم سن بچوں پر استعمار پرست اقوام کے ہوائی جہاز صرف اس جرم کی پاداش میں بم باری کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان کی استعمار پرستی کی لعنتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جب کہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے مٹانے کے لئے ہمارے دشمن اربوں روپیہ کا سامان حرب اکٹھا کر رہے ہیں۔ اور یقیناً ایک دن ہمیں ان تمام دشمنوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

ان حالات میں قوم کے ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ —

- ایک ہوشیار پاسبان کی طرح اپنی آزادی و خودمختاری کی حفاظت کرے۔
- ایک سپاہی کی طرح ہر وقت دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہے۔ اور
- بوقتِ ضرورت ایک مردِ مجاہد کی طرح میدانِ جنگ میں شجاعت و جواں مردی کے جوہر دکھاتا ہوا۔ غازی یا شہید کا درجہ حاصل کرے۔

انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کو یقیناً منجانب اللہ یہ قوت حاصل رہتی ہے۔ کہ وہ چاہیں تو دشمنوں کو معجزات وکرامات کے ذریعہ زیر کرلیں۔ یا مادی ذرائع کی مدد لے کر انہیں مغلوب کریں۔ یا دونوں ذرائع استعمال کریں۔ جیسا کہ سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے کیا۔ لیکن موجودہ دورِ انحطاط میں ہم وہ رُوحانی قوت نہیں رکھتے جو دشمنوں پر غالب آنے کے لئے کافی ہو۔ اور اگر یہ طاقت ہو تب بھی آقائے دوجہان صلے اللہ علیہ وسلم کی تقلید میں موجودہ زمانے کے تمام ضروری مادّی وسائل کی فراہمی کا بندوبست کرنا اور انہیں اپنی بھلائی یا دشمنی کے استیصال کے لئے استعمال کرنا ضروری ہے۔ یہ کام روحانیت کے منافی نہ پہلے تھا نہ آج ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اصل مقصد کے تابع رہتے ہوئے قومی فلاح وبہبود کے لئے جدوجہد کرنا رُوحانیت کے

Marfat.com

منافی نہیں ہے۔ سرکارِ دوعالم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور ان کے صحیح جانشینوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں جدوجہد کی ہے۔ اس کے اصول و قواعد اور نوعیت و معیار کا نمونہ ہمارے لئے چھوڑا ہے۔ اور وہی ہمارے لئے ہم سب کیلئے خواہ صوفی ہوں خواہ غیر صوفی ـــــ بہترین نمونہ ہے۔

پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ علامہ اقبال نے انہی خیالات اور ملی ضروریات کے پیش نظر ہر اس چیز پر اعتراضات کئے ہیں جس سے قومی عزت و عظمت اور ترقی و استحکام میں فرق آتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ قومی محبت کے جوش میں ان کی تنقید کا لہجہ بعض اوقات تلخ ہو گیا ہے۔ اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ جس کے باعث ان کی فکر و نظر کا سرسری مطالعہ کرنے والوں نے کبھی یہ نتیجہ نکالا کہ علامہ تصوف یا روحانیت کے خلاف تھے۔ اور کبھی یہ رائے قائم کر لی کہ اولیاء عظام اور صوفیائے کرام کا مشرب فقر و تصوف خدانخواستہ کوئی غیر اسلامی چیز ہے۔ لیکن نگاہِ تحقیق کے سامنے مصالح ملکی و ملّی کے بادلوں میں بھی حقیقت کا آفتاب ہمیشہ روشن رہتا ہے اور وہ جذبات "لاعلمی" اور "تعصب" کے پردے ہٹا کر حق کا مشاہدہ کر لیتی ہے۔

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب

(۱۰)

قرآنی انسان

(1)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ط

قرآن پاک (۹۵ - ۴)

ہم نے بنایا انسان کو بہترین انداز (یا نمونے) پر

(2)

فَاِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ فَاَعْرِفْ نَفْسَكَ
یَا اِنْسَانُ تَعْرِفُ رَبَّكَ۔ (حدیث قدسی)

پس اللہ تعالےٰ نے پیدا کیا انسان کو اپنی صورت پر پس پہچان اپنے نفس کو اے انسان تاکہ پہچانے تو اپنے رب کو۔

Marfat.com

قرآنی انسان

"..... قرآن پاک میں انسان کا جو تصور ہے۔ اس کے بموجب انسان اپنی ہستی کی گہرائیوں میں ایک تخلیقی فعلیت ہے۔ ایک ایسی آگے بڑھنے والی رُوح ہے جو اپنے سفر کے دوران میں وجود کی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف ترقی کرتی جاتی ہے۔"

(اسلامی تفکر کی تشکیل جدید طبع دوم صـ ۱۲ — عزیز احمد۔ نئی تشکیل صـ ۳۸۷)

مذکورۂ بالا اقتباس میں علامہ اقبال نے جو کچھ فرمایا ہے۔ بالخصوص آخری جملے میں وہ قطعاً صحیح ہے۔ اس کی شرح و تفصیل کے لئے میرا مقالہ "حقیقتِ انسانیہ اور اس کی معراج" ملاحظہ کیجئے۔ البتہ "تخلیقی فعلیت" سے جو ابہام پیدا ہوتا ہے۔ اسے دُور کئے بغیر قرآنی انسان کی صحیح تصویر نظر نہیں آسکتی۔

"تخلیقی فعلیت" تو انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ خواہ اس کی تخلیقات کا نتیجہ خیر ہو یا شر۔ البتہ قرآن پاک کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ وہ انسان کے عمل و کردار پر پابندی عائد کرتا ہے۔ تاکہ اس کی سرگرمیاں صفحۂ زمین پر خرابیاں نہ پیدا کریں۔ اسی لئے اسلام مسلمانوں کے ہر فعل کو خواہ اس کا تعلق سیاسیات سے ہو خواہ معاشیات سے پرائیویٹ زندگی سے ہو یا پبلک لائف سے، قرآن و سنت کے تابع رکھتا ہے۔ اسی لئے اس کے فرائض کی تقسیم خدا اور مخلوقِ خدا کے لحاظ سے الگ الگ کر دی گئی ہے۔ اور انھیں اسلامی لٹریچر میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں تحصیل علم، کسب حلال، اکتساب دولت، محنت و مشقت، ایجادات و اختراعات وغیرہ کی کوئی حد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ "مسخر کر دیا ہم نے تمہارے لئے زمین و آسمان کو اور جو کچھ ہے ان کے درمیان" — کہہ کر لا انتہا ذہنی و مادی ترقی کا وسیع میدان

Marfat.com

ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ لیکن خالق موجودات کو اس بات کا بھی علم تھا کہ اگر اس وسیع میدان ترقی میں انسان کو دوڑنے کی غیر مشروط آزادی دے دی گئی تو وہ دنیا میں ناحق جنگ وجدال اور فساد وخون ریزی کا باعث بن جائے گا۔ لہذا اس نے وحی و نبوت کے ذریعہ اس کی آزادی پر پابندیاں عائد کر دیں اور "عمل صالح" پر خاص زور دیا۔ اور بار بار مختلف طور پر اسی کی تکرار کی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام "انسان کی تخلیقی فعلیت" کے منافی ہے اور ہم خواہ مخواہ ایک ملزم کی حیثیت سے غیر مسلم اقوام کے سامنے اس کی طرف سے صفائی پیش کریں اور اس کے اصل کارنامے کو ان سے پوشیدہ رکھیں۔ یہ دراصل ہمارے احساس کمتری کا اظہار ہے۔ اگر آج دنیا میں مسلم ممالک اقوام مغرب سے مادی ترقی میں پیچھے ہیں تو اس کی وجہ اسلام نہیں ترک اسلام ہے۔ اگر باہمی مناقشات کے بجائے ہم نے اسلام کی صحیح روح پر عمل کیا ہوتا۔ تو میدان ترقی ہمارے لئے مسدود نہ تھا۔ جو قوم باہمی مناقشات میں الجھی رہتی ہے۔ اسے ترقی کرنے کی طرف توجہ کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ اور وہ ہمیشہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کی بجائے دوسروں کے سر الزام رکھتی ہے۔

اسی طرح اگر آج اقوام مغرب ایٹمی ایجادات کا غیر مشروط استعمال کر کے دنیا کو آن واحد میں تباہ کرنے کی دھمکیاں دے رہی ہیں۔ تو یہ بھی اسلامی پابندیاں قبول نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ دنیا کو تباہی سے بچانے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ ایٹمی ایجادات کے استعمال پر اسلامی پابندیاں عائد کی جائیں۔ (یعنے ہر شخص کو بالخصوص ایٹمی ایجادات کو استعمال کرنے والوں کو کسی طرح مجبور کیا جائے۔ کہ وہ اسلام یعنے امن کی زندگی اختیار کریں۔ انسانیت کی تباہی کو سب سے بڑا گناہ اور اخلاق و روحانیت کو بہترین اقدار حیات سمجھیں اور اپنی کوششیں زیادہ تر انہی کے حصول پر مرکوز رکھیں۔ ورنہ مخلوق خدا کی نہ کوئی خدمت ہو سکتی ہے۔ نہ دنیا میں امن و سلامتی اور خوشی و خوشحالی کا دور دورہ

Marfat.com

ہو سکتا ہے۔ مندرجہ بالا امور اسلامی کی تبلیغ اور خود ان پر عمل درآمد کرنا ہی مسلمانوں کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ ہو سکتا ہے۔ نہ کہ محض سائنسی ایجادات۔

کیا سائنسی تحقیقات کے ذریعہ دنیا کے امن و خوشحالی کو تباہ کرنے والوں کو کسی لحاظ سے "انسان" کہا جا سکتا ہے۔ کم از کم قرآن انہیں "انسان" نہیں کہتا۔

اسی طرح مہذب معاشرے میں فرد کی اخلاق سوز حرکتوں کو "بہیمیت" کہا جاتا ہے۔ اور جو شخص معیاری اخلاق سے پیش نہ آئے اس کی بابت کہتے ہیں کہ اس میں ذرا بھی انسانیت نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ انسان بننے کے لئے کسی نہ کسی شکل میں اخلاق کی پابندی ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے حصول علم، تحقیق و تدقیق، مادی ترقی، حصولِ مال و دولت اور سائنسی ایجادات کی کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ وہ صرف ان کے حصول اور استعمال پر پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اور حیات انسانی کو اخلاقی و روحانی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ انسان روئے زمین پر ناحق خونریزی اور فساد برپا نہ کرے۔

علامہ اقبال نے مندرجہ ذیل اشعار میں اسی خطرے سے ہمیں آگاہ کیا ہے :۔

بُرا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اُسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

یا

جواناں را بد آموز است ایں عصر
شب ابلیس را روز است ایں عصر

اب اس سلسلے میں قرآن پاک کی چند آیات ملاحظہ ہوں :۔

العصر (۱۰۳-۱ تا ۳) قسم ہے عصر کی بے شک سب آدمی گھاٹے میں ہیں۔ مگر جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو حق پر چلنے کی نصیحت کرتے رہے۔ اور (مصیبت میں)

صبر کرنے کے لئے کہتے رہے۔

توبہ (۹-۱۰۹) بھلا جو شخص اللہ کے ڈر سے اس کی رضامندی کے لئے اپنی عمارت کی بنیاد رکھے۔ وہ اچھا ہے یا جو پھسپھسے پھٹے ہوئے کگار کے کنارے پر اپنی بنیاد رکھے۔ پھر وہ کگار (دھڑام سے) اس کو دوزخ کی آگ میں لے گرے۔

الرعد (۱۳-۱۹) بھلا جو شخص یہ جانتا ہے کہ تیرے مالک کی طرف سے جو تجھ پر اترا وہ حق ہے (اس پر ایمان لاتا ہے) وہ اس شخص کی طرح ہے۔ جو (دل کا) اندھا ہے؟

فاطر (۳۵-۱۹ تا ۲۲) اندھا اور آنکھ والا برابر نہیں ہو سکتا اور نہ اندھیرا اور اُجالا۔ (یعنے کفر و ایمان) اور نہ سایہ اور دھوپ اور زندے اور مُردے برابر نہیں ہیں۔

ص (۳۸-۲۸) کیا جو لوگ ایمان لائے۔ اور انہوں نے اچھے کام کئے۔ ان کو ہم ان لوگوں کی طرح کر دیں گے۔ جنہوں نے زمین میں فساد برپا کیا۔ کیا ہم پرہیزگاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں گے۔

الزّمر (۳۹-۹) بھلا جو شخص رات کی گھڑیوں میں عبادت میں لگا ہے۔ کبھی سجدہ کرتا ہے کبھی کھڑا ہے۔ آخرت سے ڈرتا ہے اور اپنے مالک کی مہربانی کی امید رکھتا ہے۔ اے پیغمبرؐ! کہدیجئے کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ نصیحت وہی مانتے ہیں جو عقل والے ہیں۔

الشمس (۹۱-۹ و ۱۰) بے شک جس نے نفس کو صرف کیا کامیاب رہا۔ اور جس نے اسے میلا کیا ناکام رہا۔

اعراف (۷ - ۱۷۹) انکے دل ہیں لیکن سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں ان کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ ڈھوروں کی مانند ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ

قرآن پاک اس قسم کی آیات سے پُر ہے۔ جن سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ وہ کن اوصاف والے افراد کو "انسان" قرار دیتا اور کسے "جانور" بلکہ "ان سے بھی زیادہ گمراہ" بتاتا ہے۔ ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن پاک میں "عمل محض" یا صرف "تخلیقی فعلیت" کو ہرگز معیار انسانیت قرار نہیں دیا گیا۔ تخلیق، انسانی عقل کا کارنامہ ہے۔ جو اکثر جانوروں اور پرندوں کی جبلت سے شکست کھا جاتی ہے۔ ایک ہوا باز صحیح سمت میں جہاز لے جانے کے لیئے آلات کا محتاج ہے۔ لیکن بعض پرندے کسی آلے کی مدد کے بغیر اپنی منزل کی طرف سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ مچھلیاں سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں اپنا راستہ کسی آلے کی مدد کے بغیر ہی پہچان لیتی ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس کا کمال محض عقل یا مذکورہ نوعیت کے ادراک یا کشمکش حیات اور تسخیر فطرت تک محدود نہیں۔ بلکہ اسے ان تمام امور سے آگے بڑھ کر اپنے نفس کی ماہیت پر غور کرنا ہے۔ تاکہ اس کے عرفان سے اُسے خدا کا عرفان حاصل ہو۔ قرآن پاک انسانوں کو اَنفس و آفاق پر غور کرنے کی تاکید کرتا ہے لیکن انفس و آفاق میں آفاق کا درجہ ثانوی ہے۔ اور وہ بھی اسی لئے ہے۔ کہ عرفان نفس میں مدد دے تاکہ خدا کا عرفان حاصل ہو جو تخلیق انسانی کی غرض و غایت ہے

اس طرح معلوم ہوا کہ اسلام میں "عمل" اور "تخلیق" اصل مقصد (عرفان رب) سے مشروط ہیں اور "انسان" وہی کہلائے گا۔ جو ان شرائط کی تکمیل کرتا ہو۔

"انسان" کا معیار مقرر کرنے اور اس کے اوصاف بیان کر دینے کے بعد قرآن پاک آگے بڑھنے کی تاکید کرتا ہے۔ جیسے علامہ اقبال نے یہ کہہ کر واضح کیا ہے۔ کہ وہ "ایک ایسی آگے بڑھنے والی رُوح ہے۔ جو اپنے سفر کے دوران میں وجود کی ایک حالت سے

Marfat.com

دوسری حالت کی طرف ترقی کرتی جاتی ہے"۔ ؎۱

قرآن پاک کے الفاظ یہ ہیں :-

یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ...... الخ

ترجمہ :- اے نفسِ مطمئنہ ! اپنے رب کی طرف چل کر تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ چل میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔ (۹۰ — ۲۷ تا ۳۰)

اس طرح قرآن پاک خاص طور پر درجۂ یقین، طمینانِ قلب و روح اور قُرب حق کی منزل ہمارے سامنے رکھتا ہے۔ جس کی طرف بڑھنا "قرآنی انسان" بننے کے بعد ہی نصیب ہو سکتا ہے۔ مذکورۂ بالا آیات پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ نفسِ مطمئنہ کے لئے۔ (۱) رب کی جانب رجوع کرنا۔ (۲) اللہ سے اس کا راضی ہونا۔ (۳) اللہ کا اس سے راضی ہونا ...... ضروری ہے۔ ان صفات کا ثمرہ یہ ہوگا۔ کہ وہ نفسِ مطمئنہ اللہ کے بندوں میں شامل اور اللہ کی جنت میں داخل ہو گا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ اللہ کے بندے تو سب ہی ہیں۔ خواہ مؤمن ہوں خواہ کافر، مشرک یا فاسق و فاجر۔ پھر میرے بندے اور میری جنت کہنے کے مخصوص معنے ہونے چاہئیں۔ چنانچہ صوفیائے کرام نے ان سے "خاص بندے" (اولیاء کرام) اور "خاص مقامِ قُرب" مراد لیا ہے۔ اور اسلامی تصوف ان حقائق پر ایمان لانے والوں کے سامنے یہی نصب العین رکھتا ہے جو تمام تحقیقات سے آگے ہے۔

الٰہی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکان اور بھی ہیں

مختصر یہ کہ آیات قرآنی کے بموجب "قرآنی انسان" محض "تخلیقی فعلیت" نہیں

؎۱ حوالہ کے لئے وہ اقتباس دیکھئے جو اس مضمون کے شروع میں درج ہے۔

ہے۔ بلکہ اخلاقی و روحانی فعلیت بھی ہے۔ جو خدا تک پہنچ کر ہی دم لیتی ہے۔ از روئے قرآن یہ آخری صفت زیادہ اہم اور دوامی انعامات الٰہیہ کی حامل ہے۔ علامہ اقبال کے ان الفاظ سے کہ "انسان ایک ایسی آگے بڑھنے والی روح ہے جو اپنے سفر کے دوران میں وجود کی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف ترقی کرتی جاتی ہے"[1] وہی مطلب ہے۔ جو صوفیائے کرام رجوع الی اللہ اور حصول قرب حق وغیرہ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اسلام کا یہ نظریہ اُن مادّہ پرستوں کی اصلاح کے لئے ہے۔ جو صرف مادی ترقی اور ایسی تخلیقی فعلیت کے قائل ہیں جو مادی زندگی تک محدود ہو۔

حدیث شریف میں آیا ہے:۔

اَلْمُسَافِرُوْنَ ثَلٰثَۃُ اَصْنَافٍ صِنْفٌ یُسَافِرُ فِی الدُّنْیَا رَأْسُ مَالِہِ الدُّنْیَا وَرِبْحَتُہُ الْمَعْصِیَۃُ وَالنَّدَامَۃُ وَصِنْفٌ یُسَافِرُ فِی الْاٰخِرَۃِ رَأْسُ مَالِہِ الْاِطَاعَۃُ وَالْعِبَادَۃُ وَرِبْحَتُہُ الْجَنَّۃُ وَصِنْفٌ یُسَافِرُ اِلَی اللہِ رَأْسُ مَالِہِ الْمَعْرِفَۃُ وَرِبْحَتُہُ لِقَاءُ اللہِ تَعَالٰی

مسافر تین قسم کے ہیں۔ بعض سفر کرتے ہیں دنیا میں اور ان کا رأس المال دُنیا ہے۔ اور ان کا سود گناہ و ندامت (یہ لوگ بہائم کی مانند ہیں جو حرص، ہوا اور نفس پرستی کے سوا دوسرا مشغلہ نہیں رکھتے) اور بعض آخرت کا سفر کرتے ہیں۔ ان کا راس المال اطاعت و عبادت ہے۔ اور اس کا سود جنت (یہ لوگ حصول صفاتِ ملائکہ میں کوشش کرتے ہیں) اور بعض لوگ خدا کی طرف سفر کرتے ہیں۔ ان کا رأس المال معرفت اور سود اس کا دیدار الٰہی ہے۔

---

[1] حوالہ پہلے گذر چکا ہے۔

Marfat.com

یہ لوگ انبیاء کے مانند ہیں کہ رضاد
تسلیم کا لباس اپنے تن پر آراستہ
کر کے عشق و محبت کی مدد سے خدا
کی طرف سفر کرتے ہیں۔ انہیں باری
تعالیٰ اپنی لقاء سے مشرف فرماتا ہے[۱]۔

چونکہ اس موضوع پر "حقیقتِ انسانیہ اور اس کی معراج" کے تحت زیادہ تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس کی تکرار غیر ضروری ہے۔ مناسب ہوگا کہ تفصیل کے لئے مذکورہ عنوان کی جانب رجوع کیا جائے۔

---

[۱] دیکھو مقدمۃ الکتاب تعلیم غوثیہ۔

Marfat.com

(۱۱)

انسانِ کامل

Marfat.com

۷۸۶

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ

ترجمہ:- خبردار ہو جاؤ۔ تاکید جانو کہ اولیاء کے لئے نہ کسی قسم کا خوف ہے اور نہ انہیں کوئی غم ہوگا۔

مردانِ خُدا خُدا نہ باشند
لیکن ز خُدا جُدا نہ باشند
رومیؒ

Marfat.com

انسانِ کامل

گذشتہ صفحات میں جو توضیح "قرآنی انسان" کی پیش کی گئی ہے۔ اس کے پیش نظر انسان کامل کہلانے کا مستحق بھی وہی فرد ہو سکتا ہے جو اقرب الی اللہ ہے۔ چنانچہ اسلام میں اس لحاظ سے اس خطاب کی مستحق صرف حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے۔ اگرچہ صوفیاء کرام اولیاء عظام اور دیگر صلحاء امت اسلامیہ کو بھی کاملین میں شمار کیا جاتا ہے۔ مگر ایسا محض حصول نعمت کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ درجۂ فضیلت میں کوئی شخص محبوب خدا خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کامل نہیں ہو سکتا۔ کمال کے درجات ہوتے ہیں۔ لیکن کاملین باوجود فرق درجات کاملین کہلاتے ہیں۔ جس طرح انبیاء کرام کہلاتے ہیں۔ اگرچہ ان میں ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہے۔ صوفیاء کرام کے نظریئے کے مطابق جس طرح معجزہ دلیل نبوت یا کرامت دلیل ولایت نہیں ہے۔ اسی طرح اولیاء اللہ کے روحانی کمالات کے ثبوت کے لئے بھی انفرادی یا اجتماعی سیاسی اقتدار یا معاشی خوشحالی کا ہونا ضروری نہیں ہے یہ بالکل جدا مسئلہ ہے کہ قوم یا ملت کی بقاء و خوشحالی کے لئے سیاسی قوت و اقتدار معاشی خوشحالی اور ہر طرح کی مادی ترقی انتہائی ضروری ہے۔ اور ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ قوم کو متحد و منظم کرنے اور اسے ہر لحاظ سے کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ میں شمار کئے جانے کے قابل بنانے میں بقدر امکان حصہ لے۔ چنانچہ یہ فرض اللہ کے ہر نبی و رسول نے اور سب کے بعد حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انجام دیا ہے۔ لیکن اس سے کمال ولایت سے متعلق مذکورہ بالا قاعدہ کلیہ میں فرق نہیں پڑتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سیاسی غلبہ و اقتدار حاصل ہونے کے پہلے بھی نبی اور ولی تھے اور اس کے بعد بھی رہے۔ نہ سیاسی غلبہ و اقتدار کے بغیر نبوت و ولایت میں کوئی کمی تھی

Marfat.com

نہ انتظام امور ملی میں حصہ لینے سے آپ کے روحانی مراتب میں کوئی فرق آیا پس ثابت ہوگیا کہ درجۂ کمال روحانی کو ہر دو امور مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ بھی قاعدۂ کلیہ میں داخل ہے کہ انتظام امور ملکی و ملی کو احسن رکھنے کے لئے فضائل قلبی ضروری ہیں۔ مثلاً خلوص، دیانتداری، انسانی و قومی ہمدردی، خوفِ خدا، عزم و استقلال وغیرہ اور اسی قسم کے دیگر فضائل جو قرآن و احادیث اور اسوۂ مقدسہ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ فضائل قلبی میں عروج روحانی بھی شامل ہے لیکن وہ انفرادی ہوتا ہے۔ جن افراد کے ہاتھ میں ملک کا انتظام ہو فرداً فرداً ان کے قلوب کا فضائل سے معمور ہونا ضروری ہے۔

انسان ظاہر و باطن کا مجموعہ ہے۔ ظاہر کی ترقی باطنی ترقی میں مانع نہیں ہوتی اور باطنی ترقی ظاہری ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ "کمال انسانیت" دراصل ذہنی، قلبی اور روحانی ترقیوں کا مجموعہ ہے۔ علامہ اقبال انہی تین چیزوں کے لئے عقل، دل اور نگاہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولین ہے عشق
عشق نہ ہو تو یہ جہاں بُت کدۂ تصورات

عشق[1] سے اُن کی مراد حُبِّ جاہ و مال نہیں بلکہ حُبِّ الٰہی و حُبِّ رسول ہی ہے۔ عقل سے تمام علوم عقلی و نقلی، جملہ ایجادات و اختراعات اور اسلامی تہذیب و تمدن وغیرہ مراد ہیں۔ دل سے وہ تمام فضائل قلبی مراد ہیں جن میں اعلیٰ اخلاق اور قربِ الٰہی کا حصول شامل ہے۔

نگاہ سے علامہ اقبال کی مراد کبھی فراست یا بصیرت مومن، کبھی عاشقانِ الٰہی کا سوز و گداز کبھی دوسروں کی اصلاح و تربیت کی اہلیت رکھنا اور کہیں مستجاب الدعوات ہونا یا مقرب الٰہی بن جانا ہے۔

---

[1] عشق کے وسیع معانی کی تفصیل مقالہ ۲ میں گذر چکی ہے۔

Marfat.com

نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یا

زباں نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

چونکہ قرآن و سنت میں کثرتِ مال و اولاد کو سلامتی قلب کے مقابلے میں ہیچ قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے اولیاء کرام نے سلامتی قلب پر ہی توجہ دی ہے۔ اور اسی کے حامل انسان کو انسان کامل کہا ہے۔

"عاشقانِ الٰہی" (کاملین) سے متعلق حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

"اللہ عزوجل کے بندوں میں کچھ ایسے بندے ہیں کہ ان پر رشک کھاتے ہیں۔ خدا کے نبیؑ اور شہیدؓ۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا کہ وہ کون لوگ ہیں۔ یا رسول اللہؐ! آپ ان کی صفت بیان فرمائیے تاکہ ہم انہیں دوست رکھیں۔ فرمایا وہ ایک قوم ہے جو دوست رکھتی ہے روح اللہ یعنے اللہ کے امر کو بغیر مالوں اور کسبوں کے۔ ان کے چہرے پر نور ہیں۔ اور وہ نور کے ممبروں پر ہوں گے جس وقت لوگ خوف کھائیں گے۔ انہیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ اور جس وقت لوگوں کو غم ہوگا۔ انہیں کسی قسم کا غم نہ ہوگا۔

پھر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:۔

اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ [1]

پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ "انسانِ کامل" مستجاب الدعوات ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ زبان سے کہہ دے وہی ہوتا ہے۔ اس کا ارادہ خدا کا ارادہ اور اس کا فعل خدا کا

---

[1] کشف المحجوب۔

Marfat.com

فعل ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی میں ہے :-

ترجمہ :- عبد برابر طاعات و عبادات سے تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ آخر میں وہ میرے اوصاف کا آئینہ بن جاتا ہے۔ میں ہی اس کا کان بن جاتا ہوں اور وہ میرے ذریعہ سنتا ہے۔ میں ہی اس کی آنکھ بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے دیکھتا ہے۔ میں ہی اس کی زبان بنجاتا ہوں کہ وہ میرے ذریعہ بولتا ہے۔ اور میں ہی اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ اس سے عمل اور تصرف کرتا ہے۔ اور میں ہی اس کا پانوں بن جاتا ہوں کہ وہ مجھ سے چلتا ہے۔"

چنانچہ آیات قرآنی :-

مَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ[1] (۸ - ۱۷) اور

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ ...... يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ[2] (۴۸-۱۰)

اور اولیاء اللہ کی متعدد کرامات مذکورۂ بالا حقائق پر مہر تصدیق ثبت کر چکی ہیں۔ دیگر علماء و حکماء کی علمی و ذہنی ترقی اور ان کی ایجادات و اختراعات بھی بلا شک اہل عالم کی فلاح و بہبود اور ان کے آرام و آسائش کا زبردست ذریعہ ہیں لیکن اولیاء اللہ کے ذرائع تصرفات و عمل ان سے مختلف ہوتے ہیں۔ علماء و حکماء اپنے تصرفات میں علوم عقلی اور ذرائع مادی کی مدد لیتے ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن اولیاء کرام اللہ تعالیٰ کے خاص مقرب ہونے کی وجہ سے ذرائع مادی کے بغیر ہی امور عالم میں تصرف کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ بعض اوقات ان

---

[1] اور تو پھینکا تو نے جس وقت کہ پھینکا تھا۔ ولیکن اللہ نے پھینکا تھا۔

[2] تحقیق وہ لوگ کہ بیعت کرتے ہیں تجھ سے۔ سوائے اس کے نہیں کہ بیعت کرتے ہیں اللہ سے۔ ہاتھ اللہ کا ہے ان کے ہاتھوں پر ۱۲

Marfat.com

سے محیر العقول کارنامے ظاہر ہوتے ہیں۔ معجزات انبیاء کرام اور کراماتِ اولیاء کا شمار اس ضمن میں ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانائے رُوم فرماتے ہیں :۔

تا کجا ایں حکمتِ یونانیاں ⁂ حکمتِ ایمانیاں راہم بخواں
ہست قدرت اولیاء را از اِلٰہ ⁂ تیرِ جستہ باز گردانند زراہ
گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ⁂ گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

مختصر یہ کہ اسلام میں اللہ کے مقربان خاص کو جو اللہ کی عنایت خاص سے متصرف بہ امور عالم ہوتے ہیں "کامل انسان" کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ درجہ یا مقام عام اشخاص کے لئے نہیں ہے۔ نہ ان کے لئے ہے جو محض عقل استدلالی کے پائے چوبیں کے سہارے زمین و آسمان کے قلابے ملانا چاہتے ہیں۔

اسلام علوم عقلی کے حصول کی تاکید کرتا ہے۔ اور ترقی کی کوئی حد مقرر نہیں کرتا ہے۔ لیکن اس کی غرض و غایت خدا کی شکر گزاری اور خدمتِ خلق اللہ قرار دیتا ہے اسی لئے صوفیاء کرام نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے۔ اور اس پر عمل درآمد بھی کیا کہ انسان پہلے علوم معقول و منقول حاصل کرے۔ بعد ازیں یا ساتھ ساتھ روحانیات کی جانب بھی توجہ دے تاکہ علوم عقلی کی اصل غرض و غایت (خدا ترسی، شکر گزاری جذبہ خدمت خلق اللہ وغیرہ) فوت نہ ہونے پائے۔ نیز مومنین و مکذبین کی "ترقی" اور ان کے "درجات عمل" میں امتیاز باقی رہے۔

ہر چیز کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہوتا ہے۔ باطن ظاہر کی بنیاد بنتا ہے اور اس سے زیادہ وسیع و اہم ہوتا ہے۔ انسان کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اسی طرح حیات انسانی کا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ دونوں مل کر جامعیت کا درجہ اختیار کرتے ہیں۔ لیکن آثار و احکام دونوں کے جدا جدا ہوتے ہیں۔ انسان فطری طور پر اپنے باطن کی طرف رجوع کرنے کے لئے مجبور ہے۔ اس کی زندگی محض کوئی ظاہری

Marfat.com

"لفظ" نہیں "معنے" بھی ہے۔ اور ہر چیز کی طرح اس کی معنوی حیثیت ہی اس کی ظاہری حیثیت سے زیادہ اہم ہے۔ اسلام اور دیگر مذاہب میں یہی فرق ہے کہ دیگر مذاہب بالعموم ظاہر کی تعمیر میں سارا زور صرف کر دیتے ہیں۔ لیکن اسلام باطن کی اصلاح کے لئے ظاہر کی دنیا تعمیر کراتا ہے۔ آخرت کے لئے دنیا کی زندگی کو درست رکھنے کے ضوابط بناتا اور دنیا کی زندگی کو آخرت کی کھیتی قرار دیتا ہے۔ عبادات میں ظاہر و باطن کے ڈانڈے ملانے کی تاکید کرتا ہے۔ کیونکہ ارتقاء روحانی ہی خدا سے قریب ہونا یا اس سے ملنا ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام میں تمام ظاہری و باطنی اعمال و افعال ارتقائے روحانی کا ذریعہ ہیں۔ اور وہ اصل مقصد کو قربان کر کے ذریعہ کو باقی رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ نہ اسے مستحسن سمجھتا ہے۔

اپنی زندگی اور اپنے اعمال و افعال کے دونوں پہلوؤں ـــــ ظاہر و باطن پر نظر رکھنے والے انسان دنیا میں زیادہ امن پسند، زیادہ خلیق، زیادہ انسانیت نواز، خدا اور رسول کے زیادہ فرمانبردار ان سے زیادہ قریب اور معاشرے کو زیادہ فائدہ پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ بہ نسبت ان اشخاص کے جو زندگی کے باطنی پہلو کو فراموش کر کے صرف ظاہر پر نظر رکھتے ہیں۔ بقول علامہ اقبال۔

یہ کافری تو نہیں کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود

علامہ اقبال کے نزدیک بھی "انسانِ کامل" فلسفہ و حکمت کی پیداوار نہیں بلکہ اخلاق و روحانیت کی پیداوار ہے۔ مصنف "اقبال کامل" مولانا عبدالسلام ندوی نے اثباتِ خودی کے دسویں مقدمے "مسئلہ ارتقاء" کے تحت جو بحث کی ہے۔ اُس سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال کا "انسان کامل" ایک ایسی ہستی ہے جس کا

Marfat.com

قدم اخلاقی و روحانی ترقی میں کسی منزل پر نہیں رکتا۔ فلسفہ اور سائنس جدید ترقیوں کے باوجود اب تک "انسان کامل" کے پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں[۱]۔ یہ انسان اصول فطرت کے مطابق صرف روحانی ارتقاء سے پیدا ہو سکتا ہے۔ معدنیات کی ترقی کا آخری درجہ نباتات سے اور نباتات کا آخری درجہ حیوانات اور حیوانات کا آخری درجہ انسان سے اور انسان کا آخری درجہ ملائکہ سے ملا ہوا ہے۔ اور ملائکہ کے بھی مختلف درجے ہیں۔ جن میں باہم اسی طرح ابتداء و انتہاء ملتی ہے۔[۲]

حیوان نما انسان یا انسان نما حیوان میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ بندر یا بن مانس شکل و صورت میں انسان کے مانند ہوتا ہے۔ ذرا سی تربیت سے کپڑے پہننا، کرسی پر بیٹھنا اور میز پر انسان کی طرح کھانا کھانا بھی سیکھ جاتا ہے۔ لیکن اس میں "انسانیت" کا عنصر نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض آدمی بھی "انسانیت" سے محروم رہتے ہیں۔ "انسانیت" کے درجے میں پہنچ کر ذہنی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے ارتقاء شروع ہوتا ہے۔ جو صوفیاء کرام کے عقیدے کے مطابق ولایت و نبوت پر ختم ہوتا ہے۔

پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ علامہ اقبال کے نظریے کے مطابق "انسان کامل" عقل اور دل و نظر (علم اور اخلاق و روحانیت) کا پیکر ہوتا ہے۔ اور وہ جو عالم پیدا کرتا ہے وہ بھی انہی اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔

خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ!\
عشق را با زیرکی آمیز دہ\
شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ ایست\
چشم شاں صاحب نظر دل مُردہ ایست

۱۔ اقبال کامل ص ۲۹۶

۲۔ اقبال کامل ص ۲۹۶ بحوالہ رسائلِ اخوان الصفاء۔

Marfat.com

سوز و مستی را مجو از تاک شاں
عصرِ دیگر نیست در افلاک شاں
زندگی را سوز و ساز از نارِ تست
عالمِ نو آفریدن کارِ تست

علامہ کے نزدیک اس قسم کا "انسان کامل" اور اس کا تیار کیا ہوا "عالمِ نو" خودی کی آخری منزل ہے۔ جسے وہ نیابتِ الٰہی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں حضرت عبدالکریم الجیلی قدس سرہ العزیز کا ذکر ضروری ہے۔ الجیلی علیہ الرحمۃ نے بھی انسان کی روحانی تربیت کے تین مراحل مقرر کئے ہیں۔ اور اقبال بھی اسے (۱) اطاعت (۲) ضبطِ نفس اور (۳) نیابتِ الٰہی میں تقسیم کرتے ہیں۔ ممکن ہے اقبال نے ان تین مراحل کا خیال الجیلیؒ سے ہی لیا ہو[1]۔ بہرحال تیسرے مرحلہ میں اقبال اور الجیلیؒ قریب قریب ہم خیال ہو جاتے ہیں۔ الجیلیؒ نے تیسری منزل میں "انسان کامل" کے اوصاف یہ بیان کئے ہیں:۔

پھر جان کہ اللہ تعالیٰ نے اس اسم کو انسان کے لئے ایک آئینہ بنایا ہے پھر جب اپنے منہ کو اس آئینے میں دیکھا تو اس پر اس بات کی حقیقت کھل گئی کہ

كَانَ اللّٰهُ وَلَمْ يَكُنْ مَعَهُ شَيْئًا

ترجمہ:۔ تھا اللہ اور نہ تھی اس کے ساتھ کوئی شے

پس اس پر ظاہر ہو گیا کہ اس کی شنوائی اللہ کی شنوائی ہے۔ اور اس کی آنکھ اللہ کی آنکھ ہے۔ اور اس کا کلام اللہ کا کلام ہے۔ اور اس کی حیات اللہ

---

[1] علامہ اقبال نے حضرت الجیلیؒ پر ایک مضمون بھی لکھا تھا۔ جسے بعد میں انہوں نے "فلسفۂ عجم" میں شامل کر لیا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ اقبال نے تین مراحل کا خیال نٹشے سے لیا ہے۔

Marfat.com

کی حیات ہے۔ اور اُس کا علم اللہ کا علم ہے۔ اور اُس کی ارادت اللہ کی ارادت اور اُس کی قدرت اللہ کی قدرت ہے۔ [1]

یہ دراصل وہی حدیث قرب نوافل ہے جو زیر نظر مقالے میں پہلے ہی بیان ہو چکی ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں :-

"جب کہ وہ "انسان کامل" کی تمام صفات ربانی سے تجلّی حاصل کر کے اسم [2] و صفت [3] اعراض کے دائرے سے گزر جاتا ہے۔ اور جوہر وجودِ [4] مطلق کے قلمرو میں قدم رکھتا ہے .... یہی وہ نقطہ ہے۔ جہاں انسانیت اور الٰہیت ایک ہو جاتی ہیں۔ اور اس کا نتیجہ انسانِ ربانی کی پیدائش ہے [5]"

اس سے بھی یہی ثابت ہوا۔ کہ علامہ اقبال کے نظریۂ خودی کے تیسرے مرحلے نیابت الٰہی کی بنیاد وصل الی اللہ [6] (ولایت) (یعنے وہ مقام جہاں انسانیت اور الٰہیت ایک ہو جاتی ہیں) پر قائم ہے۔ اور وہ ان لوگوں کو ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی جو صوفیائے کرام کے نظریۂ ولایت اور توحید حقیقت و معرفت کے حامل ہی نہ ہوں اور اسی سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس نظریہ میں فراق کی گنجائش نہیں ہے۔ جب تک فراق رہے گا۔ انسانیت اور الٰہیت نہ ایک ہو سکتی ہیں۔ نہ "انسانِ ربانی" عالم وجود میں آسکتا ہے۔

---

[1] اقبال "نئی تشکیل" از عزیز احمد صہ ۲۰۴

[2] الجیلیؒ کا مرحلۂ اول [3] الجیلیؒ کا مرحلۂ دوم

[4] الجیلیؒ کا مرحلۂ سوم

[5] فلسفۂ عجم از اقبال صفحات ۲۱۶، ۲۱۷ ——— یہ حدیث قرب فرائض کا خلاصہ ہے

[6] یہ عبارت ہمیں اقبال کی مشہور مثنوی "اسرار خودی" میں نہیں ملتی۔ (باقی صفحہ ۲۱۸ پر)

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا حالات میں علامہ اقبال نے "فراق" کی حمایت اور "وصل الی اللہ" کی مخالفت کیوں کی۔ اس کا جواب مقالہ "موت وحیات" کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبال نے "فراق" کی حمایت خاص طور پر اس مصلحت سے کی ہے۔ کہ ملت اسلامیہ (بالخصوص اس کے عوام کا طبقہ) "وصل الی اللہ" کا غلط مفہوم اپنے ذہن سے نکال دے اور اپنی زبوں حالی کو رفع کرنے کے لئے آمادۂ پیکار ہو جائے۔ انسانیت اور الہیت کے ایک ہو جانے کا مطلب ذاتِ عمل کو مفلوج بنانا نہیں ہے۔ بلکہ الٰہی قوتوں کے ذریعہ انسانیت کو سربلند کرنا ہے۔ الٰہی قوتوں کا ترک نہیں ان کا استعمال ہے۔ اور اس کا مقصد بنی نوع انسان کی تباہی نہیں بلکہ اس کی فلاح و بہبود ہے۔

جہاں تک "فراق" کے اصطلاحی مفہوم کا تعلق ہے۔ اس کا نمونہ شیطان کا کردار ہے شیطان نے آدم کے صرف ظاہر کو دیکھا اور اس کی باطنی حقیقت و فضیلت کا منکر ہو گیا۔ اس لئے وہ مردود ہوا۔ شیطان کے اس مردود نظریئے کے خلاف علامہ اقبال بھی ہیں۔ ورنہ وہ شیطان کو "خواجۂ اہل فراق" نہ کہتے

کم بگو زاں خواجۂ اہل فراق
تشنہ کام و از ازل خونیں ایاق

(جاوید نامہ)

بقیہ حاشیہ ص ۳۱۷: ۔ اس کی وجہ خواہ کچھ ہو۔ لیکن غور کرنے والوں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ کہ اسرار خودی کا فلسفہ مسلم حکماء اور صوفیائے کرام ہی کے نظریات سے ماخوذ ہے۔ جس کے ثبوت میں خود علامہ اقبال کا اعتراف اور متعدد داخلی شہادتیں میں نے زیر نظر مضامین میں پیش کی ہیں۔ اس صورت میں ان کے نظریۂ خودی کی آخری منزل وہی ہونا چاہیئے جو خط کشیدہ الفاظ میں بتائی گئی ہے۔

Marfat.com

غرض یہ کہ موجودات کی حقیقت سے متعلق غلط نظریئے کو اسلامی تصوف میں "فراق" کہا گیا ہے۔ اور علامہ بھی اس کے حامی نہیں ہیں۔ وہ حسن "فراق" کے حامی ہیں۔ اسے وصل الی اللہ کہنا چاہیئے چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں :۔

میانۂ من واو ربطِ دیدہ و نظر است
کہ در نہایت دوری ہمیشہ با اویم

عوام دراصل تصوف اسلامی کی اصطلاح "وصال" کو آسانی سے نہیں سمجھ سکتے اور غلط فہمیوں کا شکار ہو کر قوائے عمل کو مفلوج بنا دیتے ہیں۔ اس لئے اقبال نے فراق کی تلقین ضروری سمجھی۔ ورنہ اہل تصوف (خواص) کا نظریہ وصل الی اللہ نہایت بلند مرتبہ رکھتا ہے۔ انسان اور انسانیت کی صحیح عظمت و علو مرتبت کی وضاحت اسی نظریہ سے ہوتی ہے جس کی تشریح میرے بس کی بات نہیں۔ البتہ اس کے ایک پہلو کا خلاصہ مختصراً ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کہ انسان اپنے آپ کو مرکز کائنات یقین کرے۔ اور یہ سمجھے کہ کائنات کے مظاہر دراصل اسی کی حقیقت کے مظاہر اور اسی کی تفصیل ہیں۔ وہ خود عالم صغیر ہے۔ جس سے یہ عالم کبیر سرزد ہو رہا ہے۔ یہ کائنات اسی کے اجمال کی تفصیل ہے۔ بقول مولانائے روم :۔

غالب از ماہست شد نے ما از او
بادہ از ما مست شد نے ما از او

یا بقول حضرت عطار رحمۃ اللہ علیہ ؎

توئی سلطان سِرّ لا مکانی
بمعنی برتر از کون و مکانی
زمین و آسمان نورِ تو دارد
ہمہ ذرات منشورے تو دارد

Marfat.com

یا بقول حضرت مغربی رحمۃ اللہ علیہ ؎

ما جام جہاں نمائے ذاتیم
ما مظہر جملۂ صفاتیم
ما نسخۂ نامۂ الٰہیم
ما گنج طلسم کائناتیم
ہم صورت واجب الوجودیم
ہم معنے جانِ ممکناتیم
برتر ز مکان و در مکانیم
بیروں ز جہات و در جہاتیم
ہر چند کہ مجمل دو کونیم
تفصیل جمیع مجملاتیم

دراصل اشیاء میں جو خواص محسوس ہوتے ہیں۔ وہ فی نفسہٖ اشیاء میں موجود نہیں ہوتے بلکہ ادراک کی اضافت سے ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ کائنات جیسی نظر آتی ہے۔ وہ دراصل ہماری مخصوص عقل و ادراک کا نتیجہ ہے۔ اگر انسان کی عقل ادراک کا یہ انداز نہ ہوتا تو کائنات بھی جس طرح موجود و محسوس ہوتی ہے۔ ایسی نہ دکھائی دیتی۔ اپنی حقیقت کا عرفان سب کی حقیقت کھول دیتا ہے۔ اور اسی عرفان کا نام ولایت ہے۔

جرمنی کا مشہور فلسفی کانٹ بھی قریب قریب اسی نتیجہ پر پہنچا ہے۔ اس نے بتایا کہ انسان کوتاہ بینی سے مادی عالم اور زمان و مکان کی لامحدودیت سے مغلوب ہو گیا ہے۔ اگر وہ عقل و ادراک کا صحیح جائزہ لے اور عالِم و معلوم و علم کی حقیقت دریافت کرے تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا۔ کہ زمان و مکان اور علت و معلول خود انسان

Marfat.com

کے زاویۂ نظر اور آلاتِ ادراک ہیں۔ خارج میں اُن کی کوئی مستقل حیثیت نہیں۔ ہستی فی نفسہٖ کچھ بھی ہو۔ لیکن موجودات اور حوادث ہم کو جس طرح نظر آتے ہیں۔ وہ انسان کے اپنے نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں۔ مرکز کائنات نہ زمین ہے۔ نہ سورج، نہ نظام شمسی، مرکز کائنات خود انسان ہے [۱]

علامہ اقبال اور صوفیائے کرام کے سینکڑوں اشعار انہی خیالات کے ترجمان ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اہل فلسفہ پر اب یہ حقیقت واضح ہوئی ہے کہ "انسان مرکز کائنات ہے" لیکن اولیاء اللہ صدیوں پہلے اس حقیقت کا اظہار مختلف طور پر کر چکے ہیں یہی نہیں۔ اولیاء کرام کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اس نے خدا کو پہچان لیا۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

اور اسی معرفت کے لئے کائنات پیدا کی گئی ہے۔

(وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ ای لیعرفون)

چنانچہ اہل فلسفہ کو ہنوز یہ منزل طے کرنی ہے۔ جو وحی و رسالت پر ایمان لائے بغیر طے نہیں ہو سکتی۔

مختصر یہ کہ علامہ اقبال کا "انسان کامل" "نبیؐ یا ولیؒ" کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ بعض اشعار میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح بھی کر دی گئی ہے۔ مثلاً

سفر در خویش زادن بے اب و مام
ثریا را گرفتن از لب بام
ستردن نقش ہر امید و بیمے
زدن حیا کے بد بر باچوں کلیمے

---

[۱] حکمتِ رومیؒ از خلیفہ عبدالحکیم ص۱۴۲

شکستنِ ایں طلسم بحر و بر را
ز انگشتے شگافیدنِ قمر را

(گلشنِ رازِ جدید۔ جواب سوالِ پنجم۔)

یا

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ رازِ فاش
لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف
مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لَاتَخَفْ
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

یا مثلاً ایسے اشعار

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند
فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزداں گیر

(رومیؒ)

اور

اے دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمتِ مردانہ

(اقبالؒ)

یا

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولیٰ صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

(اقبالؒ)

Marfat.com

یا

قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند
ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بہ جلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند
بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوش اند

(اقبالؒ)

ان اشعار کا اطلاق انبیاء کرام اور اولیاء عظام کے سوا کسی دوسری ہستی پر نہیں ہو سکتا۔ (اس کی تائید متعدد احادیث نبویؐ اور اجماع علماء طریقت سے بھی ہوتی ہے)

مذکورۂ بالا حقائق سے یہ بات بھی ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ نٹشے کا "فوق البشر" خیالی اور ظنی ہے۔ لیکن ہمارا "انسان کامل" حقیقی ہے۔ جو اقوام وحی و رسالت پر ایمان نہیں رکھتیں۔ انہیں "انسان کامل" کا انتظار رہے۔ اور وہ سمجھتی ہیں کہ دنیا میں ابھی تک ایسا انسان پیدا نہیں ہوا۔ لیکن ہم ان کے سامنے جملہ انبیاء کرام بالخصوص سرکارِ دوعالم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور آپ کے بعد آپ کے صحیح جانشین اولیاء کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کی ذواتِ گرامی باہزاراں ہزار فخر و افتخار پیش کرتے ہیں اور انہیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے لیکن ولایت کا دروازہ قیامت تک کھلا رہے گا۔ اور صفاتِ الٰہیہ کی زندہ نشانیاں اولیاء کرام کی ذوات گرامی کی شکل میں دنیا میں آتی رہیں گی۔ لیکن اہل اسلام کے عقیدے کے مطابق نعمت ولایت حضور ختمی مرتبت صلے اللہ علیہ وسلم کے مخلص غلاموں کا حصہ ہے۔ اُن غلاموں کا جو شریعت و طریقت اور حقیقت و معرفت کی نعمتوں کے حامل ہوتے ہیں جب تک اسلام کے یہ چاروں شعبے زندہ ہیں اور جب تک فطرتِ انسانی عشق حقیقی سے محروم نہیں ہو جاتی۔ اولیاء کرام کے وجود سے دنیا خالی نہیں رہ سکتی۔

Marfat.com

اس صورت میں کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں ہو سکتا کہ ہزاروں سال سے دنیا "انسان کامل" کی منتظر ہے۔ قرآنی انسان یا کامل انسانوں کی کمیابی اور چیز ہے لیکن یہ کہنا کہ دنیا میں آج تک "کامل انسان" پیدا ہی نہیں ہوا۔ بالکل غلط اور غیر اسلامی عقیدہ ہے۔

ہمارے اور یورپین اقوام کے اس اختلاف کی وجہ اوّل تو یہ ہے کہ مذکورہ اقوام اسلام اور پیغمبر آخر الزماںؐ پر ایمان نہیں رکھتیں۔ دوم یہ کہ روح کے متعلق ہمارا اور ان کا عقیدہ یکساں نہیں ہے۔ ہم رُوحِ حیوانی اور رُوحِ اعظم میں فرق کرتے ہیں۔ یورپین اقوام غالباً نہیں کرتیں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ رُوحِ حیوانی ختم ہونے پر رُوحِ اعظم (حقیقت انسانیہ) کی موت واقع نہیں ہوتی۔ لیکن جو اقوام انسان کو محض مادی جسم اور روحِ حیوانی کا مجموعہ مانتی ہیں وہ نہ خدا کی قائل ہیں۔ نہ ارتقائے روحانی کی۔ چونکہ روحِ حیوانی عناصر کے باہمی عمل و ردِ عمل کا ارتقائی نتیجہ ہے۔ اس لئے ان کا ارتقاء بھی حیاتی یعنے ظاہری و جسمانی ہے۔ معنوی و روحانی نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک انسان ذاتِ حقیقی کے ظہور کی آخری تجلی ہے جسے جامعیت کا درجہ حاصل ہے۔ جس کا مکمل آئینہ "انسان کامل" کی ذات ہے۔ اس نظریہ میں ذاتِ حقیقی کا ظہور مرتبۂ جامعیت انسانیہ میں، ارتقائے ترکیب عناصر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے۔ اور تخلیق و ترکیب عناصر اور ان کا عمل و ردِ عمل سب کچھ اس کے اشارے پر ہوتا رہتا ہے۔ بقول حضرت مولانائے روم

قالب از ما ہست شد، نے ما ازو

بادہ از ما مست شد، نے ما ازو

اس نظریۂ مخصوص کے اصولوں کی پابندی سے "انسان" "انسان کامل" بنتا اور قربِ الٰہی حاصل کرتا ہے۔ اسی کو عروجِ روحانی، معراج الی اللہ یا ارتقائے معنوی

Marfat.com

کہتے ہیں۔ البتہ مدارج میں فرق رہتا ہے۔

عوام الناس کو ان حقائق سے روشناس کرانے اور ان کی باطنی اصلاح و تربیت کی تکمیل کے لئے اولیاء کاملین کا ظہور ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اور اللہ کی زندہ نشانیوں کی حیثیت سے قیامت تک ہوتا رہے گا۔ ان کا انتظار کرنے کے بجائے جاننے پہچاننے اور ڈھونڈ نکالنے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کیلئے (۱) بنیادی عقائد میں تبدیلی اور (۲) تائید ایزدی ضروری ہیں۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں
(اقبال)

اب صرف ایک سوال پر غور کرنا باقی ہے۔ وہ یہ کہ اگر اقبال کو کسی مرد کامل کا انتظار نہیں ہے تو وہ کیوں فرماتے ہیں:۔

اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدۂ امکاں بیا
رونق ہنگامۂ ایجاد شو
در سواد دیدہ ہا آباد شو
نوع انساں مزرع و تو حاصلی
کاروان زندگی را منزلی
خیز و قانون اخوت ساز دہ
جام صہبائے محبت باز دہ

معلوم ہوا کہ علامہ اقبال کو ایک ایسے انسان کامل کا انتظار ہے۔ جو قانونِ

Marfat.com

اخوت کو نافذ کر کے نہ صرف ملتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی کر سکے بلکہ تمام عالم انسانیت کو محبت و اخوت کے رشتہ میں منسلک کر کے ساری دنیا میں امن قائم کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسا انسان کامل بھی نبی یا ولی کامل کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن اسلامی عقیدے کے بموجب حضور خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی دوسرے نبی کے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اقبال بھی ختم نبوت کے قائل تھے۔ لہذا جس مردکامل کا انتظار ہے۔ وہ کوئی ولی کامل ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے ذہن میں یہ غیر معمولی شخصیت صرف ولی کامل نہ ہو گی۔ بلکہ کچھ مزید اوصاف بھی رکھتی ہو گی۔ کیونکہ ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ منتشر ہو جانے کے بعد آج تک وہ کسی ولی کامل سے بھی درست نہ ہو سکا۔ حالانکہ اس دوران میں ہزارہا کاملین گذر گئے۔ ان حالات میں اس عقدہ کا حل عقیدۂ امام مہدی علیہ السلام میں نظر آتا ہے۔ جن کے منتظر مسلمانوں کے متعدد فرقے ہیں۔ ممکن ہے اقبال نے اس عقیدے کا اظہار کسی وجہ سے نہ کیا ہو۔ جیسا کہ وہ عقیدۂ حیات النبی علیہ السلام سے متعلق نیاز الدین خان کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریمؐ زندہ ہیں۔ اور اس زمانے کے لوگ بھی اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں۔ جس طرح صحابہؓ ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہو گا۔ اس واسطے خاموش رہتا ہوں۔"

ہمارے صوفیاء کرام نے ان مسائل کو (یعنے نبی کریم علیہ التحیہ والتسلیم کی حقیقت و حیات کے متعلق اور اس کے تحت حقیقتِ امام مہدی علیہ السلام کی بابت) جو توضیح و تشریح کی ہے وہ "اسرار" میں داخل ہے۔ اور صرف ایسے اشخاص کے لئے مخصوص ہے جو طالبِ حق ہوں اور راز کو علامہ اقبال کی طرح راز رکھنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ لہذا

Marfat.com

خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔ ورنہ میں صاف صاف بتا سکتا تھا کہ فقرائے اسلام کے عقیدے کے بموجب امام مہدیؑ کی حقیقت کیا ہے۔ اقبال کے انتظار کا کیا مطلب ہے۔ اور انہیں کس "انسان کامل" کا انتظار ہے۔ عقلمند را اشارہ کافی است۔

تاہم جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ یہ نکتہ ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ علامہ اقبال کا انتظار (مرد کامل سے متعلق) ڈاروِن یا نطشے وغیرہ کے نظریات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ڈاروِن کا نظریۂ ارتقاء انسان کی صرف حیوانیت (یعنے جسم ظاہری) کے ارتقاء کا حال بیان کرتا ہے۔ انسان کی انسانیت اور اس کی رُوحانیت کے ارتقاء کا حال نہیں بیان کرتا۔ اور نطشے کے "فوق البشر" کو نہ خدا سے واسطہ ہے نہ رسولؐ سے۔ پھر ایسے "فوق البشر" سے اقبال یا صوفیائے اسلام کے "مرد کامل" کا کیا تعلق؟ ان حضرات کے "مرد کامل" یا "انسان کامل" کو۔

توحید و رسالتِ محمدیؐ کا قائل اور اس کے علم و عمل کو شریعت، طریقت اور معرفت کا جامع ہونا چاہیئے۔ اس کے علاوہ اسے اللہ کی طرف سے وہ قدرت بھی حاصل ہونا چاہیئے۔ کہ وہ ایک بار پھر ملتِ اسلامیہ بلکہ تمام عالم انسانیت کو "رشتہ محبت و اخوت" میں منسلک کر دے۔ اور دنیا سے فسق و فجور اور ظلم کا نام و نشان مٹا دے۔

(۱۲)

موت وحیات

Marfat.com

۷۸۶

مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا

مرجاؤ قبل مرنے کے

(حدیث شریف)

گرچہ برہم ہے قیامت سے نظام ہست و بود

ہیں اسی آشوب سے بے پردہ اسرار وجود

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے

خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

(اقبالؒ)

Marfat.com

موت وحیات

(۱) بعض اہم امور جو عمومی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے متعلق صوفیاء کرام اور علامہ اقبال متفق الخیال ہیں۔

موت و حیات انسانی کے متعلق علامہ اقبال کے خیالات حکماء سے زیادہ علمائے طریقت کے عقائد سے ماخوذ ہیں۔ موت کی ارزانی، اس کی وجہ۔ موت و حیات کی باہمی نسبت، انسان کا ظاہری و باطنی وجود، وجود ظاہری کی مسلسل فنا، مسلسل فنا پر مسلسل بقاء کا انحصار، جوہر انسانی کی ابدیت، موت کے خوف کا بے معنی ہونا، حیات ابدی کے لئے ایثار و شہادت کی ضرورت، حضرت امام حسینؓ کی شہادت کی اہمیت، حقیقی ارتقاء، احترام انسانیت، انسانی زندگی میں اخلاق فاضلہ کی اہمیت وغیرہ وغیرہ، ان تمام امور کے متعلق اقبال وہی کہتے ہیں جو اکابر صوفیہ ہمیشہ سے کہتے آرہے ہیں۔ جیسا کہ آئندہ صفحات میں دی ہوئی تفصیلات سے واضح ہوگا۔

البتہ عبادت کی نوعیت و اہمیت، مقصود عبادت، قلب انسانی اور اس کی اہمیت، قرب الٰہی، حیات بعد الموت، اس کی نمایاں خصوصیات اور اسی نوع کے بعض دیگر مسائل کی بابت علامہ اقبال اور صوفیائے کرام کے نقطہ ہائے نظر میں بعض جگہ کچھ اختلاف نظر آتا ہے۔ اور بعض جگہ تفصیلات کی کمی ہے۔

اسی طرح جہاں تک حیات اجتماعی کے خاص خاص اسلامی اصولوں کا تعلق ہے حضرت علامہ اقبال نے صوفیاء کرام سے کہیں اختلاف نہیں کیا۔ اقبال کارل مارکس کے معاشی تجزیے اور اس کی معاشی تاویلات سے تو متاثر ہیں۔ لیکن اس کی کافری کے قائل نہیں اس لئے ؎

"قلبِ او مؤمن دماغش کافر است"

Marfat.com

فرمایا۔ اس کی "کافری" یہی تھی کہ وہ انسان کے باطن (لہذا ارتقائے باطنی) کا منکر ہے۔
جہاں تک ان امور کا تعلق ہے۔ اقبال کے افکار صوفیہ کے عقائد سے ماخوذ ہیں۔

وہی نہیں اب تو "حقیقت حیات" اور اس حقیقت تک انسان کی رسائی۔ اور مسئلہ زمان و مکان وغیرہ کے متعلق یورپ کے جدید ارباب فلسفہ کی تحقیق کے ڈانڈے بھی تصوف ہی سے جا ملتے ہیں۔ ؎۲

ذیل میں انہی نکات کی کچھ تفصیل ملاحظہ ہو۔ مثلاً

صوفیائے کرام اُس قرآنی تعلیم پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کا مجسمہ تیار کر کے اس میں اپنی روح پھونکی۔

وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (۱۵-۲۹)

اور اس کی بدولت وہ زندہ اور ہست ہوا۔ ان کے نزدیک "آدم" "جسم آدم" "کائنات" "روح" "زندگی" وغیرہ سب ہستی حقیقی کی صفات و شیون اور اسی کے اسماء و افعال کے مظاہر ہیں۔ جن میں انسان کا درجہ دیگر مخلوقات میں اعلیٰ اور پھر "انسان کامل" کا اعلیٰ ترین ہے۔ لیکن عام انسان چونکہ ان مسائل کی حقیقت کو بآسانی نہیں سمجھ سکتے اس لئے ان کی تشریح میں راز داری کا عنصر غالب ہے۔

صوفیائے کرام وجود انسانی کو خدا کا "راز" کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ایک الہام میں لکھا ہے:۔

"قال عز وجل یا غوث الاعظم الانسان سرّی و انا سرّہ لو عرف الانسان منزلتہ عندی فقال فی کل نفس

؎۱ خطبات اقبال

؎۲ مضمون ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مطبوعہ رسالہ "اقبال" (اردو) جلد اول شمارہ ۲

Marfat.com

من الانفاس لمن الملك الیوم

یعنے فرمایا حق سبحانہ نے اے غوث اعظم! انسان میرا بھید ہے اور میں انسان کا بھید ہوں۔ اگر انسان اپنے مرتبہ کو پہچانتا۔ جو میرے نزدیک ہے البتہ کہتا ہر دم دموں سے اپنے کہ میں مالک ہوں اور مجھی کو ہے بادشاہی آج کے روز۔"

علامہ اقبال بھی ضرب کلیم میں فرماتے ہیں :۔

طلسم بود و عدم جس کا نام ہے آدم
خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سُخن
زمانہ روز ازل سے رہا ہے محو خرام
مگر یہ اس کی تگ و دَو سے ہو سکا نہ کہن
اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انسان نہ رُوح ہے نہ بدن

خدا کے اس "راز" کی تفسیریں صوفیائے کرام اور علامہ اقبال دونوں نے بیان کی ہیں۔ فرق اسلوب بیان کا ہے۔ نیز یہ کہ علامہ نے زیادہ تر اس کے ظاہر اور ظاہر کے عملی پہلو کی شرح کی ہے۔ لیکن اکابر صوفیہ نے باطن اور باطن کے عملی پہلو کی وضاحت کی ہے۔ اسلامی تصوف کی بنیاد توحید کی صحیح توضیح پر قائم ہے اس میں انسان کو بتایا جاتا ہے کہ اس کا صحیح مرتبہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک کیا ہے۔ اور وہ کس حد تک عروج روحانی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ باتیں اکابر صوفیہ اپنے نظریۂ انا کے تحت بیان کرتے ہیں۔

علامہ اقبال کی خودی اور صوفیائے وجودی کے نظریۂ انا میں متعدد نکات مشترک ضرور ہیں۔ لیکن جہاں تک تفصیلات ان کی ترتیب و تدوین اور دلائل و براہین از روئے قرآن و سنت کا تعلق ہے۔ بالخصوص بلحاظ انتہا صوفیائے وجودی کے نظریۂ انا کا

Marfat.com

درجہ علامہ اقبال کے نظریۂ خودی سے کہیں زیادہ ہے۔ اور خود علامہ کے اس اعتراف کے بعد کہ ان کا نظریہ فقر از صوفیائے اسلام کے نظریات سے ماخوذ ہے فقرائے اسلام کے انا کو اصل کی حیثیت حاصل ہے۔

تسلسل حیات اور اوصاف حیات کے بیان میں جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔ علامہ اقبال سراسر سنائیؒ اور عطارؒ اپنے مرشد معنوی مولانائے روم اور دیگر صوفیائے کرام کی زبان بن جاتے ہیں۔

موت کے متعلق بھی علامہ اقبال صوفیائے کرام کے ہم خیال ہیں۔ صوفیہ موت سے نہیں ڈرتے نہ اُسے ”زندگی کا اختتام“ سمجھتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس ان کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ موت ایک پُل ہے۔ جو طالب کو مطلوب حقیقی سے ملاتا ہے۔ اور جس کے بعد طالب کی نئی اور بہتر زندگی شروع ہوتی ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی
ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی
موت تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

دراصل نقش حیات مٹ مٹ کر ابھرتا اور نئی شان سے ابھرتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی سطحی ہے۔ ورنہ حقیقتاً ہر لحظہ، ہر لمحہ، ہر گھڑی، ہر چیز کو نئی زندگی عطا کیجاتی اسی کا نام تسلسل حیات[1] اور تصوف کی اصطلاح تجدد و امثال[2] ہے۔

اقبال بھی اسی کے قائل ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

دما دم رواں ہے یم زندگی[2] ✽ ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

---

[1] اس کی وضاحت آئندہ صفحات میں ملے گی۔
[2] زندگی کا مفہوم وسیع بھی ہے محدود بھی۔

Marfat.com

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود[1]
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود[2]

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
اتر کر جہانِ مکافات میں[3]
رہی زندگی موت کی گھات میں
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے کہ حقیقتِ انسانی فنا نہیں ہوتی بلکہ عشقِ حقیقی کے

[1و2] وجود سے یہاں واحد وجود مراد ہے۔ صوفیہ اسے "ہستی حقیقی" کا مترادف سمجھتے ہیں۔ تفصیل آئندہ صفحات میں ملے گی۔

[3] تصوف میں ان صورتوں کے لئے "عروج" و "نزول" کی اصطلاحات ہیں اور صوفیائے کرام نے ان کے متعلق کافی تفصیل سے بحث کی ہے

اعلیٰ ترین مرحلے پر پہنچ کر حقیقتِ عبد و رب ایک ہو جاتی ہے[1] پہلے جزو کی بابت اقبال فرماتے ہیں :-

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اور

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

اور دوسرے جزو کی بابت مزید بحث تو آگے آرہی ہے۔ لیکن فی الحال یہاں صرف دو شعر مثال کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

(۱)
عمل خواہی یقیں را پختہ تر کن
یکے جو یکے بین و یکے باش

(پیام مشرق)

(۲)
مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

(بال جبریل)

بہرحال "جوہر انسان" اور "مرکز وجود" کی بابت اقبال اور صوفیائے کرام کے خیالات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف اتنا کہ صوفیہ نے "جوہر انسان" کی ترقی پر زیادہ توجہ کی اور اقبال نے فرد اور ملت اسلامیہ کی ظاہری اور اجتماعی ترقی پر خاص زور دیا ہے۔ دونوں کا کام ایک دوسرے کی ضد نہیں ہے[2]۔ دونوں نے جو کام کیا ہے وہ اپنے

اقبال اور صوفیہ کے نقطۂ نظر کا درمیانی فرق مجرا اصلی نہیں محض فروعی ہے

---

[1] دیکھو فلسفۂ عجم از اقبال صفحہ ۲۱۶، صفحہ ۲۱۷ اور میرا مقالہ "انسان کامل" صفحہ ۳۱۰

[2] جو باتیں اصل اصول یا اس کی تشریح میں ایک دوسرے کی ضد نظر آئیں۔ انہیں ایک دوسرے کے مسلک کو اچھی طرح نہ سمجھنے پر محمول کرنا چاہیئے اسی طرح دونوں میں تطبیق کی راہ نکل سکتی ہے۔

Marfat.com

اپنے وقت اور حالات کے لحاظ سے کیا ہے۔ صوفیاء کرام نے مادیت اور مادی مفادات اور حیوانی لذائذ زندگی کو اس لئے ہیچ بتایا (اور قیامت تک بتاتے رہیں گے) کہ قرآن پاک انہی چیزوں میں اُلجھ کر رہ جانے کو مذموم قرار دیتا ہے۔ وہ مادی مفادات زندگی کو اس صورت میں جائز قرار دیتا ہے جبکہ آخرت کو بھی پیش نظر رکھا جائے اور اللہ تعالٰے کے مقرر کئے ہوئے حدود سے تجاوز نہ کیا جائے۔ لیکن انسان کی اکثریت ہر زمانے میں انہی فانی، عارضی اور چند روزہ لذتوں میں اُلجھ کر رہ جانے اور آخرت کو فراموش کر جانے کی عادی رہی ہے۔ ان حالات میں یہی مناسب ہے کہ دنیا کی عارضی لذتوں کو ہیچ بتا کر انسان کے سامنے حیات اُخروی رکھی جاوے۔

اسی طرح اقبال نے اپنی قوم کے ادبار و افلاس اور اغیار کی چیرہ دستیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ضروری سمجھا کہ قوم کو انفرادی و اجتماعی استحکام و اقتدار کی جانب خاص توجہ دلائی جائے۔ نہ صوفیائے کرام کا یہ مقصد تھا کہ ملت فنا ہو جائے، نہ اقبال کا یہ مطلب تھا۔ کہ انسان "مرکز وجود" سے بے تعلق رہے۔ یا وہ اپنے جوہر کو قابل التفات نہ سمجھے۔ زندگی میں دھوپ چھاؤں، نور و ظلمت، دن رات اور شادی و غم کی طرح انسانی جدوجہد اس کے مفادات اور اس کی ترقی کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک ظاہری یا مادی اور دوسرا باطنی یا روحانی۔ دونوں ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ اور دونوں ہی میں خالق کائنات کی مرضی کار فرما ہے۔ علامہ اقبال نے اسی نکتہ کو ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے:۔

بہر دل عشق رنگ تازہ بر کرد
گہے با سنگ گہ با شیشہ سر کرد
ترا از خود ربود و چشم تر داد
مرا با خویشتن نزدیک تر کرد

لیکن اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ "با خویشتن نزدیک تر" ہونا ہی زندگی کی آخری منزل ہے۔ آخر وہی اقبال یہ بھی کہتے ہیں :-

تو می گوئی کہ من ہستم خدا نیست
جہانِ آب و گِل را انتہا نیست
ہنوز ایں راز بر من ناکشود است
کہ چشم آنچہ بیند ہست یا نیست

تنبیہ

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اقبال کا مسلک متشککین کی طرح تشکک یا تذبذب تھا۔ یہ کہنا کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ ہے بھی یا نہیں، محض ایک انداز بیان ہے جس سے یقین کے ساتھ یہ کہنا مقصود ہے کہ صرف اللہ ہی باقی ہے اور کچھ نہیں ہے۔ اور یہ نیچریوں اور دہریوں کے بطلان کے لئے کہا گیا ہے۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ جہان آب و گل ہی حقیقی ہے اور (نعوذ باللہ) خدا کچھ نہیں ہے۔

بعض اشعار میں تو علامہ نے وجودِ الٰہی کے سوا ہر چیز کو صاف الفاظ میں وہم و خیال قرار دیا ہے۔ مثلاً

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

مگر ان کے مجموعی فلسفۂ حیات کے پیش نظر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ عارضی

دنیاوی زندگی" ذلت کے ساتھ یا کفار کی محکومی میں گزاری جائے۔ آخر خدا نے اس عارضی دنیاوی زندگی کی درستی کے لئے وحی و انبیاء کرام کا سلسلہ جاری کیا تھا۔ اور اسی عارضی دنیا کو "دارالعمل" اور "آخرت کی کھیتی" قرار دیا گیا ہے۔ اسے ہیچ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اسی کو سب کچھ نہ سمجھ لیا جائے۔ صوفیائے کرام بھی ہمیشہ یہی کہتے رہے ہیں۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن (زوجی)

علامہ اقبال نے زندگی کے دونوں رُخ واضح کر دئیے ہیں لیکن جس رُخ کی وضاحت پر پوری توجہ صرف کی ہے۔ وہ یہی ہے کہ مسلمان اس دنیا میں محکومی و ذلت کی زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا ہے۔ لیکن یہ تعلیم قرآن پاک ہی کی ہے۔

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ط

(۳-۱۳۹)

ترجمہ:۔ خوف نہ کھاؤ۔ غم نہ کرو۔ تم ہی غالب رہو گے۔ اگر تم مؤمن رہے۔

چنانچہ ضروری شرط مومن رہنے کی ہے جس کی تکمیل حصول غلبہ سے مقدم ہے۔

صوفیاے کرام کے نقطۂ نظر سے "مومن" اس مرد حق کو کہتے ہیں۔ کہ جس کا مرنا جینا سب کچھ اللہ اور صرف اللہ کے لئے ہو۔ وہ زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے اور دنیا میں اللہ کی نیابت کے فرائض انجام دینا اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ وہ اس سلسلے میں ہر اس ذریعہ کی مدد لے سکتا ہے جو خدا نے اس کے لئے جائز قرار دیا ہو (انفرادی، اجتماعی، جسمانی، ذہنی، اخلاقی، روحانی، سیاسی، معاشی وغیرہ) اس فرض سے غافل رہ کر "مومن" دوسری باطل قوتوں سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ انبیاء کرام و اولیائے عظام کی زندگیاں ہمیں یہ سبق دیتی ہیں کہ انہوں نے عشق الٰہی کی بنیادوں پر فرائض نیابت کی انجام دہی کی عمارت

استوار کی ہے۔ وہ عشق الٰہی میں زندہ رہے اور اسی میں فنا ہوئے۔ چنانچہ ہمارے لئے بھی یہی شاہراہ ہو سکتی ہے۔ جب اللہ کا عاشق عشق حقیقی میں فنا ہو جاتا ہے تو اُسے بقائے دوام کی نعمت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ اس وقت اُس میں وہ قوت پیدا ہو جاتی ہے جسے اقبال اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

کافر ہے تو تلوار پہ کرتا ہے بھروسہ
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ زندگی کے لئے موت ضروری ہے۔ موت کی منزل سے گذر کر کائنات کی ہر شے "ارتقاء" حاصل کرتی ہے۔ یعنے پہلے سے بہتر صورت اختیار کرتی ہے۔ ہمارا دن رات کا مشاہدہ ہے کہ جمادات نباتات میں اور نباتات حیوانات میں فناء ہو کر ارتقاء حاصل کرتی ہیں۔ اسی طرح عالم حیوانات عالم انسانی میں فنا ہو کر انسان کا جزو بنتا رہتا ہے۔ یہی اس کا ارتقاء ہے۔ اس اصول کے تحت لازم آتا ہے کہ انسان اپنے سے بلند و برتر ہستی میں "فنا" ہو کر ارتقاء حاصل کرے لیکن یہ فنائیت نباتات و حیوانات کی طرح جسمانی نہیں ہوتی بلکہ معنوی ہوتی ہے لیکن بعض دیگر مذاہب نے یہاں یہ غلطی کی کہ وہ جسمانی فنا کے قائل ہو گئے اور طرح طرح سے اپنے جسم کو مٹانے لگے۔ تاکہ انہیں نجات حاصل ہو۔ یہ اسلامی تصوف کا ہی نوع انسان پر احسان عظیم ہے۔ کہ اس نے اس غلط عقیدہ کی اصلاح کی۔ اور یہ بتایا کہ انسان معنوی طور پر فنا فی اللہ ہو کر باقی باللہ بنتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے:۔

مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا

یعنے مرجاؤ قبل مرنے کے

چنانچہ صوفیائے کرام کے مسلک میں یہی عین بقاء ہے۔

مذکورہ بالا دو موتوں میں ایک تو وہی ہے جس سے جسم کا رشتہ روح حیوانی

سے منقطع ہو جاتا ہے۔ یہ موت ظاہری جسمانی ہے۔ جس کی بابت قرآن پاک میں ہے:۔

اِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○

(۱۰ - ۴۹)

یعنی اجل کا وقت مقرر ہے۔ نہ ایک ساعت بعد آئے گی نہ قبل۔

دوسری موت جس کی تاکید کی جا رہی ہے معنوی ہے۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اس سے اپنی باطل انانیت کی فناء دوئی اور وہم غیریت کی اصلاح اور انائے حقہ کے شعور کی انتہائی ترقی مراد ہے۔ ان کے نزدیک یہی موتوا قبل ان تموتوا کا مقصود اور یہی صحیح ارتقاء ہے۔ اس لئے ان کی نظر میں جسمانی موت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ نہ اس سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے عقیدے کے مطابق ایسی موت تو ہر لحظہ انسان پر طاری رہتی ہے۔ اور اس کی بدولت وہ ہر لحظہ نیا جسم اور نئی زندگی حاصل کرتا رہتا ہے۔ مولانائے رُوم فرماتے ہیں:۔

تو از آں روزے کہ در ہست آمدی
آتشے یا خاک یا بادے بُدی
گر بداں حالت ترا بودے بقاء
کے رسیدی مر ترا ایں ارتقاء
از مبدّل ہستی اول نماند
ہستی دیگر بجائے او نشاند
ایں بقاہا از فناہا یافتی
از فنا پس رو چرا بر تافتی
زاں فناہا چہ زیاں بودت کہ تو

Marfat.com

بر بقاء چسپیدۂ اے بے نمو
صد ہزاراں حشر دیدی اے عنود
تا کنوں در لحظہ از بدو وجود
در فناہا ایں بقاہا دیدہٗ
بر بقائے جسم چوں چسپیدۂ

غرض یہ کہ ظاہری حیات انسانی عارضی زندگیوں کا ایک لا متناہی سلسلہ ہے جو عارضی موتوں کے لامتناہی سلسلے پر قائم ہے۔ لہذا لازم آتا ہے کہ انسان

(۱) موت سے ہرگز نہ ڈرے۔

(۲) اپنی زندگی کی حقیقت کو سمجھے۔

(۳) اس دنیا کی زندگی ہی کو "حیات" کی آخری منزل نہ سمجھے۔ اور

(۴) صحیح ارتقاء حاصل کرنے کی کوشش کرے کہ وہی "حیات دائمی" ہے۔ علامہ اقبال اور صوفیائے کرام دونوں نے ان نکات کو مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے چنانچہ علامہ موت کی ارزانی کے متعلق فرماتے ہیں :۔

فناء را بادۂ ہر جام کردند
چہ بے دردانہ او را عام کردند
تماشا گاہ مرگِ ناگہاں را
جہان ماہ و انجم نام کردند

ایک دوسرے قطعہ میں فرماتے ہیں :۔

زندگی انساں کی ہے مانند مرغ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا
آہ کیا آئے ریاض دہر میں ہم کیا گئے

زندگی کی شاخ سے پھولے، پھلے، مُرجھا گئے
اے ہوس خُوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار
یہ شرارے کا تبسم، یہ خسِ آتش سوار
آہ یہ دُنیا یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت
گلشنِ ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت
کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں شہر میں گلشن میں، ویرانے میں موت

لیکن ارزانی موت کے ذکر سے علامہ کا مقصد بھی وہی ہے جو صوفیاء کرام کا ہے یعنے ہمارے دل سے موت کا ڈر نکل جائے اور ہم اسے بہتر زندگی کے لئے ضروری سمجھنے لگیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

اصل غلطیاں یہی ہیں کہ انسان یا تو اس دنیا کو قطعی ہیچ یا بے کار سمجھ لیتا ہے۔ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے بھی کنارہ کش ہو کر رہبانیت اختیار کر لیتا ہے۔ یا خدا اور رسولؐ کے احکام کو فراموش کر کے محض دنیا کا غلام بن جاتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں غلط ہیں۔ صوفیاء کرام اور علامہ اقبال نے مختلف پیرایوں میں انہی غلطیوں سے آگاہ کیا ہے۔ اور جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔ دونوں نے اپنے اپنے مقصد کے پیش نظر

Marfat.com

اور اپنے اپنے زمانے کے حالات کے لحاظ سے کسی ایک پہلو پر خاص زور دیا ہے۔ اور دوسرے پر کم۔ اسی لئے سطحی علم رکھنے والوں کو یہ دھوکا ہوتا ہے کہ اقبال تصوف کے خلاف تھے یا صوفیاء کرام "عمل" کے۔

ہر زمانے میں "زندگی" کے متعلق مختلف اشخاص کا نقطۂ نظر ایک دوسرے سے مختلف رہا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر شخص کا نقطۂ نظر ہر لحاظ سے صحیح بھی ہو۔

موجودہ دور میں زندگی کے متعلق انسان کا نقطۂ نظر فلسفیانہ کم معاشی زیادہ ہے لیکن معاشی افادیت کے بھی مدارج مقرر کرنا ضروری ہیں۔ ورنہ انفرادی یا اجتماعی زندگی کی اہمیت کے درجات معین نہ ہو سکیں گے اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا۔ کہ کس اصول کس عمل، کس جدوجہد اور کس قسم کی زندگی کو اسلامی نقطۂ نظر سے مستحسن اور کسے مذموم قرار دیا جائے۔ مثلاً

ایک شخص صرف اپنے ذاتی مفاد کے لئے تمام عمر جدوجہد کرتا ہے۔ دوسرا اپنے عزیز و اقارب کے معاشی مفاد کے لئے اپنا وقت عزیز، اپنا آرام اور اپنا معاشی مفاد قربان کرتا ہے۔ تیسرا اپنے وطن کے لئے قربانیاں دیتا ہے۔ چوتھا پوری ملت اسلامیہ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ اور پانچواں تمام بنی نوع انسان کو خدا کی مخلوق اور اس کا ایک کنبہ سمجھتا اور اسے فائدہ پہنچانے کے لئے اپنے تمام ذاتی مفادات کو قربان کر دیتا ہے۔ معاشی نقطۂ نظر رکھنے والوں کے خیال کے مطابق "زندہ" سب کہلائیں گے۔ لیکن کیا وہ قربانیوں کے لحاظ سے بھی ہم رتبہ ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہ ہوگا بلکہ جس شخص کی قربانیاں سب سے زیادہ ہوں گی اور جس کی قربانیوں سے زیادہ سے زیادہ انسان مستفیض ہوں گے۔ اس کی زندگی بہترین سمجھی جائے گی۔

"ایثار و قربانی" کا مفہوم بھی بہت وسیع ہے۔ اپنی عزیز چیز کو دوسروں کے فائدہ رسانی کے لئے قربان کر دینا دوسروں کے آرام، فائدے یا ترقی کے لئے تکلیف

میں امن و امان قائم رکھنا۔ اہل ملک کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لئے تکالیف برداشت کرنا۔ اور منظم طور پر مذہبی، تعلیمی، معاشی و معاشرتی منصوبوں پر کامیابی کے ساتھ عمل درآمد کرنا یا عمل درآمد کرانے کی کوشش کرتے رہنا۔ وغیرہ وغیرہ یہ سب کچھ "ایثار و قربانی" اور "عمل" کے دائرے میں آسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا معاوضہ نہ لیا جائے۔ یا بقدر ضرورت لیا جائے۔ (یہاں ضرورت سے صرف جائز ضروریات زندگی اور اتنے مصارف مراد ہیں جو ایک عام اوسط درجہ کے آدمی کے مصارف کے برابر ہوں) اس طرح "ایثار و قربانی" کی مذکورہ تمام صورتیں "زندگی" میں داخل سمجھی جائیں گی۔

لیکن بحیثیت مسلمان یہاں بھی ہمیں ایک مغالطے سے بچنا لازمی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ "ایثار و قربانی" کی مذکورۂ بالا سیاسی و معاشی صورتیں ان اقوام میں بھی پائی جاتی ہیں۔ جو خدا، قرآن اور صاحبِ قرآن کے قائل نہیں ہیں۔ اور جو آخرت کی زندگی پر ایمان نہیں رکھتے۔

یہی نہیں بلکہ آج بعض ممالک میں معاشی نظام ہم سے کہیں زیادہ کامیاب ہے۔ اور وہ کامیابی لاکھوں کی بے پناہ "قربانیوں" کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی زندگی "اسلامی" ہے۔ کیونکہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ محض "مساواتِ شکم" پر کسی معاشی نظام کی بنیاد قائم کرنے میں کامیاب ہو جانا "انسانیت" کی معراج نہیں ہے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ "مساواتِ شکم" والے موجودہ ممالک کا نظریۂ حیات انتہائی خود غرضی پر قائم ہے۔ نہ انہیں آخرت سے سروکار ہے نہ خدا و رسول سے واسطہ۔ وہ کامیاب اور اعلیٰ ترین معاشی نظام قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بھی تیار کرتے ہیں اور غیر اقوام اور غیر ممالک کو محض اپنے مادی مفاد کی خاطر منٹوں میں تباہ کر دیتے ہیں۔ دنیا کے صائب الرائے اشخاص کا متفقہ فیصلہ یہی

Marfat.com

ہے۔ کہ زوالِ انسانیت اور اخلاقی پستی کی یہ بدترین مثالیں ہیں۔ جو جانوروں کی دنیا میں بھی نظر نہیں آتیں۔ اس لئے ہم انہیں غیر اسلامی کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ انسان اور انسانیت کو بچانے کے لئے مادی ترقی و ایجادات کے ساتھ ساتھ جس چیز کی شدید ضرورت ہے۔ وہ اخلاق و روحانیت کی ترقی اور حقیقی اسلامی زندگی کے اصولوں پر عمل درآمد کرنا ہے۔ جب تک اخلاق و روحانیت کی ترقی خاطر خواہ نہ ہوگی، نہ انسانی ہمدردیوں کا دائرہ وسیع ہو سکتا ہے۔ نہ دنیا میں امن قائم رہ سکتا ہے۔

انسان کا نقطہ نظر معاشی ہو یا سیاسی، خودغرضی ایسی خطرناک بیماری ہے کہ وہ کسی کو پنپنے نہیں دیتی۔ اور جب وہ کسی قوم میں سرایت کر جاتی ہے تو اس کے باعث بعض اوقات عالم گیر جنگوں تک نوبت پہنچتی ہے۔ حرص و ہوس اور حسد وغیرہ خودغرضی ہی کی انتہائی خراب صورتیں ہیں۔ جب تک یہ برائیاں دور نہ ہوں۔ کوئی شخص یا قوم دوسروں کے لئے ایثار و قربانی نہیں کر سکتی۔ حقیقتاً ان برائیوں کا دُور کرنا ہی اسلام ہے۔

ان برائیوں کا تعلق انسانی قلب سے ہے۔ اسی لئے اسلامی تصوف انسان کے قلب کو ان تمام برائیوں سے پاک و صاف رکھنے پر اصرار کرتا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ ہمدردی و محبت رکھنے اور ان کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کی تعلیم دیتا ہے۔ جماعت صوفیہ نے کبھی دوسروں پر مظالم نہیں کئے۔ نہ وہ کبھی ان کی تباہی کا باعث بنی۔ بلکہ عالم انسانیت کی جتنی خدمت صوفیہ اور فقراء کی جماعت نے کی ہے کسی دوسری جماعت نے نہیں کی۔ اسلامی تصوف کی ایک نمایاں خصوصیت احترام انسانیت ہے۔ وہ کفار و مشرکین کو بھی خدا کا بندہ سمجھتے اور ان کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتے ہیں۔

"احترام انسانیت" کے متعلق علامہ اقبال نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ قبل

لاہور ریڈیو سٹیشن سے نوروز کے موقع پر جو پیام نشر کیا تھا۔ اس میں موصوف[۵۱] نے فرمایا تھا۔ کہ

"دورِ حاضر کو علوم عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقیات پر بہت بڑا فخر و ناز ہے۔ یہ فخر و ناز بلاشبہ حق بجانب ہے۔ لیکن ان تمام ترقیات کے باوجود ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دنیا بھر کے گوشوں میں قدر حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔ یاد رکھو انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرتکز نہ کر دیں گی۔ یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی[۵۲]۔۔۔۔۔۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے

---

۵۱ آثار اقبال ص۲۱۰، ص۲۱۱

۵۲ صوفیائے کرام اپنی توجہ اسی نوع کے درس پر مرکوز رکھتے ہیں۔ لیکن پھر بھی دنیا ان پر "بے عملی" کا الزام لگاتی ہے اور انہیں بدنام کرتی ہے۔ کیا تنگ نظر افراد ہمارے دور کے سب سے بڑے مفکر (علامہ اقبال) کی مذکورہ بالا رائے کا احترام کریں گے؟

اسی طرح وہ حضرات بھی علامہ کے مندرجہ بالا مشورہ کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کریں جو موجودہ دور کی صرف مادی و سائنسی ترقی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔

Marfat.com

اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے۔ جو نسل، زبان، رنگ و قوم سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس ناپاک قوم پرستی اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا۔ اس وقت تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہ کا قائل نہ ہو گا۔

جب تک جغرافیائی وطن اور نسل و رنگ کا امتیاز نہ مٹ جائے گا انسان اس دنیا میں فوز و کامرانی کی زندگی بسر نہ کر سکے گا۔ اور اخوت، حریت اور مساوات کے الفاظ کبھی شرمندۂ معنی نہ ہوں گے......
آؤ اس نئے سال کو اس دعا پر ختم کریں کہ خدائے بزرگ و برتر ارباب حکومت و اقتدار کو انسان بنائے۔ اور انہیں انسانیت کی حفاظت کرنا سکھائے۔"

خلق کو عیال اللہ سمجھنا اور ان میں اخوت، حریت اور مساوات قائم کرنے کی کوشش میں زندگی بسر کرنا اسلامی تصوف کی خاص تعلیم ہے۔ تصوف کے مخالفین اور موافقین سب کو اس سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔

"ایثار و قربانی" کا اہم ترین پہلو ہنوز تشنۂ توضیح ہے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ عظیم تر مقصد کے لئے فنا ہو جانا ہی زندگی ہے۔ اس دنیا کا آئین یہی ہے۔ کلی کی

لہ صوفیہ کرام نے انہی باتوں کی تبلیغ میں اپنی زندگیاں صرف کر دی ہیں۔ کیونکہ مخلص صوفی "بنے بغیر انسان ان نعمتوں سے محروم ہی رہتا ہے۔ جن ملکوں میں ترقی کی بنیاد اخلاقی و روحانی نہ ہو۔ اُسے نہ علامہ اقبالؒ ترقی کہتے ہیں نہ صوفیہ کرامؒ۔

Marfat.com

موت میں آفرینشِ گل اور لاکھوں ستاروں کی فنا میں ایک آفتاب کی نمود کا راز پنہاں ہے۔

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے
وداعِ غنچہ میں ہے رازِ آفرینشِ گل
عدم عدم ہے کہ آئینہ دارِ ہستی ہے

لیکن "عظیم تر" مقاصد کے بھی درجات ہیں۔ انسان کا تعلق جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہے۔ صرف مادیات سے نہیں ہے بلکہ اخلاق و روحانیت سے بھی ہے انسان کو بہائم سے ممتاز کرنے والی چیزوں میں اخلاق و روحانیت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا تسلیم کرنا ہوگا کہ انسانی زندگی کا "عظیم تر" مقصد اخلاقی و روحانی ترقی ہے۔

انسان کی اخلاقی و روحانی ترقی اس کی مادی ترقی کی راہ میں ہرگز حائل نہیں ہوتی بلکہ وہ مادی ترقی کا حسن و جمال ہے۔ اور اس کی افادیت میں اضافہ کرتی ہے۔

علامہ "پیامِ مشرق" کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں [۱]

"اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملی حقائق کو پیش نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب ...... ایک بہت بڑے روحانی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ یورپ نے اپنے علمی، اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ

---

[۱] "پیامِ مشرق" گیٹے کے دیوان کے جواب میں سو سال بعد لکھا گیا۔

Marfat.com

لئے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کے نکتہ رس مگر قدامت پرست مدبرین اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے۔ جو انسانی ضمیر میں اس وقت واقع ہو رہا ہے۔ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کرتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن پاک نے

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ ط

کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے۔ زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید و تولید ہو قابل احترام ہے"۔ کیا اس سے بہتر الفاظ میں اولیاء کرام اور صوفیائے عظام کے مسلک و مشرب کی پر زور وکالت ہو سکتی ہے۔ خط کشیدہ الفاظ بالخصوص غور طلب ہیں۔

انسان کی باطنی تربیت کرنا اس کی اخلاقی و روحانی ترقیوں کی شرح کرنا اور اس کے حصول کے طریقے بتانا اسلامی تصوف کا خاص حصہ ہے۔ اسلامی تصوف میں ان امور کی تفصیل فن کی حیثیت سے موجود ہے۔ اگر انسان صحیح اخلاقی و روحانی ترقی میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو اسلامی تصوف اختیار کئے بغیر چارہ نہیں کیونکہ اس کی بنیاد اخلاق محمدیؐ پر قائم ہے۔ عیسائی رہبانیت یا ہندی جوگیت پر نہیں۔

Marfat.com

دنیا میں جس چیز کو "انسانیت" کہا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد اخلاق و روحانیت پر ہی قائم ہے۔ اور انہی پر انسانی ارتقاء کی تکمیل منحصر ہے۔ اسلام اور اسلامی تصوف دراصل انسانیت اور معراج انسانیت کے دوسرے نام ہیں۔

اخلاق و روحانیت کا علم ہمیں انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کے ذریعہ حاصل ہوا ہے جو اشخاص ان پر ایمان نہیں رکھتے ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بیمار صحت کی تمنا تو کرے مگر مستند معالجین کا نسخہ نہ استعمال کرے۔ یا اگر استعمال کر کے صحتیاب ہو جائے تو اُن کا احسان نہ مانے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ "عظیم تر" مقصد کے لئے فنا ہو جانا صوفیاء کرام اور علامہ اقبال دونوں کے نزدیک "زندگی" ہے۔ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے دین کے بنیادی اصولوں کی حفاظت کے لئے فنا ہو جانا عظیم ترین مقصد ہے۔ جسے شہادت کہتے ہیں اور اسی لئے قرآن پاک میں شہید کو زندۂ جاوید کا درجہ دیا گیا ہے۔ جیسا کہ آئندہ صفحہ پر بحوالۂ آیت قرآنی مذکور ہے۔ اس "عظیم ترین" مقصد کے لئے زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک ہزاروں انسانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ مگر ہم مسلمانوں کی نظر میں کسی کو وہ درجہ نصیب نہ ہوا جو حضرت امام حسین علیہ السلام کو عطاء ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ ان کا مقصد انسانیت کو نہ صرف اخلاقی و روحانی برائیوں سے بچانا تھا۔ بلکہ اُسے اخلاقی و روحانی بلندیوں پر پہنچنے کا رستہ دکھانا تھا۔ یہ راستہ خدا و رسولؐ کا پسندیدہ تھا۔ خدا کے لئے اپنی ہستی قربان کر دینے کا یہی مطلب ہے۔ کیا اس سے بہتر اور "عظیم تر" مقصد کوئی دوسرا بھی ہو سکتا ہے۔ عموماً قومی رہنماؤں کی قربانیوں کا مقصد محدود اور خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے۔ نہ وہ خدا کے لئے ہوتا ہے۔ نہ اس کا پسندیدہ اس لئے وہ ایک مسلم کے لئے قابل تقلید نہیں ہو سکتا۔

شہادتِ حضرت امام حسین علیہ السلام کے متعلق علامہ اقبال کے مندرجہ ذیل

Marfat.com

اشعار فرمودات اولیاء اللہ کا خلاصہ ہیں :۔

آں امام عاشقاں جانِ بتول
سروِ آزادے ز بستان رسولؐ
سُرخ رو عشقِ غیور از خونِ او
شوخیٔ ایں مصرعہ از مضمونِ او
بہرِ حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لا الٰہ[1] گردیدہ است
مدعائش سلطنت بودے اگر
خود نہ کردے باچنیں ساماں سفر
سرِّ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ بود
یعنے آں اجمال را تفصیل بود
عزم او چوں کوہساراں استوار
پائیدار و تُند و نیز و کامگار
تیغ بہر عزتِ دین است و بس
مقصد او حفظ آئین است و بس
ماسوی اللہ را مسلماں بندہ نیست
پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست

---

[1] مندرجہ ذیل مشہور رباعی جو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کی جاتی ہے اسی خیال کی مظہر ہے۔

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ ❊ دین است حسینؑ و دین پناہ است حسینؑ
سر داد و نداد دست در دستِ یزید ❊ حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

خون او تفسیر ایں اسرار کرد
ملتِ خوابیدہ را بیدار کرد
تیغ لا چوں از میاں بیروں کشید
از رگِ ارباب باطل خوں کشید
نقش اِلّا اللّٰہ بر صحرا نوشت
سطرِ عنوان نجاتِ ما نوشت
رمز قرآں از حسینؑ آموختیم
ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم
شوکتِ شام و فر بغداد رفت
سطوت غرناطہ ہم از یاد رفت
تار ما از زخمہ اش لرزاں ہنوز
تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز
اے صبا اے پیک دور افتادگاں
اشک ما بر خاک پاکِ او رساں

یہی وہ اصول حیات ہے جو ملتِ بیضا کی جان ہے۔ اسی لئے شہادت کو حیاتِ جاوید کہا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ؕ (البقرہ)

ترجمہ:۔ اور جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں۔ ان کو مرا ہوا نہ کہو۔ بلکہ وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم نہیں سمجھتے۔

Marfat.com

اس سے ثابت ہو گیا کہ اللہ کی اطاعت و محبت اسلام کے مسلمہ اصولوں کی حفاظت و ترویج کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینا اور خود بھی فنا ہو جانا حیات جاویدہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ (مشکوۃ)

مومن کا تحفہ موت ہے۔

اور یہ وہی موت ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ ایسی موت (شہادت) سعادت کبریٰ اور درجات عالیہ کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اور اس کی بنیاد جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے "عشق الٰہی" پر قائم ہے "عشق الٰہی" سے مراد یہ ہے کہ انسان کا ہر کام اللہ کی خوشنودی کے لئے ہو۔ اور اللہ کی خوشنودی اس کے قائم کردہ اصولوں کی تبلیغ اور خود ان پر عمل کرنے میں مضمر ہے۔ یہ زندگی جو "عشق الٰہی" اور ایثار و قربانی پر مشتمل ہے۔ صرف افراد تک محدود نہ رہنی چاہئے۔ بلکہ ضرورت ہے کہ پوری ملت اسلامیہ اس کے نشے میں سرشار ہو۔ جب تک ملت اسلامیہ حق پرست نہ بنے گی وہ خیر الامم بننے کے شرف سے محروم رہے گی۔ جب تک وہ باطل کے مقابلے میں صف آراء نہ ہو گی اور جب تک وہ موت سے ڈرتی رہے گی حقیقی زندگی سے محروم رہے گی۔

تاریخ شاہد ہے کہ آج تک کسی صوفی یا کسی شیخ طریقت نے ان اصولوں کی مخالفت نہیں کی۔ مخالفت تو درکنار تاریخ تو یہ شہادت دیتی ہے۔ کہ ان اصولوں کی حفاظت و ترویج صرف صوفیائے کرام نے ہی کی ہے۔ یا ان حکمرانوں نے جو فقراء اور اہل اللہ کے غلام تھے

بعض اہم امور جن کی تفصیل فرمودات اقبال میں نہیں ملتی

یہاں تک وہ باتیں بیان ہوئیں جو زیادہ تر موت وحیات کے عام فلسفے سے متعلق ہیں۔ اور جن کی بابت علامہ اقبال بھی وہی کہتے ہیں جو صوفیائے کرام اُن سے پہلے کہہ چکے ہیں۔ ان کی کتابوں سے زیادہ مثالیں پیش کی جا سکتی تھیں۔ لیکن بخوفِ طوالت اس سے احتراز کیا گیا۔

حیاتِ انسانی کے متعلق ابھی متعدد نکات کی وضاحت ضروری ہے مثلاً باطنِ انسان کی حقیقت اور اس کی اہمیت، اس کا "ارتقاء" یا ترقی کی نوعیت اور اسکی حد (وصل الی اللہ یا فراق) قلب انسانی کی تعریف، سلامتی قلب کی ضرورت واہمیت، فضائل قلبی کی تفصیلات، تطہیر قلب اور تزکیۂ نفس کے طریقے، زندگی میں عبادت کی ضرورت واہمیت، علم کے باطنی ذرائع (وحی والہام اور کشف وشہود وغیرہ) اور فلاح انسانیت میں ان کا حصہ، آخرت کی زندگی کی نوعیت، اُس کی کامیابی کے ذرائع وغیرہ وغیرہ۔

یہ اور اس قسم کے دیگر مسائلِ اسلامی تصوف میں بالتفصیل بیان کئے گئے ہیں۔ لہٰذا اس کی مدد کے بغیر ہم ان مسائل کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ نہ انسان کا صحیح مقام ہماری سمجھ میں آسکتا ہے۔ نہ ابدی زندگی کے حصول کا صحیح طریقۂ عمل معلوم ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ ایک مختصر سے مقالے میں یہ تمام مسائل پوری طرح بیان نہیں ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا چند باتیں بطور اختصار بیان کی جاتی ہیں۔

فراق و وصال یا فناء و بقاء	علامہ اقبال کے فلسفۂ حیات میں "وصل الی اللہ" جیسی اہم چیز کی اہمیت واضح نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ موصوف نے پُر زور الفاظ میں "وصل الی اللہ" کی مخالفت اور "فراق" کی تائید کی ہے۔ اس

صورتِ حال سے سخت غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور تصوف کے خلاف جس کا خاص الخاص مقصد وصل الی اللہ کے ساتھ امورِ خلافت کی انجام دہی ہے ایک زبردست محاذ تیار ہو گیا ہے۔ حالانکہ اقبال نے محض قومی و سیاسی ضرورت کی بناء پر فراق کی تائید کی ہے۔ ورنہ حقیقتاً وہ بھی اسی طرح "وصل الی اللہ" کے قائل ہیں جس طرح صوفیائے وجودی ہیں۔ اور انہی کی طرح وہ بھی

"منزلِ ما کبریاست"

ہی کہتے ہیں۔[۱]

بہرحال وہ سیاسی مقاصد کے پیشِ نظر (یعنے ملت کو مضبوط و طاقتور بنانے کے اشتیاق میں) اس بات کو عوام کا نقطۂ نظر نہیں بنانا چاہتے کہ وہ "فناء" کو غلط معنوں میں اختیار کریں۔ اسی لئے ان کے سامنے وہ یہ بات پیش کرتے ہیں۔ کہ "قطرے کا دریا میں فنا ہو جانا" عشرتِ قطرہ" نہیں بلکہ اس کی مکمل "موت" ہے لیکن اس سے صوفیہ کی "فناء" کے خلاف استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان کی "فناء" قطرہ کی فناء کی طرح جسمانی فنا نہیں ہے۔ خود علامہ اقبال "رموز" میں ایک جگہ فرماتے ہیں

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

(۱) یہاں "گم ہونے" سے ان کی مراد بھی وہی ہے۔ جو صوفیۂ کرام کی "فنا" سے ہوتی ہے اور جو دونوں کے نزدیک بہتر زندگی کے لئے ضروری ہے۔

(۲) یہاں اقبال نے بھی صوفیۂ کرام کی طرح فرد کے لئے "قطرہ" اور جماعت کے

---

[۱] تفصیل آئندہ صفحات میں مناسب مقام پر ملے گی۔ اور مضامین ماقبل میں بھی بیان ہو چکی ہے۔

Marfat.com

لئے "قلزم" بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ اور

(۳) ان کے نزدیک اس "گم شدگی" یا "فنا" کا نتیجہ یہ ہے کہ "قطرۂ وسعت طلب" "قلزم" بن جاتا ہے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں:۔

حضرتِ حق است دریائے عظیم
قطرۂ خورد است جنات نعیم
قطرہ باشد ہر کرا دریا بود
ہرچہ جز دریا بود سودا بود
چوں بدریا می توانی راہ یافت
سوئے یک شبنم چرا باید شتافت
ہر کہ کل شد جزو را با او چہ کار
زانکہ جاں شد عضو را با او چہ کار
گر تو ہستی مرد کل، کل را ببیں
کل طلب، کل باش، کل شو، کل گزیں (عطارؒ)

یہ ہے صوفیوں کی "فنا" جس پر خواہ مخواہ اعتراضات کیئے جاتے ہیں۔ اقبال اپنے سیاسی فلسفۂ فراق کے باوجود جماعت میں فرد کی گم شدگی اور اس کے "قلزم" بن جانے کے قائل ہیں۔ اور صوفیائے کرام فرد کے معنوی ارتقاء کے پیشِ نظر حضرت حق کے "قلزم عظیم" میں اس "قطرے" کی فنا کے قائل ہیں۔ کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق وہ اس طرح فنا ہو کر "باقی باللہ" بن سکتا ہے۔ اور یہی فنا ان کے نزدیک زندگی کی آخری منزل اور اس کا اصل مقصود ہے۔ واضح رہے کہ سیاسی دلی مقاصد سے ہٹ کر اقبال بھی "عالم من و تو" کے قائل نہیں اور "حریمِ ذات" کو مومن کا "نشیمن ابدی" سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ اگلے صفحات میں ذرا تفصیل سے

Marfat.com

بیان کیا گیا ہے۔

بہر حال فرد کی "فنا" سے نہ اقبال کے یہاں جسمانی فناء مراد ہے۔ نہ صوفیاء کرام کے یہاں۔ بہ ایں وجہ ان پر "نفی خودی" کا الزام سراسر خلاف انصاف ہے۔

موت، قبر اور قیامت وغیرہ الفاظ کے نئے معنے

ابھی تک فلسفۂ موت و حیات میں الفاظ "موت و حیات" چند مواقع کے سوا زیادہ تر لغوی معنوں میں استعمال کئے گئے ہیں۔ اب چند اشعار ایسے پیش کئے جاتے ہیں جن میں اقبال نے الفاظ "موت" "حیات" "قبر" اور "قیامت" وغیرہ کو بطور استعارہ بالکل مخصوص معنوں میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً محکومی و غلامی کو خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی وہ موت بلکہ "مرگ ابد" کہتے ہیں۔ اور جب تک محکوم قوم کے افراد اپنی غلامی و ذلت کی زنجیریں توڑ نہیں دیتے وہ اُن کی نظر میں مُردہ بلکہ زندہ درگور ہوتے ہیں۔ دور محکومی کو فنا کرنے یا انقلاب برپا کرنے کو وہ "قیامت" یا "حشر" کہتے ہیں اور آزاد ہو جانے کو مرکر دوبارہ زندہ ہوجانا کہتے ہیں۔

نے نصیب مار و کژدم نے نصیب دام و دد
ہے فقط محکوم قوموں کے لئے مرگ ابد
بانگ اسرافیل ان کو زندہ کر سکتی نہیں
"روح" سے تھا زندگی میں بھی یہ جن کا جسد
مر کے جی اٹھنا فقط آزاد مردوں کا ہے کام
گرچہ ہر ذی رُوح کی منزل ہے آغوش لحد

(ارمغان۔ ندائے غیب)

محکوم کی میت سے قبر بھی پناہ مانگتی ہے۔ نزاکت معنے کے ساتھ دلائل کی

قوت ملاحظہ ہو۔ قبر کہتی ہے۔

آہ ظالم تو جہاں میں بندۂ محکوم تھا
میں نہ سمجھی تھی کہ ہے کیوں خاک میری سوزناک
تیری میت سے مری تاریکیاں تاریک تر
تیری میت سے زمیں کا پردۂ ناموس چاک
اَلْحَذَرْ محکوم کی میت سے سو بار اَلْحَذَرْ
اے سرافیل! اے خدائے کائنات! اے جانِ پاک

(ارمغان۔ قبر)

اقبال کی نظر میں "یزداں صفت انسان" کی خواری اس کی دوامی موت ہے۔ اس کی عقل نے نئے نئے لات و منات تراش رکھے ہیں۔ جن کی پرستش میں وہ مبتلا ہے۔ یہی اس کے لئے "مرگِ دوام" ہے۔ اور اسی سے نجات حاصل کرنے کے لئے حیات و کائنات کی کشمکش جاری ہے۔ ایسے غلط نظامِ ہست و بود کو درہم برہم کرنے کے لئے "تخریب تمام" ضروری ہے۔ جسے اقبال بعض اوقات "قیامت" کہتے ہیں۔ ایسی "قیامت" سے اسرار وجود فاش ہوتے اور حیات و کائنات نئے سانچوں میں ڈھل کر نمودار ہوتی ہیں۔

گرچہ برہم ہے قیامت سے نظامِ ہست و بود
ہیں اسی آشوب سے بے پردہ اسرارِ وجود
زلزلے سے کوہ و در اڑتے ہیں مانندِ سحاب
زلزلے سے وادیوں میں تازہ چشموں کی نمود
ہر نئی تعمیر کو لازم ہے تخریبِ تمام
ہے اسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود

(ارمغان)

Marfat.com

ہر قوم کے افکار میں پیدا ہے تلاطم
مشرق میں ہے فردائے قیامت کی نمود آج
فطرت کے تقاضوں سے ہوا حشر پہ مجبور
وہ مردہ کہ تھا بانگ سرافیل کا محتاج

(ارمغان)

لیکن مذکورۂ بالا اشعار میں جس "موت" "قبر" "بانگِ سرافیل" "قیامت" یا "حل مشکلات" کا ذکر کیا گیا ہے وہ محض بطور استعارہ ہے۔ اور مقصد یہ ہے کہ مسلمان محکومی و غلامی کی ذلت سے نکلیں۔ ورنہ اگر الفاظ کے لغوی معنے لئے جائیں۔ تو زندگی کا بالکل ایک نیا نظریہ ہمارے سامنے آجائے گا جو اسلامی نظریۂ حیات کے قطعاً منافی ہوگا۔ ایسے نظریہ کا خلاصہ یہ ہوگا۔ کہ اس دنیائے فانی میں آزاد رہنا ہی زندگی ہے۔ خواہ اس آزادی کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ اس نظریۂ حیات میں (نعوذ باللہ) نہ خدا کی ضرورت رہ جاتی ہے نہ خدا کے سامنے اپنی بداعمالیوں کے متعلق جواب دہ ہونے کی۔ اس کے مطابق حشر و نشر اور بانگِ سرافیل کی بابت اسلامی عقائد غلط یا غیر ضروری ہو جاتے ہیں۔ صرف فطرت کے تقاضوں سے جو انقلاب قوم یا اقوام میں رُونما ہو وہی "حشر" ہے۔ باقی کچھ نہیں۔ اس نظریہ کی رُو سے "تخریب تمام" کی عام اجازت ہے۔ اخلاق، معاشرہ، بین الاقوامیت اور انسانیت وغیرہ بے معنی الفاظ اور دنیا کے تمام اخلاقی، رُوحانی اور بین الاقوامی یا انسانی قوانین غیر ضروری ہو جاتے ہیں۔ نہ کمالِ انسانیت کی کوئی حقیقت رہ جاتی ہے نہ نیابتِ الٰہی کی۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں اسلام کے منافی ہیں۔ اور علامہ اقبال کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ مذکورہ بالا اشعار میں جو باتیں محض بطور استعارہ کہی گئی ہیں۔ انہیں لغوی معنی میں مستقل نظریۂ حیات یا اسلامی نظریۂ حیات سمجھ لیا جائے۔ اسلام یقیناً آزادی ہی

Marfat.com

کا مذہب ہے لیکن وہ آزادی احکامِ خُدا و رسولؐ کی پابند ہے۔

علامہ اقبال نے آزادی کے ایک اور معنی لئے ہیں مثلاً

ایں چنیں دل خود نگر اللہ مست
جز بہ درویشی نمی آید بدست
اے جواں داماںِ او محکم بگیر
در غلامی زادۂ آزاد میر

ان اشعار میں صاف طور پر علامہ مسلمانوں کو یہ تلقین کر رہے ہیں کہ درویشی اختیار کر کے اللہ کی یاد میں مست رہنا ہی اصل آزادی ہے۔

چند دیگر سوالات جو حیاتِ انسانی میں بڑی اہمیّت رکھتے ہیں

۱ حیاتِ انسانی کی پیچیدگیوں کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل سوالات کا حل بھی ضروری ہے۔ مثلاً

(۱) کیا انسان کی شخصیت (PERSONALITY) اور اُس کی فردیت (INDIVIDUALITY) دونوں ایک ہیں یا الگ الگ حیثیت رکھتی ہیں؟

(۲) مندرجۂ بالا سوال کے جواب کی روشنی میں "کامل انسان" کے اوصاف کیا ہونے چاہئیں۔

(۳) بعض فلاسفروں کے اس قول یا نظریہ کا کیا مطلب ہے کہ "یہ کائنات ابھی ناتمام ہے اور آہستہ آہستہ کمال کی طرف بڑھ رہی ہے"۔ کیا کائنات بلحاظ صورت یا بہ لحاظ ہیئت ترکیبی یا بہ لحاظ نظم و ضبط یا بہ لحاظ افادہ و استفادہ یا کسی دوسرے طور پر ناتمام ہے یا وہ ہر لحاظ سے نامکمل ہے۔

(۴) قرآن پاک کے نظریۂ حیات و کائنات اور مذکورہ بالا نظریہ میں کیا فرق ہے۔

Marfat.com

(۵) حیاتِ انسانی میں وحی، الہام اور کشف وغیرہ کی کیا اہمیت ہے؟

(۶) اس دنیا میں "آزاد" انسان کی اخلاقی و روحانی ترقیوں کی نوعیت اور اُنکی حد کیا ہونی چاہیئے۔

(۷) کیا محکوم مسلمانوں کے اعمال صالحہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں ہیں

مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے کہ ان امور کا جائزہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں لیا جائے۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ فقراء اسلام اور علامہ اقبال کی تعلیمات کیا ہیں۔

جب تک ان سوالات کے صحیح جواب نہ مل جائیں۔ تو مسئلہ حیاتِ انسانی پوری طرح سمجھ میں آسکتا ہے۔ نہ اس دنیا میں زندگی کا صحیح راستہ متعین ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس مختصر مقالے میں ان تمام سوالات کے متعلق مفصل بحث نہیں کی جا سکتی ہے۔ لہذا فی الحال صرف چھٹے سوال پر کچھ روشنی ڈالی جاتی ہے۔

اس سوال کے دو حصے ہیں :۔

اوّل :۔ آزاد انسان بالخصوص آزاد مسلمان کی آزادی و ترقی کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟

دوم :۔ اس کی انتہا کیا ہے؟

حصہ اول کے جواب کا بیشتر حصہ اقبال کے "مرد مومن" کے اوصاف میں ملتا ہے۔ یہ اوصاف انفرادی بھی ہیں، اجتماعی بھی۔ ان میں ایک طرف اس کے علمی اخلاقی اور روحانی کمالات اور دوسری طرف قومی، سیاسی اور تمدنی زندگی کی خصوصیات شامل ہیں۔

افسوس ہے کہ نظریات اقبال پر سطحی نظر رکھنے والے حضرات یا ایسے مغربیت زدہ اشخاص جنہیں اسلامی فقر و تصوف سے خواہ مخواہ دشمنی ہے۔ صرف سیاسی اور

Marfat.com

تمدنی ترقیوں کو اقبال کے "مردِ مومن" کی خصوصیات سمجھتے ہیں۔ اور باقی تمام اوصاف کو جن کا تعلق انسانی اخلاق و رُوحانیت سے ہے۔ اور جنہیں اقبال نے اپنے سینکڑوں اشعار میں بالخصوص "قلندریت" یا "انسانِ کامل" سے متعلق بیان کیا ہے۔ فراموش کر جاتے ہیں۔ ؎[1]

سوال کے دوسرے حصے کا جواب بھی ایک حد تک اقبال کے "مردِ مومن" "قلندر" اور "انسانِ کامل" کے اوصاف میں داخل ہے۔ تاہم اس کی تشریح از سرِ نو کی جاتی ہے۔ تاکہ اس کی اہمیت واضح ہو جائے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رہے کہ "مردِ مومن" کے قلبی و رُوحانی اوصاف کو علامہ اقبال اس کے علمی، تمدنی اور سیاسی اوصاف پر ترجیح دیتے ہیں۔ بلکہ علمی، تمدنی اور سیاسی کمالات کو اس کے قلبی و رُوحانی اوصاف کے حصول کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ وہ اس منزل پر بھی نہیں ٹھہرتے بلکہ فقرائے اسلام اور اولیائے کرام کی طرح کائنات سے مناسب حد تک جائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اُسے "غیر حقیقی" سمجھتے اور اس کی محبت میں اُلجھ کر رہ جانے کو "منافیٔ توحید" جانتے ہیں۔ انہی نکات کی تصریح میرا اصل مقصد ہے۔ کیونکہ شارحین نظریۂ اقبال ان کو عموماً نظر انداز کر جاتے ہیں۔

علامہ کے ان اشعار پر غور کیجئے :-

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر
زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی
نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات

؎[1] ان امور کی تفصیل پچھلے مضامین میں بالخصوص "قرآنی انسان" "انسانِ کامل" کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ لہٰذا یہاں اس کا اعادہ غیر ضروری ہے۔

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

ان اشعار کو پڑھ کر ذہن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہنے سے کہ "بندۂ مومن کا مقام ورائے سپہر ہے"۔ اقبال کا اصل منشاء کیا ہے۔ کیا واقعی مومن کا اس دنیا میں کوئی مقام نہیں۔ یا مثلاً یہ کہ وہ زمین سے تا بہ ثریا ہر چیز کو لات و منات کیوں کہہ رہے ہیں۔ اگر واقعی ایسا ہے۔ تو اُن کے فلسفۂ خودی اور نظریۂ عمل و حرکت کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔ یا مثلاً یہ کہ "حریم ذات" کو "نشیمن ابدی" کہنے سے اقبال کا کیا مقصد ہے اور کس نہج پر وہ "نشیمن ابدی" ہو سکتا ہے۔ یا یہ کہ اگر "حریم ذات" مومن کا "نشیمن ابدی ہے۔ تو "ازیں خاکداں بروں جستن" کی قید کیوں لگائی جائے۔ کیا "حریم ذات" کی حدود عالم آخرت ہی سے شروع ہوتی ہیں۔ اور اس عالم حس و شہادت سے اُسے کوئی تعلق نہیں ؟ یا مثلاً یہ کہ اگر تیسرے مصرع میں "حریم ذات" سے محدود ذاتِ بندہ مراد ہے تو وہ مصرعۂ اول کے منافی ہوگا۔ پھر اس کا کیا مطلب لیا جائے۔ یا یہ کہ "جلوہ گاہِ صفات" سے کس کی صفات مراد ہیں۔ اور وہ نہیں کس کی "ذات" سے علیحدہ کر کے مسترد کیا جا رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

یہ سوالات خدا، بندہ اور کائنات کے باہمی تعلق کی حقیقت سے متعلق ہیں۔ اسے جس قوم یا مفکر نے جیسا سمجھا وہی اس کا مذہب ہوگا۔ اختلاف مذاہب زیادہ تر اختلاف فکر کا نتیجہ ہے۔

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

صوفیائے کرام کے نزدیک ان سوالات اور انہی جیسے دیگر سوالات کا جواب توحید ہے۔ اور وہی توحید جسے وہ توحید وجودی یا وحدت الوجود کہتے ہیں۔ ورنہ ذات مطلق یا حریم ذات کو محدود تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہوگا۔ اور صوفیائے اسلام اسی کو

Marfat.com

شرک ذاتی کہتے ہیں۔ کیونکہ غیر حق کا وجود "حقیقی" تسلیم کرنے سے شرک ذاتی لازم آئے گا۔ لہذا صحیح فکر انسانی کی بنیاد یہی ہے کہ بقول اقبال مثل نیاگاں لا موجود الا اللہ پر ایمان رکھا جائے۔ اور یہی توحید وجودی ہے۔

علامہ اقبال بھی اس پر مُصر ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں :۔

تو اے ناداں! دل آگاہ دریاب

بخود مثلِ نیاگاں راہ دریاب

چساں مومن کند پوشیدہ را فاش

ز لا موجود الا اللہ دریاب

جب تک فکر انسانی کی بنیاد صحیح نہ ہو، خدا، بندہ اور کائنات کے باہمی تعلق کی بابت جملہ عقائد غلط ہوں گے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ اسلامی توحید وجود سے متعلق اکابر صوفیائے اسلام کے عقائد کی کچھ وضاحت پھر کر دی جائے۔ ؎۱

صوفیائے کرام کے نظریۂ توحید کے مطابق "یہ جلوہ گاہ صفات" عین "حریم ذات" ہے۔ صفات کا وجود، ذات کے بغیر محال ہے۔ جملہ صفاتِ حسنیٰ مطلق کے اسماء و آثار و افعال کے مظاہر ہیں۔ اور انہی کے مجموعے کا نام عالم یا کائنات ہے۔ چنانچہ یہ عالم بہ لحاظ وجود حق تعالیٰ کا عین اور بلحاظ تعین اس کا غیر ہے۔ اور یہ غیریت اعتباری ہے۔

اس بیان کو ایک طرح یوں کہتے ہیں :۔

عالم ملک، عالم ملکوت مثالِ مطلق کا مظہر ہے اور عالم ملکوت و مثال مطلق عالم جبروت کا مظہر ہے اور عالم جبروت اعیان ثابتہ کا مظہر ہے۔ اور اعیان ثابتہ اسماء الٰہی کے مظہر ہیں۔ اور اسماء الٰہی حضرتِ واحدیت کے مظہر ہیں۔ اور حضرت واحدیت

؎۱ گذشتہ اوراق میں بھی مختلف طریقوں سے اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

؎۲ دیکھو "تحفۂ مرسلہ" از حضرت ابو سعید مبارک شیخ طریقت حضرت غوث الاعظم قدس سرہٗ العزیز

Marfat.com

حضرت احدیت کا مظہر ہے۔

اسی بیان کو دوسری طرح یوں بھی کہتے ہیں :۔

حضرات الٰہی پانچ ہیں۔ لہٰذا عالم کلید بھی پانچ ہوئے۔ پہلا حضرت غیب مطلق، جس کا نشان اعیان ثابتہ ہیں۔ اور اس کے مقابل دوسرا حضرت شہادت مطلق ہے اس کا نشان عالم ملک ہے۔ تیسرا حضرت غیب مضاف ہے جو غیب مطلق کے زیادہ قریب ہے۔ اس کا نشان عالم ارواح جبروتیہ ہے۔ جس کو عقول اور نفوس مجردہ بھی کہتے ہیں۔ چوتھا حضرت شہادت مضاف ہے جو شہادت مطلق کے زیادہ قریب ہے۔ اس کی علامت عالم ملکوت اور عالم مثال ہے۔ پانچواں وہ حضرت جو سب کا جامع ہے۔ اس کا نشان عالم انسانی ہے۔

یہ اقتباسات شرح رسالہ تحفۂ مرسلہ سے ماخوذ ہیں۔ تحفۂ مرسلہ کے مصنف حضرت شیخ مبارک ابو سعیدؒ ہیں۔ جو محبوب سبحانی، قطب ربانی، غوث الصمدانی حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد ہیں اور انہوں نے رسالہ مذکور خاص طور پر حضرت غوث پاکؒ ہی کی تعلیم کے لئے لکھا تھا۔ چنانچہ اسی رسالہ میں حضرت مصنف علیہ الرحمۃ ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

ترجمہ :۔ "اور یہ بات کہ تمام موجودات وجود کی حیثیت سے حق سبحانہٗ کی عین ہیں۔ اور تعین کی حیثیت سے حق سبحانہٗ کی غیر ہیں۔ اور غیریت اعتباری ہے۔ لیکن تحقیق کی حیثیت سے کُل حق سبحانہٗ تعالےٰ ہے اور اس کی مثال حباب و موج اور کوزۂ برف ہے کیونکہ یہ سب تحقیق کے رُو سے پانی کے عین اور تعین کی حیثیت سے پانی کے غیر ہیں" [1]

---

[1] حضرت مصنف علیہ الرحمۃ نے قرآن پاک کی متعدد آیات اور (باقی صفحہ ۳۶۶ پر)

شیخ المشائخ حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ رسالۂ انوار حقیقت میں فرماتے ہیں۔ جو بہ سلسلۂ تعلیم حضرت سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ لکھا گیا

"اے سید! عالم علم حق است کہ تجلی ذات بحث ظہورات بے نہایت دارد۔ اما تجلیات او پنج ظہور است۔ اول ظہور عالم اجمال است، دوم علم تفصیلی است، سوم صور روحانیہ است، چہارم ظہور صور مثالیہ۔ پنجم ظہور صور جسمانیہ۔ رباعی

واجب چوں تنزل کند از حضرت ذات
پنج است تنزلات او را درجات
غیب است و شہادت و وسط روح و مثال
والخامس جمعتہ و تلک الحضرات

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۶۵ :۔ احادیث صحیحہ پیش کر کے مذکورہ بالا مسئلہ وحدت الوجود کی وضاحت فرمائی ہے جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ توحید ذاتی (جیسا کہ اُسے وجودی صوفیہ کرام نے سمجھا ہے نہ کہ کسی دوسری قوم یا حکماء و مفکرین نے) از رُوئے قرآن و حدیث ثابت ہے۔ نہ وہ یونانی فلسفہ سے ماخوذ ہے نہ ہندؤں کے فلسفہ سے جیسا کہ غلطی سے مشہور کیا جاتا ہے۔ اہل یونان و ہند کے باطل عقائد مقالہ وجود و موجودات میں مختصراً بیان ہو چکے ہیں مسئلۂ مذکور کی بابت تحفۂ مرسلہ کے علاوہ حضرت قبلہ مولانا مولوی سید محمد فائق صاحب قادری چشتی، نیازی، نظامی کی معرکۃ الآراء کتاب "تحقیق الحق فی وجود مطلق" (مطبع نامی میرٹھ) کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل کتابیں اور بھی نہایت اہم ہیں اور آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں جب تک ان کا مطالعہ نہ کیا جائے اس مسئلہ کے بعض پہلو تشنۂ توضیح رہتے ہیں۔ کتابیں یہ ہیں:۔ (۱) تصوف اور قرآن مؤلفہ ڈاکٹر میر ولی الدین جامعہ عثمانیہ دکن (۲) نقد اقبال مولفہ حضرت میکش اکبر آبادی۔ آگرہ۔ ۱۲

و اگر ظہور انسانی را جُدا گیری ظہورات کُلیہ شش بود و ایں ظہورات را تنزلات خمسہ و ستہ و حضرات گویند اے سید! انسان جامع ہمہ ظہورات است .....“

حضرت قطب عالم مدارِ اعظم شاہ نیاز احمد قدس سرہُ العزیز رسالۂ تصوف میں فرماتے ہیں۔

” وحدت وجود ایں است کہ وجود بمعنی ہستی بحت عین ذات است نہ زائد است بر وے۔ نہ عارض است با و۔ ہموں یک ذات است کہ او را موجود ہم می گویند و وجود ہم می خوانند قبل از ظہور در پردۂ غیب مخفی بود۔ بے چونی و بے چگونی موسوم و بہ بے نامی و بے نشانی موصوف چوں خواست کہ معلوم و معروف گردد۔ لباس رنگا رنگ پوشیدہ از نہانخانۂ غیب در انجمن شہادت در آمد۔ پس وجود مطلق و ہستی بحت کہ ھو عبارت از ہموں است۔ از اطلاق خود تنزل نمودہ بہ لاہوت و جبروت و ملکوت و ناسوت در آمد و غیر وے دیگرے موجود نیست۔ یک ذات موجود است کہ بہ ہزاراں شیون نمودہ می آید ......“

غرض یہ کہ حق تعالے کے ظہور کو صوفیائے وجودیہ نے مختلف مراتب کی صورت میں بیان کیا ہے۔ جنہیں وہ ”تنزلات“ ”حضرات“ یا ”مراتب ظہور“ کہتے ہیں۔ یہ مراتب یا تنزلات وجوب و امکان، اطلاق و تعین یا تنزیہہ و تشبیہہ دونوں کے جامع ہیں[1]

---

[1] یہ اقتباسات حقیقت حال کو بطور اجمالی بیان کرتے ہیں۔ ہر مرتبہ ظہور و بطون کے مفصل اور مدلل بیان کے لئے کتب طریقت کی جانب رجوع کرنا ضروری ہے۔

Marfat.com

آئندہ سطور کے مطالعہ سے واضح ہوجائے گا کہ علامہ اقبال نے بھی اپنے خطبات و اشعار میں مذکورہ بالا نکات نئی نئی طرح سے لیکن انتہائی مجمل طور پر بیان کئے ہیں کیونکہ ان کا مقصد صوفیائے کرام کی طرح ان مسائل کو مسئلۂ دین کی حیثیت سے پیش کرنا نہ تھا۔ خطبات میں (جو دور حاضر کے فلسفی دماغوں کے لئے ہیں) ان کا طرز بیان خالص فلسفیانہ اور پیچیدہ ہے۔ البتہ اشعار میں بنیادی نکات دلچسپ انداز میں بیان ہوئے لیکن ان میں صوفیائے کرام کے نقطۂ نظر کی وضاحت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جن حضرات نے وجودی صوفیاء کرام کے لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا یا بطور سرسری کیا ہے۔ وہ علامہ کے افکار و عقائد پر روشنی ڈالتے وقت مضحکہ خیز باتیں بیان کرتے ہیں۔ اور انہیں (اقبال کو) خواہ مخواہ اکابر صوفیائے کرام کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس طرح حق کے بجائے باطل کی اشاعت بڑھ رہی ہے۔

جن حضرات نے صوفیائے کرام کے عقائد براہِ راست ان سے یا ان کی تصانیف سے نہیں معلوم کئے انہیں کیا حق ہے کہ غلط عقائد کو ان کے سر تھوپیں۔ یا جن عقائد کو وہ خود رد کر چکے ہیں (مثلاً یونان و ہند کے باطل عقائد فلسفہ وغیرہ) انہیں کیوں اُن سے منسوب کریں۔ یا ان کی اصطلاحات کا وہ مطلب بیان کریں جو خود انہوں نے نہیں بیان کیا۔

دنیا کی اکثر اقوام خدا کی قائل ہیں۔ لیکن جزئیات میں ایک کا تصور دوسرے سے مختلف ہے۔ اسی طرح توحید وجودی کا عقیدہ بھی متعدد اقوام میں پایا جاتا ہے لیکن جزئیات میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لہذا بعض الفاظ یا جملوں کو سطحی نظر سے دیکھ کر یہ کہہ دینا کہ اسلامی تصوف میں وحدت وجود کا عقیدہ یونانیوں، ہندؤں یا بدھ مذہب والوں سے لیا گیا ہے۔ اپنے ہی دین و مذہب، اپنے علماء محققین، اپنے فقراء و مشائخ اور خود اپنی فکر تحقیق کی توہین ہے۔

بہرحال اب ہم علامہ اقبال کی نظم و نثر سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔ جن میں

Marfat.com

قریب قریب وہی باتیں کہی گئی ہیں۔جو صوفیائے وجودی کہہ چکے ہیں۔صرف اسلوبِ بیان مختلف ہے۔ مثلاً

علامہ اقبال اپنے ایک خطبہ[1] "زمانِ محض" اور "مکانی زماں" کی بحث میں فرماتے ہیں۔

"ظاہر ہے کہ وقتی تغیر ایک نقص ہے۔ اور اگر ہماری نگاہ اسی نوع کے تغیرات پر مرکوز رہے۔تو ذاتِ حقہ کے کمال کے ساتھ حیاتِ حقہ کو کامل ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ابن حزم[2] نے یہی دقت محسوس کی ہوگی۔لیکن اس مشکل کے حل کی ایک صورت ہے۔ وہ یہ کہ مطلق الیغو ایک کلی حقیقت ہے اس کے وجود کی نوعیت ایسی نہیں کہ کائنات کو اس سے باہر اور اس سے غیر کوئی شی تصور کیا جائے۔لہذا اس کی حیات کے تمام پہلو بھی ہر لحاظ سے اس کے بطون[3] ہی سے متعلق متصور ہوں گے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تغیر کا اطلاق ان معنے میں کہ تغیر ایک حرکت کا نام ہے۔جو کسی ناقص مرحلہ سے نسبتاً کامل مرحلے کی جانب یا اس کے برعکس ہو۔حیاتِ باری تعالیٰ پر نہیں ہو سکتا۔لیکن[4] مذکورہ بالا نوعیت کا تغیر ہی حیات کی واحد ممکن صورت نہیں ہے۔اگر ہم اپنے شعوری تجربے کو زیادہ عمیق نظر سے دیکھیں تو معلوم

لے THE PHILOSOPHICAL TEST OF THE REVELATIONS OF RELIGIOUS EXPERIENCE.

ے ایک ہسپانوی عالم دین

سے لیکن از روئے قرآن پاک اس کے ظاہر سے متعلق بھی متصور ہونے چاہئیں۔کیونکہ وہی الظاہر بھی ہے اور الباطن بھی۔یہاں غالباً علامہ وجودِ حقیقی کے اس مرتبۂ بطون کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔جسے تصوفِ اسلامی میں مرتبۂ اطلاق یا احدیت کہتے ہیں۔ ۱۲

ے اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔

Marfat.com

ہوگا۔ کہ "مکانی زمان" کے ظاہری تسلسل کی تہ میں زمانِ حقیقی (زمانِ محض) پوشیدہ ہے[۱]۔ یہی زمان حقیقی ہے۔ جس میں (یا جس کے ساتھ) حقیقی ایغو[۲] موجود ہے۔ جہاں مذکورہ بالا تغیرات کا تسلسل ناپید ہے۔ جہاں وہ اپنی صحیح صورت میں یعنی ایک نوع کے مسلسل عملی تخلیق کی شکل میں

بقیہ حاشیہ صـ ۳۶۹ :- اس حقیقت کو صوفیائے وجودی یوں بیان کرتے ہیں کہ نقص، تغیر، زوال، موت اور فنا کا تعلق تعین یا صورت شے سے ہوا کرتا ہے۔ حقیقت شے سے نہیں کیونکہ بلحاظ حقیقت ہر شے حق تعالیٰ کی عین ہے۔ اور بلحاظ تعین اس کی غیر ہے۔

۱ نقوش کثرتِ امواج ظاہر دریا - حجاب وحدتِ باطن شدہ است دریارا (مغربیؒ)

۲ صوفیائے وجودی اپنی زبان میں مطلق ایغو کو ذات مطلق کہتے ہیں جس کی صفت بلحاظ زمانہ ازلیت و ابدیت ہے۔ زمانہ سے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "زمانہ کو گالیاں نہ دو۔ کیونکہ خدا تعالےٰ ہی زمانہ ہے۔" (ابو ہریرہ رضی) ایک دوسری روایت میں ہے۔ رسول پاک صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "خدا تعالےٰ فرماتا ہے۔ آدمی زمانے کو گالیاں دیتا ہے۔ حالانکہ میں زمانہ ہوں۔ میرے ہاتھ میں رات دن ہیں۔" (ابو ہریرہؓ) صحیح مسلم و صحیح بخاری۔

جس زمانے میں علامہ اقبال کی ملاقات مسولینی سے ہوئی۔ اس وقت زمان و مکان کی بحث کا ہر جگہ زور تھا۔ چنانچہ جب علامہ اقبال نے مسولینی سے رسول پاکؐ کی لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ والی حدیث بیان کی۔ تو اُسے سخت حیرت ہوئی۔ اور اُس نے انتہائی تعجب سے دریافت کیا کہ کیا واقعی آپ کے پیغمبرؐ نے زمانے سے متعلق یہ فرمایا ہے۔ اس پر علامہ نے اس کی مزید وضاحت فرمائی۔ ایک دوسری جگہ علامہ اسی نکتے کی جانب اشارہ کرکے فرماتے ہیں۔ کہ "...... اور تو اور مسئلہ زمان و مکان بھی ہمارے صوفیائے کرام کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

Marfat.com

جلوہ گر رہتا ہے۔ اور جہاں اُسے کسی قسم کی تسکان، غنودگی یا نیند چھو بھی نہیں سکتی......"

آگے چل کر علامہ اقبال مقصد حیات اور حیات کو علم و تفکر کی مدد سے سمجھنے اور وجدان کی مدد سے اس کا مشاہدہ کرنے کی بابت فرماتے ہیں:۔

"حیات کوئی بے صورت رقیق و سیال شئ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک تنظیمی اصول اتحاد یا ترکیبی حرکت و فعالیت ہے۔ جو ایک تعمیری مقصد کے لئے تمام ذی رُوح اشیاء کی انتشاری قوتوں کو متحد و مربوط رکھتی ہے۔ عمل فکر جو محض ایک علامت کی حیثیت رکھتا ہے اور حیات کی حقیقت کو ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ اور اس کا تصور صرف ایک ایسے عالم گیر سیل رواں یا رو کی شکل میں کر سکتا ہے۔ جو تمام اشیاء کے وجود میں جاری وساری ہو ہم۔ اپنے باطن کی مدد سے حیات کے محسوس پہلو کا علم براہ راست حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں وجدان کے ذریعہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ حیات ایک ایغو ہے۔ جس کی حیثیت مرکزی ہے .... حقیقت کی اصل روحانی ہے۔ اور اسے ایک ایغو ہی تصوّر کرنا چاہیے ...."

فلسفہ اور دین (معرفت حق تعالےٰ بذریعہ کشف و وجدان) کا مقابلہ کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں:۔

"فلسفہ کا کام اشیاء کا علمی مطالعہ ہے۔ اور اس حیثیت میں وہ ایک ایسے تصور کی حد سے آگے بڑھنے کی فکر نہیں کرتا جو تجربے کی گوناگوں انواع کو ایک نظام میں منسلک کر دیتا ہے۔ گویا وہ حقیقت کا مطالعہ دور سے کرتا ہے۔ اس کے برعکس "دین" حقیقت کو قریب سے دیکھتا ہے۔ اول الذکر محض نظریہ ہے۔ لیکن آخر الذکر ایک زندہ تجربہ حقیقت

Marfat.com

کے ساتھ ایک رابطہ اور اس کے قرب کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اس قرب کے حصول کے لئے فکر کو اپنی سطح سے بلند ہونا چاہیئے۔ اور اپنی تکمیل قلب کے اس رجحان کی شکل میں کرنا چاہیئے جسے مذہب کی زبان میں "عبادت" کہتے ہیں۔ اور یہی لفظ پیغمبر (اسلام صلے اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے نکلنے والے آخری الفاظ میں سے ایک تھا......" [1]

اقتباسات ذرا طویل ہو گئے۔ لیکن جب تک ہم ان نکات کے متعلق جن کا ذکر اقتباسات مذکورہ میں کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال اور صوفیائے کرام کے خیالات کی یکسانیت کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں نہ اسلامی تصوف کی اہمیت و عظمت کے قائل ہو سکتے ہیں۔ نہ علامہ اقبال سے یہ الزام دور ہو سکتا ہے کہ وہ تصوف کے خلاف تھے۔ نہ یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ حقیقتِ حیات اور مقصد حیات انسانی سے علامہ اقبال نے صوفیاء کرام کے نظریات و عقائد ہی سے اتفاق کیا ہے۔ یہ مسائل ایسے نہیں ہیں کہ چند اوراق میں انہیں سمیٹ لیا جائے۔ لہذا دو ایک اقتباس علامہ کے پہلے خطبے سے بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ علامہ کا پہلا خطبہ اس امر سے متعلق ہے کہ انسانی زندگی میں ظاہری اور باطنی علوم دونوں ضروری ہیں۔ مگر وارداتِ قلبی یا مکاشفات باطنی کا درجہ ظاہری علوم سے زیادہ بلند ہے چنانچہ فرماتے ہیں :۔

"قرآنِ پاک تسلیم کرتا ہے کہ کائنات کے ساتھ انسان کا تعلق بہت گہرا ہے اسی ربط و تعلق کی وجہ سے انسان کائنات کی تسخیر کر سکتا ہے۔ مگر اس کا مقصد دوسرے اشخاص و اقوام پر غلبہ حاصل کرنا نہیں بلکہ یہ ہونا چاہیئے کہ انسان آزادی کے ساتھ روحانیت میں ترقی حاصل کر سکے۔ لہذا حقیقت کے

---

[1] اقتباسات از خطبۂ اقبال
The PhilosoPhical Test oF ---------- Experience.

Marfat.com

کامل عرفان کے لئے ضروری ہے کہ حواس خمسہ کے ذریعہ حاصل ہونے والے علم کے علاوہ قرآن پاک کے الفاظ میں "فواد" یا "قلب" کے مکاشفات بھی انسان کی مدد کریں۔" (آیات قرآنی ۳۲-۶-۸)

اس سے آگے علامہ "واردات قلبی" کی خصوصیات بیان کر کے فرماتے ہیں :-

"غرض یہ کہ جہاں تک علم کا تعلق ہے۔ اہل تصوف کا باطنی مکاشفہ بھی اتنا ہی حقیقی ہوتا ہے جتنا کہ کسی انسان کے لئے دیگر ذرائع علمی ہو سکتے ہیں[۱]۔

اور واردات قلبی کی پانچویں خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :-

"ابدی ذات الٰہی سے خود کو اقرب پانے کی وجہ سے صوفی "مکانی زمان" کو غیر حقیقی سمجھتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مکانی زمان سے بالکل بے تعلق ہو جاتا ہے۔ "واردات قلبی" (مکاشفہ یا عرفان) اپنی عجیب نوعیت کے لحاظ سے کسی نہ کسی صورت میں عام نوعیت کے تجربہ (علم) کے ساتھ ربط قائم رکھتا ہے ......[۱]"

اور کائنات کے خارجی پہلو اور اس کی حقیقت کے متعلق ایک دوسرے خطبہ میں فرماتے ہیں :-

"یہ دنیا اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس شئے کی میکانکی قوت سے لے کر جسے ہم مادے کا ایٹم کہتے ہیں۔ انسانی انا کے تصور کی بالکل آزادانہ حرکت تک "انائے اعظم" کا خود کو ظاہر کرنا ہے ...... یہ عالم جیسا کہ کہا جا چکا ہے خدا کے حریف غیر کی حیثیت سے موجود نہیں ہے۔ عالم ایک آزاد غیر کی حیثیت سے جب ہی ظاہر ہو سکتا ہے جب ہم عمل تخلیق کو خدا کی تاریخ حیات

---

[۱] خطبہ اول علامہ اقبال۔ ۱۲

[۲] خطبہ اقبال۔ "خدا کا تصور اور عبادت کے معنے" ماخوذ از نقد اقبال ص۱۳۴، ص۱۳۵

Marfat.com

میں ایک اہم اور ممتاز واقعہ تسلیم کریں۔ ایک "انائے محیط" کے نظریے سے کوئی غیر نہیں ہے۔ اس میں تصور اور عمل، جاننے کا عمل اور تخلیقی عمل سب ایک حیثیت رکھتے ہیں......"

ان تمام اقتباسات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ (۱) اکابر صوفیہ کی طرح علامہ اقبال بھی جس وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ وہ محض علمی نہیں بلکہ "حالی" ہے اور [جہاں تک حریم ذات میں بندے کے نشیمن ابدی ہونے کا تعلق ہے] صوفیائے کرام کی طرح وہ بھی

(۲) کائنات کو حق کا عین سمجھتے ہیں۔

(۳) قلب انسانی (باطن) کو حق سبحانہ، تعالیٰ کی معیت و اقربیت کے قابل مانتے۔

(۴) معرفت حق کے لئے علم اکتسابی پر وارداتِ قلبی (کشف صدر، یا وجدان) کو ترجیح دیتے اور

(۵) وصل الی اللہ ہی کو مومن کا اصل مقام قرار دیتے ہیں۔ [1]

اب ایک مرتبہ ان کے یہ اشعار دوبارہ پڑھئے:۔

مقام بندۂ مومن کا ہے ورائے سپہر [2]
زمیں سے تا بہ ثریا تمام لات و منات
حریم ذات ہے اس کا نشیمن ابدی
نہ تیرہ خاک لحد ہے نہ جلوہ گاہ صفات

---

[1] علامہ کے فلسفۂ "فراق" پر آئندہ صفحات میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور گذشتہ صفحات میں بھی ایک جگہ اسے بیان کر دیا گیا ہے۔

[2] "ورائے سپہر" سے علامہ کی مراد بعد موت نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ مومن کا اصل مقام بہت بلند ہے جس کے سامنے مادیت یا مادی مفادات کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔

Marfat.com

خود آگہاں[۱] کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند

ان کے یہ اشعار بھی اسلامی وحدت الوجود کو واضح کرتے ہیں :-

وہی اصل مکان و لامکاں ہے
مکاں کیا شے ہے انداز بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے

انداز گفتگو نے دھوکے دئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو

حقیقت میں جب حق سبحانہ' و تعالےٰ کو بقول اقبال اصل مکان و لامکان، اور بقول صوفیائے کرام "جامع تنزیہہ و تشبیہ" نہ تسلیم کیا جائے۔ اقبال کا "مرد مومن" یا "قلندر" اس مقام اعلیٰ سے محروم رہے گا۔ جہاں وہ اُسے دیکھنا چاہتے ہیں۔

(تنزلات ستہ[۲] علامہ کی موافقت[۳])

علامہ اقبال صرف انہی امور کے بیان پہ اکتفا نہیں کرتے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ بلکہ

۱ے قلب کی حقیقت اور اس کے انتہائی مقام عروج کو سمجھنے والے انسان (اولیاء اللہ)
۲ے یعنی وہ مکان میں رہتے ہوئے لامکان کی سیر کرتے ہیں۔ ۳ے (اگلا صفحہ ملاحظہ ہو)

Marfat.com

ان کے یہاں مجملاً "مراتب ظہور" کا ذکر بھی ملتا ہے۔ جسے تصوف کی اصطلاح میں "تنزلات" کہتے ہیں۔ "تنزلات" کے مفصل بیان کے لئے معتبر کتب تصوف کا مطالعہ ضروری ہے۔ تاہم سطور ذیل سے بھی کافی مدد مل سکتی ہے۔

فلسفیوں نے انسان کی تعریف کے سلسلے میں کہا ہے۔ کہ وہ جوہر ہے جسم رکھتا ہے۔ اس میں قوت نمو ہے۔ وہ حساس ہے۔ اپنے ارادے سے حرکت کرتا ہے عقل و تمیز رکھتا ہے۔ جزئیات و کلیات کو سمجھتا ہے (انہیں انسان کے مراتب وجود کہہ لیجئے) یعنے وہ بیک وقت جوہر بھی ہے اور وہ سب کچھ بھی جو اس کے بعد مذکور ہوا۔ اتنی قیدیں اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کرنے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ لیکن ان قیود سے انسان کے جوہر ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ایک ہی وقت میں سب کچھ ہے۔

اسی طرح صوفیوں نے اپنی فکر کا سلسلہ (وجودِ مطلق سے متعلق) اس کی صفت اطلاق سے شروع کیا۔ اور قیدیں بڑھاتے گئے۔ اس سلسلہ کی آخری کڑی انسان ہے۔ اس فکر میں "وجود" سے مراد "ہستی" ہے۔ جس کی ضد "عدم" ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جس پر ہستی یا وجود کا اطلاق نہ ہو۔ کیونکہ "وجود" میں صوفیائے کرام کے نزدیک وجود مطلق سے لے کر کائنات کا ذرہ ذرہ شامل ہے۔ اور جس طرح انسان کے جوہر ہونے میں اس کے دیگر "مراتب وجود" سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح وجود مطلق میں بھی اس کے دیگر "مراتب وجود" یا "مراتب ظہور" سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اَلآنَ کَمَا کَانَ (جیسا وہ پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے) البتہ اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ یہ ترتیب وجود مروجہ نظریۂ ارتقاء کی طرح زمانی نہیں ہے۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۵:- اس کا کچھ ذکر گذشتہ صفحات میں بھی دو ایک موقعہ پر ہو چکا ہے۔ مثلاً صفحہ ۲۳، ۱۳۴، اور ۱۸۶

Marfat.com

اس طرح فکر کرنے اور وجودِ مطلق کو اس ترتیب سے (جیسا کہ صوفیاء کرام نے بیان کیا ہے) بیان کرنے کو اصطلاحِ تصوف میں "تنزّلات" کہتے ہیں۔

علامہ اقبال کو پہلے اس سے کچھ اختلاف نہ تھا۔ جس کا ذکر بعض جگہ ملتا ہے۔ لیکن ان کا فلسفۂ حیات بھی "مراتب وجود" کے ذکر سے خالی نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے اپنا خیال بعد میں تبدیل کر دیا۔ علامہ کے اکثر اشعار جو "زندگی" سے متعلق ہیں۔ کسی نہ کسی شکل میں "مراتب وجود" یا "مراتب حیات" ہی کو بیان کرتے ہیں مثلاً بالِ جبریل کے "ساقی نامہ" میں لفظ زندگی حقیقت الحقائق ہی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ خدا فراموش فلاسفروں کو خدا کے قریب لانے کی بہترین صورت یہی ہے کہ خدا کو "زندگی" کہا جائے۔ ورنہ زندگی تو خدائے حیّ و قیّوم کی ایک صفت ہے زندہ تو کوئی ذات ہی ہو سکتی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ذات کا وجود نہ مانا جائے اور اس کی صفت زندگی کو سب کچھ سمجھا جائے۔ بہرحال جو صفات "زندگی" کی ان اشعار میں بیان ہوئی ہیں وہ سب خدا کی صفات ہیں۔ اور صوفیائے کرام کی زبان میں وہ "وجودِ حقیقی" کے "مراتب ظہور یا تنزّلات" ہی کے دائرے میں رکھی جائیں گی۔ حالانکہ اس نظم میں انہیں "تنزّلات" کے نام سے بیان نہیں کیا گیا ہے۔ نہ ہی وہ توضیح و ترتیب ہے جو ہمیں صوفیاء کرام کی کتابوں میں ملتی ہے۔ بہرحال حسب ذیل اشعار کو بغور پڑھیئے۔ جو صفات ان اشعار میں "زندگی" کے نام سے مذکور ہیں۔ وہ تقریباً سب خدا کی صفات ہیں:۔

دما دم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود

Marfat.com

یہ ثابت بھی ہے اور سیّار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں

حتیٰ کہ اس شعر میں لفظ وجود استعمال کرتے ہیں جس سے ابہام رفع ہو جاتا ہے

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود[1]

اسی نظم میں ایک جگہ "نزول" کو یوں بیان کرتے ہیں۔ (لفظ "اترنا" نزول ہی کا ترجمہ ہے) :-

اتر کر جہانِ مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی[2] سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

---

[1] یہ شعر کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ کے مفہوم کو واضح کر رہا ہے۔

[2] لفظ "دوئی" یا غیریت بھی صوفیائے وجودی کی اصطلاح ہے۔ (باقی آئندہ صفحہ ملاحظہ ہو)

گُل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

اور "زندگی" کے بقائے دوام سے متعلق کہتے ہیں :۔

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

اور اس کی ابدیت و ازلیت کی بابت فرماتے ہیں :۔

بڑی تیز جولاں بڑی زود رس
ازل سے ابد تک رم یک نفس
زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

اور اس "ذوقِ ظہور" کو جس کی طرف حدیث قدسی کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً ..... الخ میں اشارہ ہے اقبال نے مذکورہ ساقی نامہ کے مندرجہ ذیل اشعار میں "خودی" سے منسوب کیا ہے۔ اور صوفیائے کرام نے اُسے "ذاتِ واجب الوجود" سے تعبیر کیا ہے۔ جیسا کہ خود ذاتِ باری تعالیٰ کا ارشاد حدیث مذکورہ کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے۔ اب یہاں "خودی" اور "ذات" سمجھ لیجئے۔ یا اس کے ذوقِ ظہور (مذاقِ دُوئی) کا مرتبہ جامع حقیقتِ انسانیہ۔ بہرحال علامہ کے یہ خیالات وجودی صوفیہ کے عقیدۂ "تنزلات" کے دائرے سے باہر نہیں رکھے جا سکتے۔ وہ اشعار یہ ہیں :۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۸ :۔ جو امتیازی ہے۔ اور "مذاقِ ظہور" کو مطمئن کرنے کے لئے وجودِ حقیقی نے خود پیدا کی ہے۔ بموجب حدیث قدسی

کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً فَاَحْبَبْتُ اَنْ اُعْرَفَ فَخَلَقْتُ الْخَلْقَ

یعنے تھا میں ایک خزانہ مخفی۔ پس چاہا میں نے کہ پہچانا جاؤں۔ پس خلق کی میں نے یہ مخلوق۔

Marfat.com

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

فرمائیے پچھلے اوراق میں جو کچھ "وحدت وجود" اور "تنزلات" سے متعلق صوفیائے کرام اور علامہ اقبال کے کلام و خطبات سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں واقعی اور بنیادی فرق کیا ہے؟

(وصال و فراق)

ہم حیات سے متعلق چند اہم سوالات کے سلسلہ میں سوال نمبر ۱ پر غور کر رہے تھے۔ ابھی تک اس سلسلے میں "آزاد مرد مومن" کی ترقی کے اخلاقی و روحانی پہلوؤں پر ہی روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ علامہ اقبال کا فلسفۂ حیات بنیادی طور پر صوفیائے وجودی کے نظریۂ حیات سے مختلف نہیں ہے۔ لیکن ابھی یہ بتانا باقی ہے کہ مومن کی ترقی کی انتہاء وصل الی اللہ ہے یا فراق۔ علامہ نے وصل اور فراق دونوں ہی کی موافقت کی ہے۔ لہذا وضاحت ضروری ہے۔

Marfat.com

واضح رہے کہ نقطہ کا پھیلاؤ۔ بصورت دائرہ۔ اور دائرے کا سمٹاؤ بسمت مرکز — یا اجمال کی تفصیل اور تفصیل کا اجمال (یعنے مرتبۂ اطلاق سے مرتبۂ انسان تک "ذاتِ واجب الوجود" کا نزول، پھر حقیقت انسانیہ کا اپنے مرکز اصلی کی جانب رجوع (عروج یا معراج) دونوں امور فطری و حقیقی ہیں) ایک کی موافقت اور دوسرے کی مخالفت امر محال ہے۔

انسان مرتبۂ جامعیت میں ہے۔ اور برزخ کی کیفیت رکھتا ہے۔ لہذا اس کا واسطہ جانبین سے ہے۔ جب وہ اپنے بطون کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ تو اس پر منصب ولایت کے آثار و احکام کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور جب وہ ظاہر کی جانب متوجہ ہوتا ہے تو اس پر عالم حس و شہادت کے احکام علیٰ قدر مراتب عائد ہوتے ہیں۔ وہ کبھی اعلیٰ سطح حیات پر ہوتا ہے۔ کبھی ادنیٰ پر جس وقت جس سطح حیات پر ہوتا ہے۔ اس وقت اسی سطح حیات کی بات کرتا ہے اور اسی کی مناسبت سے کلام کرتا ہے[1]۔ لیکن ہر سطح حیات پر بھی مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ لہذا ایک ہی سطح پر ایک شخص کا حال دوسرے سے مختلف نظر آتا ہے۔ ان حالات و کیفیات کو صوفیائے کرام نے وصل، قرب، فراق یا اس قسم کی دیگر اصطلاحات کے تحت بیان کیا ہے۔ اور علامہ اقبال کے کلام میں انہی اصطلاحات کا مفہوم مختلف طور پہ مذکور ہے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ اسفل سے اعلیٰ کی طرف عروج کرنا۔ انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اور اس عروج کی کوئی انتہا نہیں۔ اقبال بھی اس کے قائل ہیں چنانچہ فرماتے ہیں :-

---

[1] اسی لئے بعض اوقات اس سے ادنیٰ سطح حیات پر رہنے والے انسان کی سمجھ میں نہ اس کی بات آتی ہے نہ عمل اور وہ ان پر معترض ہوتا ہے۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اور بالِ جبریل کے "ساقی نامہ" میں اس کی کچھ تفصیل یوں بیان کی ہے :-

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش[1]
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش[2]
خودی کی یہ ہے منزل اولیں
مسافر[3] یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر[4]
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

۱۔ اگر اسی کو منتہائے مقصود سمجھ لیا جائے تو بے شک وہ "بت خانہ" سے زیادہ حیثیت نہ رکھیگا

۲۔ خدا فراموش انسان کی نظر میں محض کھانے پینے کا نام "زندگی" ہے۔ اقبال ایسے ہی اشخاص کے نقطۂ نظر کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ایسی زندگی جانوروں کی زندگی ہے۔ اسی لئے قرآن پاک اُولٰئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (وہ چوپاؤں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ) فرماتا ہے۔

۳۔ اللہ کی طرف بڑھنے والا مسافر یعنی سالک

۴۔ طلسم "زمان و مکان" کس طرح توڑا جائے۔ اس کیلئے اولیاء کرام کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے۔

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود[1]
تو ہے فاتح عالم خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ[2]
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینہ میں شمع نفس
مگر تاب گفتار کہتی ہے بس
اگر یک سرے موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم[3]

ان اشعار میں صاف صاف اشارے موجود ہیں۔ کہ مومن (طالب مولا) کی زندگی یا ترقی کی آخری منزل وصل الی اللہ ہے اور کچھ نہیں۔

جن اشعار میں صاف صاف وصل الی اللہ کا ذکر ہے ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ یہاں بطور اعادہ دو چار نقل کئے جاتے ہیں۔ مثلاً

---

[1] یہاں وجود اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ جس میں اسلامی عقیدہ وحدت الوجود میں استعمال ہوتا ہے اسی کے اندر عالم مثال، عالم ارواح، ملکوت، لاہوت وغیرہ موجود ہیں۔ اور سالک ان سے گذرتا ہوا حق تک پہنچتا ہے اقبال انہی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

[2] اولیاء اللہ نے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ ان امور کو الفاظ میں ادا کرنا ناممکن ہے۔ اسی لئے "حال" کا درجہ "قال" سے بلند ہے۔ اقبال بھی یہی اعتراف کر رہے ہیں۔

[3] واضح رہے کہ یہ شعر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج شریف کے سلسلے میں کہا گیا ہے۔ اور اس مقام قرب کو واضح کر رہا ہے جس کے آگے قدم رکھنے کی مجال جبرئیلؑ کو بھی نہ تھی۔

مٹا دیا میرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُو

میانۂ من و او ربط دیدہ و نظر است
کہ در نہایت دوری ہمیشہ با ادیم

بے تو از خواب عدم دیدہ کشودن نتواں
بے تو بودن نتواں با تو نبودن نتواں

اور وصل الی اللہ کی سند کس قدر بلیغ اور پرزور پیش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

مرد مومن در نسازد با صفات
مصطفےٰؐ راضی نہ شد اِلَّا بذات

خلاصہ

گذشتہ اوراق میں جو کچھ مذکور ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :۔

اولیاء کرامؒ اور اکابر صوفیہ نے فرد (مومن) کی موت و حیات کے ہر پہلو سے متعلق اپنے جو عقائد عشق الٰہی کے زاویۂ نظر سے بیان کئے ہیں۔ علامہ اقبال اُن سے سرمو اختلاف نہیں رکھتے۔ جن امور سے شروع میں اختلاف کیا تھا۔ بعد میں ان سے بھی اتفاق کیا ہے۔ البتہ صوفیائے کرام کی اصطلاحات بہت کم استعمال کی ہیں۔

دوسرا فرق موضوعات کی تفصیل و تدوین اور ترقی کے ظاہری و باطنی پہلوؤں میں سے کسی ایک پر زیادہ زور دینے سے متعلق ہے۔

صوفیائے کرام نے محض اللہ تعالیٰ اور اس کی محبت پر نظر رکھتے ہوئے خدارسی کا ایک مکمل ضابطہ نہ صرف مدوّن کیا بلکہ عملاً اپنے نظام تربیت کو ہر زمانے میں کامیاب بنا کر دنیا کے سامنے پیش بھی کیا ہے۔ ساتھ ساتھ قوم و ملت کی ایسی ایسی اہم گرانقدر

اور دور رس خدمات انجام دی ہیں۔ دیگر عصری قوتیں، جماعتیں یا ہستیاں انجام نہ دے سکیں۔[1]

علامہ اقبال نے صوفیاء کرام کی تائید کرتے ہوئے ملت کی توجہ عصری تقاضوں کی جانب مبذول کرائی ہے۔ اس لئے ان کے یہاں تفصیل پر قومی، ملی اور سیاسی رنگ غالب ہے علاوہ ازیں وہ ایک فلسفی بھی تھے۔ اس لئے فلسفہ پسند اشخاص کو خدا سے قریب کرنے کے لئے فلسفیانہ طرز استدلال استعمال کرتے ہیں۔

لہذا یہ نتیجہ نکالنا کہ صوفیائے کرام ملی خدمت اور ظاہری ترقی کے۔ اور علامہ اقبال اسلامی تصوف اور صوفیاء کرام کے خلاف تھے سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔

---

[1] دیکھو تالیف ہذا صفحات ۱۱ تا ۱۳ جہاں صوفیائے کرام کی اہم خدمات کا صرف ایک معمولی سا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ علاوہ بریں مقالہ نمبر ۹ بھی دیکھو۔

Marfat.com

(۱۳)

حقیقتِ حیات

کی جانب

سائنس و فلسفہ کی راہنمائی

Marfat.com

۷۸۶

إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ؕ

تاکید جانو کہ حق تعالیٰ کی تلاش میں تخمین وظن سے کام نہیں چلتا۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

(اکبر)

حکیمی نامسلمانی خودی کی
کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی

(اقبالؔ)

Marfat.com

حقیقتِ حیات کی جانب

سائنس و فلسفہ کی راہنمائی

حقیقتِ حیات کیا ہے۔ اور اس کا عرفان کس طرح حاصل ہو؟ یہ سوالات فطری بھی ہیں اور مذہبی بھی۔ فطری ان معنے میں کہ وہ انسانی فطرت کی گہرائیوں سے تعلق رکھتے ہیں اور غور و فکر کرنے والوں نے ہمیشہ ان کے جوابات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کے دل میں کبھی یہ سوالات نہ پیدا ہوں۔

یہ سوالات مذہبی ان معنے میں ہیں کہ ان کا جواب سائنس اور فلسفہ کی دسترس سے باہر ہے۔ ان کے جواب کے لئے انسان کی صرف استدلالی عقل اور اس کے ظاہری حواس کی مدد کافی نہیں ہے۔ بلکہ ان کے علاوہ علم کے بعض جدید ذرائع کی ضرورت ہے جنہیں مذہب اسلام کی زبان میں "وحی و نبوت" اور "کشف و الہام" کہا جاتا ہے۔ ان ذرائع کی مدد نہ لے کر ان سوالات کا جو جواب بھی دیا جائے گا۔ وہ حقیقت کے مقابلے میں وہم و ظن سے زیادہ قریب ہوگا۔

حقیقتِ حیات سے اہل فلسفہ کی مراد ایک قوتِ تخلیقی یا ارتقائی ہے۔ جسے وہ "خدا" نہیں کہتے۔ لیکن مسلمان حیات کو ذاتِ حیؔ و قیوم کی ایک صفت قرار دیتے ہیں اور "حقیقتِ حیات" سے حیات مطلقہ یا ذات الٰہی مراد لیتے ہیں۔

ہر چند کہ مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر "حقیقت حیات" کو سمجھنے کے لئے سائنس اور فلسفہ کے ذکر کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ تاہم محض تفصیلی معلومات کے لئے اور یہ بتانے کی خاطر کہ زمانۂ حال کے بعض سائنس دانوں اور فلاسفروں کے خیالات و نظریات میں کچھ نئی تبدیلیاں ایسی ہوئی ہیں۔ جو انہیں صوفیاء کرام کے نظریات کے قریب لائی ہیں۔ اُن کا

کچھ مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

"سائنس" سے تو زیادہ الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق محسوسات سے ہے۔ مغیبات سے نہیں۔ بقول علامہ مناظر احسن گیلانی "ہم سائنس کے ذریعہ آسمان کے تارے گن سکتے ہیں۔ آفتاب کو ناپ سکتے ہیں۔ ہوا کو تول سکتے ہیں سمندر کو خشک کرکے بادل بناکر پانی برسا سکتے ہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ آئندہ مُردوں کو زندہ کرنے کی تدبیر بھی معلوم ہو جائے جیسا کہ حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے...... لیکن بایں ہمہ مذہبی سوالات (یعنے عالم غیر محسوس سے متعلق سوالات) کے حل میں وہ اسی طرح عاجز رہے گی جس طرح پہلے تھی اور اس وقت تک ہے۔ فرض کیجئے کہ کیمیائی عناصر کی ترکیب سے ہم نے زندگی کو پیدا کر بھی لیا۔ تو اس سے یہ مسئلہ کہاں حل ہوا کہ ان عناصر کی ترکیب سے زندگی کیوں پیدا ہو جاتی ہے...... الحاصل کسی شی کے آغاز کا پتہ چلانا اور اس کے آخری انجام تک پہنچنا سائنس کی راہنمائی میں ناممکن ہے چند قدم چل کر اس کو اپنی نارسائی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ بالخصوص جب حواس اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں"۔[۱]

اب تو سائنس داں یہ کہنے لگے ہیں۔ کہ تمام مادے کی اصلیت ایک ہے۔ نیز وہ اس کے بھی قائل ہیں کہ عناصر ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ مثلاً کوئلہ ہیرا بن جاتا ہے اور پانی کا قطرہ موتی میں تبدیل ہو جاتا ہے عقل کا مصدر بھی توحید وجود ہے۔ اور اس کا نصب العین بھی وحدتوں کی جستجو کرتے ہوئے آخر میں ایک وحدت کلی پر پہنچنا ہے۔ اگر سائنس دان ایک قدم اور آگے بڑھائیں تو وہیں پہنچ جائیں جہاں دلی

---

[۱] الدین القیم ص۲۸ وص۳۰۔ اس موضوع پر بے حد دلچسپ اور پُر از معلومات بحث کے لئے فاضل مصنف کی محولہ کتاب اور مولانا عبد الباری پروفیسر جامعہ عثمانیہ دکن کی معرکۃ الآراء کتاب "دینیات اور عقلیات" کا مطالعہ کیا جائے۔

Marfat.com

اور صوفی کا عرفان پہنچا ہے۔ ؎

اب رہا فلسفہ تو اس کی تگ و دو البتہ عالم غیر محسوس نہیں ہے۔ بالخصوص اس کے شعبہ مابعد الطبیعیات (Metaphysics) نے عالم محسوس کے آغاز و انجام کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے۔ آئیے مختصر طور پر اس کی حد پرواز اور انکشافات کا بھی جائزہ لے لیا جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ اہم نکتہ ضرور ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ایسے فلسفی جو اللہ کے وجود، وحی الٰہی اور نبوت پر ایمان نہ رکھتے ہوں۔ قرآن پاک کی آیات کے بموجب کشف صدر اور قرب الٰہی کی نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ اور اللہ انہی کو اپنی راہ دکھاتا ہے۔ جو اس کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ یعنی جو پہلے اس کی محبت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور پھر دلسوزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (۲۹-۶۹)

(اور جن لوگوں نے مجاہدہ کیا ہماری راہ میں۔ یقیناً ہم دکھائیں گے انہیں راہ اپنی)

چنانچہ جو فلسفی اُس کی راہ پر نہیں ہیں۔ ان کے تجربات و خیالات "تخمین و ظن" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو حق کی تلاش و دریافت میں کام نہیں آتے۔

اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا (۱۰-۳۶)

("تاکید جانو کہ حق کی تلاش میں تخمین و ظن کام نہیں آتے۔)

اقبال نے بھی جا بجا اس کی خرد ماندگی سے آگاہ کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:-

انجام خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دوری

بلکہ "ضرب کلیم" میں ایک فلسفہ زدہ سید زادہ کے نام پوری نظم ہی قابلِ مطالعہ ہے۔

؎ مزید بحث کے لئے دیکھئے "حکمت رومی" از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (باب صورت و معنیٰ)

Marfat.com

بہر حال جب تخمین وظن پر رائے قائم کی جاتی ہے۔ تو اختلاف رائے بھی یقینی ہوتا ہے۔ چنانچہ فلاسفہ میں سخت اختلاف ہے۔ اور آج ان کے چار مکاتیب ہیں:۔

(۱) ثنویت (۲) تصوریت (۳) مادیت اور (۴) ارتیابیت۔

(۱) ثنویت کا اسکول روح اور مادہ کو عالم کا سرچشمہ سمجھتا ہے اور اس کے مطابق حیاتی اوصاف روح سے اور غیر حیاتی اوصاف مادہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

(۲) تصوریت کے قائل فلاسفہ حیاتی اور غیر حیاتی صفات کا سرچشمہ ایک ہی ذات یا طاقت کو مانتے ہیں۔ جسے وہ حیاتِ مطلق یا حقیقت حیات کہتے ہیں۔ اُن کے نزدیک مادہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(۳) مادیت کے قائل فلاسفہ کہتے ہیں کہ رُوح یا حیات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ جو کچھ ہے۔ مادہ ہی ہے اور حیاتی صفات بھی دراصل مادہ ہی کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔ گویا شعور، عقل، ارادہ اور زندگی سب کا سرچشمہ بے جان اور بے حس مادہ ہی کو سمجھا جاتا ہے جسے فلسفہ کے دوسرے مکاتیب اور جدید سائنس سب بے حقیقت بتاتے ہیں۔

(۴) چوتھا سکول ارتیابیت یعنے شک و شبہ کا سکول ہے۔ اس کے ماننے والے کہتے ہیں۔ کہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ عالم کا سرچشمہ روح ہے یا مادہ اس لئے وہ دونوں میں سے کسی کا نہ انکار کرتے ہیں نہ اقرار۔

ظاہر ہے۔ کہ ان مکاتیب خیال میں سے تین کو یعنے ثنویت، مادیت اور ارتیابیت کو ہم قابل التفات نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ وہ صریحاً اسلامی عقائد کے خلاف ہیں۔ البتہ تصوریت میں ایک حد تک اسلام اور اسلامی تصوف کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اس لئے اس پر ہم ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

تصوریت کے قائل فلاسفروں کے سلسلے کی آخری کڑی برگسان تھا۔ اس کے نظریے

Marfat.com

کو اس سکول کے تمام فلسفیوں کا آخری قول سمجھنا چاہیئے۔ اس لئے ہم یہاں صرف برگسان کے بعض اقوال نقل کرتے ہیں۔ وہ مادہ، حیات، عقل اور وجدان وغیرہ کے متعلق لکھتا ہے :۔

" نہ مادہ اصل وجود ہے اور نہ عقل کوئی اساسی حقیقت۔ اصل حقیقت ارتقاء پسند حیات ہے۔ جو ہمارے معنوں میں نہ مادی ہے نہ عقلی، نہ اخلاقی۔ جسے ہم عقل کہتے ہیں اس میں کوئی تخلیقی صلاحیت بھی نہیں اور وہ وجود کی عینیت کا آئینہ بھی نہیں بن سکتی۔ مادہ حیات کی ایک افسردہ، پسماندہ اور مردہ صورت ہے۔ اور جو عقل اس کے سمجھنے میں صرف کی جاتی ہے۔ وہ بھی اسی کی ہمرنگ ہو کر ہی اسے سمجھ سکتی ہے۔ جذبۂ حیات آفریدگاری ہے۔ جو نہ حواس کی گرفت میں آسکتی ہے۔ اور نہ عقل کی گرفت میں۔ طبعی سائنس اور ریاضیاتی اصول زندگی کا پوسٹ مارٹم تو کر سکتے ہیں۔ لیکن زندگی کی اصلیت اور ماہیت تک ان کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اصل چیز زندگی ہے جس کا کام نت نئی آفرینش ہے۔ وہ قواعد کی پابند نہیں۔ جب وہ کچھ پیدا کر دیتی ہے۔ تو عقل اس میں سے قواعد تلاش کرتی ہے یا اپنی سہولت کے لئے وضع کر لیتی ہے۔ یہ قواعد مادی عالم کے بچوں کو سمجھنے اور ان کے اندر اپنا عملی راستہ دریافت کرنے کے کام آتے ہیں۔ نہ پھول علم نباتات سے اُگتا ہے۔ نہ کوئی فطری شاعر عروض کی بدولت شعر کہتا ہے۔ اور نہ کوئی فطری نغمہ یا نالہ موسیقی کے ریاضیاتی اصولوں کے ماتحت پیدا ہوتا ہے۔

اس زندگی کا اصل اور گہرا احساس وجدان سے ہوتا ہے۔ عقل زندگی کے خارجی ماحصل کو ناپتی تولتی پھرتی ہے۔ اور وجدان بیک جست اس کے باطن میں پہنچ جاتا ہے"۔

اس سلسلے میں خلیفہ عبدالحکیم مرحوم تحریر فرماتے ہیں :۔

"یہاں برگسان کے نتیجۂ فکر کے ڈانڈے تصوف سے جا ملتے ہیں۔ صوفیانہ وجدانیات کئی قسم کے ہیں۔ ان میں سے ایک وجدان ہستی مطلق کی خلاقی

Marfat.com

کا ہے۔ جس کی تجلی میں تکرار نہیں ہوتی۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ط

یہ وجدان حیات مطلقہ یا ہستی حیّ و قیوم سے مسلسل حیات و کائنات کے سرزد ہونے کا وجدان[1] ہے۔ برگساں صوفی نہ تھا۔ لیکن وہ وہاں تک جا پہنچا جہاں تک عقل راہنمائی کر کے خود پیچھے ہٹ جاتی ہے..... "[2]

اور اقبال کے متعلق خلیفہ صاحب اسی مضمون میں تحریر فرماتے ہیں :۔

"اقبال، برگساں اور رومیؒ تینوں اس قدر ہم فکر، ہم ذوق اور ہم نوا ہیں۔ کہ یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہ کہاں اس کا شعر طبع زاد ہے اور کہاں ایک مرشد اور دوسرے مفکر کے زیر اثر کہا گیا ہے۔"

ممکن ہے۔ اقبال نے جزوی طور پر برگساں کا اثر قبول کیا ہو۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کا تمام فلسفۂ حیات بالخصوص نظریۂ خودی، قرآن و سنت اور مسلم حکماء و صوفیاء کرام کے نظریات سے ماخوذ ہے۔ بعض لوگوں نے جب خود ان کی زندگی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا۔ کہ اقبال مغرب کے فلاسفروں کے خیالات ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں تو انہوں نے اس خیال کی تردید کی تھی۔ چنانچہ اپنی ایک نظم میں حضور سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وسلم سے ان الفاظ میں فریاد کرتے ہیں :۔

محفل از شمع نوا افروختم　　　قوم را رمز حیات آموختم

---

[1] معلوم نہیں خلیفہ صاحب کی کیا مراد ہے کیونکہ یہ امور صوفیانہ وجدان سے نہیں بلکہ بعض آیات قرآنی اور چند احادیث سے معلوم ہوتے ہیں مشہور حدیث قدسی ہے کنت کنزاً مخفیا فاحببت ان اعراف فخلقت الخلق (یا فخلقتک یا محمد) دیگر احادیث انا من نور اللہ والخلق من نوری اور لولاک لما خلقت الافلاک۔ کن فیکون کی تفسیر جو علمائے تصوف نے پیش کی ہے۔ ہستی مطلق کی شان خلاقی کو بیان کرتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ جب خدا کے سوا کوئی دوسری چیز موجود ہی نہ تھی تو کن کا خطاب کس سے کیا گیا اور "مخلوق" کیا چیز ہوتی وغیرہ وغیرہ

[2] مضمون خلیفہ عبدالحکیم (اقبال کی شاعری میں عشق کا مفہوم) مطبوعہ رسالہ اقبال۔ لاہور جلد ا شمارہ ۲

Marfat.com

داستانے گفتم از یاران نجد
نکہتے آوردم از بستان نجد
گفت بر ما بند د افسون فرنگ
ہست غوغائش ز قانون فرنگ
ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را
اینکہ نشناسد متاع خویش را
گر دلم آئینہ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
خشک گرداں بادہ در انگورِ من
زہر ریز اندر مئے کافورِ من
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

علاوہ بریں پچاسوں اشعار میں اقبال عارف رُومی کو اپنا مرشد معنوی تسلیم کرتے اور دیگر اکابر صوفیہ کا نام لے لے کر ان کا فقر و تصوف ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ لیکن برگسان اور ہیگل کے فلسفوں کا "زناری" بننے سے ہمیں روکتے ہیں۔ مثلاً

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناری برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی
انجامِ خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفہ زندگی سے دُوری

Marfat.com

(ایک فلسفہ زدہ سیّد زادہ کے نام ...... (ضرب کلیم)

حکیمی نامسلمانی خودی کی

کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی (بال جبریل)

ان حالات میں یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ اقبال رُومیؒ اور برگسان دونوں کے یکساں طور پر ہم فکر، ہم ذوق اور ہم نوا ہوں۔ تاوقتیکہ برگسان کے فلسفہ کو وہ "دین" نہ سمجھ لیا جائے جسے اقبال مذکورہ بالا نظم میں ؎

"دین مسلک زندگی کی تقویم
دین سرّ محمدؐ و براہیم

دل در سخن محمدیؐ بند
اے پور علیؓ ز بوعلی چند"

فرماتے ہیں۔

جو اقبال ایک سید زادہ کے لئے یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ بوعلی سینا کے فلسفہ میں الجھا رہے۔ نہ برگسان کے "ہم فکر، ہم ذوق اور ہم نوا" کس طرح ہو سکتے ہیں خود خلیفہ صاحب نے اس اقتباس میں جسے میں آخر میں نقل کروں گا اپنے اس خیال کی تردید کی ہے

مغرب کے حکماء نے مادہ، عقل، نفس، حیات، وجود وغیرہ سب کے بخیئے ادھیڑنے میں عمریں صرف کر دیں۔ اور اپنے اپنے خیالات دنیا کے سامنے پیش کئے لیکن بالآخر وہ بھی صوفیاء کرام کی طرح اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عقل استدلالی محدود اور بے بس ہے۔ اس کی تگ و دَو ظواہر اور اُن کے روابط تک محدود ہے۔ حقیقت تک اس کی رسائی ناممکن ہے[1]

---

[1] مزید تفصیل کے لئے اقبال کے پہلے لیکچر کا اردو ترجمہ دیکھئے جو "علم اور عرفان" کے عنوان سے رسالہ اقبال لاہور (جلد ۳ شمارہ ۴) میں شائع ہو چکا ہے۔

حکماء نے جو اقسام عقل کی بتائی ہیں۔ ان میں عقل حسّی، یا طبعی، یا منطقی اور عقل اخلاقی یا روحانی یا وجدانی خاص ہیں۔ لیکن عارف رومیؒ اُسے جمادی، نباتی، حیوانی، اور انسانی میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ سب سے اوپر عقل نبوی ہوتی ہے۔ اس کا تعلق وحی۔ الہام اور کشف صدر سے ہے۔ یہ عقل انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کو فیضانِ قدس سے بحدِ وافر اور ان کی پیروی کرنے والوں کو بقدرِ استعداد عطا ہوتی ہے۔ اسی کو بصیرت یا فراستِ مومن کہا گیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے۔ جو بطون وجود یا اصل حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی صحیح راہنمائی کرتی ہے۔

آخر میں اہل فلسفہ اور فلسفہ پسند حضرات کی راہنمائی کے لئے ایک اقتباس "حکمتِ رومی" سے پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم برگساں اور عارفِ رومیؒ کے عرفان کا موازنہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"انبیاء اور اولیاء کا شعور انسان کی منزل ارتقاء کی نشاندہی کرتا ہے جس کی طرف انسان کو قدم اٹھانا اور ایک نئے عالم اور نئے علم سے فیضیاب ہونا ہے۔ اگر ان تجربات کی صحت کو تسلیم کیا جائے تو تکریم انسان اور خلافت آدم کے معنے سمجھ میں آتے ہیں۔ مادی اور حسّی سائنس اور ڈارون یا برگساں کے انداز کا نظریۂ ارتقاء یا نٹشے کا فوق الانسان سب اندھیرے میں ٹامک ٹوئیے مارنے کے مترادف ہے۔ ان سب کو احساس ہوا۔ کہ انسان ارتقاء سے یہاں تک پہنچا ہے۔ اور اُسے اور آگے بڑھنا چاہیئے لیکن وہ حقیقت میں کدھر سے آرہا ہے اور کدھر کو جا رہا ہے اور آگے کی منزل کی کیفیت کیا ہے۔ وہ اسی تشریح اور تجربۂ حیات سے معلوم ہو سکتی ہے جو عارف رومیؒ کے ہاں ملتا ہے۔ اور جسے آدم کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم سے اخذ کر سکتے ہیں۔" ۱؎ (حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ ہو)

Marfat.com

یہ "تشریح" اور "تجربۂ حیات" تنہا عارفِ رومیؒ کے ہاں نہیں بلکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر عارف رومیؒ تک بلکہ ان کے بعد بھی تمام اولیاء کرامؒ کے ہاں ملتا ہے۔ کیونکہ ان سب کی ہدایت کا سرچشمہ قرآن کریم صاحب قرآن صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تھی خلیفہ صاحب بھی بحیثیت مسلم یقیناً اسی کے قائل ہوں گے۔ موصوف نے صرف عارف رومیؒ کا ذکر کتاب "حکمتِ رومی" کی رعایت سے کیا ہے۔

بقیہ حاشیہ صـ ۳۹۶ : حکمتِ رومی۔ از ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم مرحوم صـ ۱۶۴

Marfat.com

(۱۴)

لامحدودیت

کی جانب

محدود کا سفر

Marfat.com

۷۸۶

اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ

(۸۴-۶)

(اپنے رب کی ملاقات کے لئے خوب محنت کر۔ پس ملنا ہے تجھے اس سے۔)

صورت از بے صورتی آمد بروں
باز شد کانا الیہ راجعون

چوں ز دانش موج اندیشہ بتاخت
از سخن آواز او صورت بساخت

از سخن صورت بزاد و باز مُرد
موج خود را باز اندر بحر بُرد

(رومی رح)

Marfat.com

"لامحدودیت" کی جانب "محدود" کا سفر

کائنات کا کوئی ذرہ ایک لمحہ کے لئے بھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا۔ ہر چیز جسے "چیز" کہا جا سکتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق کائنات کے کسی بھی طبقے یا مرحلے سے ہو۔ اس سے بہتر طبقے یا مرحلے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ حقیقتاً یہی اس چیز کی "حیات" ہے جب ادنیٰ طبقے یا مرحلے سے گزر کر وہ چیز نسبتاً اعلیٰ طبقہ یا مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے تو طبقۂ ماقبل یا مرحلۂ ماقبل کے لحاظ سے اس چیز کی "موت" واقع ہو جاتی ہے اور جدید طبقے۔ مرحلے میں اس کی "پیدائش" ہوتی ہے اس لحاظ سے "موت و حیات" کے بارے میں عام تخیل حقیقی مفہوم سے مختلف ہے۔ عمیق نگاہ رکھنے والے حقیقی مفہوم پر نظر رکھتے ہیں۔ لیکن ظاہر بین ظاہری حالت کو دیکھا کرتے ہیں۔ اسی طرح "زمان و مکان" کا مفہوم عوام کی نظر میں کچھ اور ہے لیکن خواص کی نظر میں کچھ اور۔

یہی حال مادّے کا ہے۔ عوام کی نظر میں وہ محض "مادّہ" ہے۔ اہل سائنس کی نظر میں ہر ذرہ حقیقتاً ایک جوہر بلکہ جوہری توانائی کا پیکر ہے۔ اہل فلسفہ کی نظر میں وہ روح ہی کی ایک صورت ہے۔ اور اہل باطن ہر ذرے کو اسماء و صفات باری تعالیٰ کا مظہر سمجھتے ہیں۔

یہ خالق کائنات کی مرضی ہے کہ اس نے ہر ذرۂ کائنات کو مختلف نگاہوں میں مختلف حیثیت دے رکھی ہے۔ حکماء کے خیال کے مطابق مادّے کا ہر ذرہ اسفل سے اعلیٰ کی طرف بڑھنے کے لئے ہر وقت مضطرب رہتا ہے۔ اس جد و جہد میں کہیں کہیں کوئی "چیز" برباد ہوتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقتاً وہ برباد نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اپنی "بربادی" کے پردے میں ایک "خوب تر پیکر" کی صورت اختیار کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس طرح خود قدرت اسے "وجود نو" عطا کرتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ ایک دن اعلیٰ ترین منزل پر پہنچ جاتی ہے۔ یہی منزل اس کی "اصل" ہے۔

مذہب کی زبان میں وہ اصل اصول جو کائنات میں بحکم ربّی کار فرما ہے۔ یہی ہے کہ ہر چیز اپنی "اصل" کی طرف رجوع کرتی ہے۔ بعض نگاہیں اس "رجوع الی الاصل" کو بالکل نہیں دیکھ سکتیں۔ لیکن بعض اُسے دیکھتی اور سمجھتی ہیں۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتا۔ وہ بھی ہر لحظہ اپنی موجودہ منزل سے اعلیٰ منزل کی طرف سفر کرنے پر مجبور ہے۔ لیکن اس "اعلیٰ منزل" کے سمجھنے اور اسے متعین کرنے میں وہ شخص غلطی کرتا ہے جو اپنی عقل کے مطابق اسے متعین کرتا ہے۔ وہ بھٹک جاتا ہے۔ اور جو اللہ کی مرضی کے مطابق اسے متعین کرتا ہے۔ وہی سیدھی راہ پر چلتا اور یقیناً منزل مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے جو انسان کا خالق اور اس کا رب ہے، اپنے انبیاء و اولیاء کے ذریعہ انسان کی ہدایت کا سامان مکمل کر دیا ہے۔ جو اِن کے مطابق عمل کرتے ہیں وہ جلد فائز المرام ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو ان کی ہدایت کے خلاف کرتے ہیں اور اپنے نفس باطن کے پیچھے چلتے ہیں۔ وہ منزل سے دور ہی رہتے ہیں۔

اس جد وجہد کو کسی نے "ارتقا" کہا ہے۔ کوئی "سلوک" کہتا ہے۔ کوئی راہ "عشق و محبت" کوئی "تسخیر کائنات" کوئی "وصول الی اللہ" کوئی "فنا در بقا" کوئی "بقا در فنا" کوئی کچھ اور کوئی کچھ کہتا ہے۔ ہر ایک نے اپنے علم و عرفان کے مطابق اس "راہ" کی "منزلیں" اور "سفر کے طریقے" بھی مقرر کر دئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ اس "سفر" میں انبیاء و اولیاء حق کی راہنمائی ہی صحیح اور موجب تسکینِ قلب ہے۔ انسان جو اشرف المخلوقات ہے۔ اسے اس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اس کی "اصل" کیا ہے۔ اس پر لازم ہے کہ وہ "مادّہ" اور "زمان و مکان" کی حقیقت کو سمجھے۔ اس کے بعد اس پر خود اپنی حقیقت واضح ہو جائے گی۔ اور وہ اس بات کو بآسانی سمجھ لے گا۔ کہ "محدود" ہونے کے باوجود "لامحدود" کی طرف اس کے بڑھنے کا کیا مطلب ہے۔ مگر یہ ایک نازک مسئلہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے۔

کردہ اس "راہ" میں کسی "دانائے راز" کو اپنا راہبر بنا لے اور اس کی اطاعت کرے۔ ورنہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھانے کا احتمال ہے۔

دنیا کی اکثر اقوام نے صحیح منزل اور سیدھے راستہ کے تعین میں ٹھوکریں کھائیں اور غلطیاں کی ہیں۔ اسلام اور اسلامی تصوف کا کام انہی غلطیوں کی اصلاح ہے۔ تصوف اسلام اور اکابر صوفیہ کی مدد کے بغیر نہ انسان کو عرفان نفس حاصل ہو سکتا ہے۔ نہ اس کی خودی "لازمانی و لامکانی" ہو سکتی ہے۔

آدم کو ثبات کی طلب ہے
دستور حیات کی طلب ہے
محکم کیسے ہو زندگانی
کس طرح خودی ہو لازمانی

ان باتوں کا جواب قرآنی یا اسلامی تصوف ہی دے سکتا ہے۔

یہ مختصر وضاحت تو حیاتِ انسانی کے اس پہلو کی ہے جو "خدا کے ساتھ انسانی تعلق" کو پیش کرتا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ انسان کی وہ حیثیت بھی ہے۔ جو اُسے سوسائٹی سے متعلق رکھتی ہے۔ سوسائٹی کے ساتھ رہتے ہوئے اسے اپنی "زندگی گزارنی" ہے۔ کیونکہ اس کے خالق کا حکم یہی ہے۔ اور "زندگی گزارنے کا" طریقہ بھی اسی خالق نے مقرر کیا ہے۔ اس نے "رہبانیت" اور "خودکشی" کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اس نے سوسائٹی کے ہر طبقہ کے ساتھ انسانی حقوق کی وضاحت کر دی ہے۔ گویا ہماری "اصل" نے جس کی جانب ہم کھچے چلے جا رہے ہیں۔ خود ہی ایسے قواعد و ضوابط مقرر کر دئے ہیں جن کی پابندی اس "کشش محبت" اور "سفر عشق" میں لازمی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے گویا ہم ایک چلتی ٹرین میں بیٹھے ہیں۔ اور اس طرح "مقیم" بھی ہیں "مسافر" بھی۔ ہماری دنیا ڈبے کے اندر دنیٰ حالات کے لحاظ سے محدود ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ ہمارا تعلق

Marfat.com

باہر کی وسیع دنیا سے بھی کچھ نہ کچھ قائم ہے۔ لیکن اس کی نوعیت ایسی ہے کہ باہر کی دنیا سے ہم متعلق ہوتے ہوئے بھی غیر متعلق ہی ہیں۔ اسی طرح ڈبے کے اندر دیگر مسافروں اور ڈبے کی ہر چیز سے ہمارے تعلقات ہیں بھی اور نہیں بھی ہیں۔ جب تک ہم اس ریل میں سفر کر رہے ہیں۔ محکمۂ ریل کے مقرر کردہ ہر قاعدے کی پابندی ضروری ہے۔ قواعد کی خلاف ورزی کرنے یا ریل کو درمیان میں چھوڑنے اور درمیانی اسٹیشنوں کی دلفریبیوں میں الجھ کر رہ جانے سے ہم یقیناً ان مسافروں کے ساتھ یا ان کی طرح منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ جنہوں نے اپنا سفر مقررہ قواعد کیمطابق طے کیا ہو۔

کچھ یہی صورت "منزل اصلی" کی جانب "انسانی سفر" کی ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ پہلے وہ اپنی "صحیح منزل" کو پہچانے پھر اس کی طرف "بہ پابندی قواعد" چلے۔

اہل اللہ نے اسی اصول پر عمل کیا ہے۔ ان کی "منزل اصلی" خود حق جلّ و علا ہے۔ ان کے نزدیک "منزل اصلی" کا نام "ولایت" اور منزل کی طرف چلنے کا نام "سلوک و تصوف" ہے۔ "مقربین خاص" کے بتلائے ہوئے طریقے ان کی راہبری کرتے ہیں۔ فضل ربّی ان کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ اس دنیا سے متعلق رہتے ہوئے بھی اس سے غیر متعلق رہتے ہیں۔ ان کا ظاہر ظاہر کے ساتھ اور ان کا باطن باطن کے ساتھ پیوستہ رہتا ہے وہ دنیا کی ہر چیز سے جائز طور پر جائز حد کے اندر متمتع ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی اصلی اور آخری منزل کی طرف ہر وقت بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور کسی درمیانی مقام کی دلفریبیوں میں الجھ کر رہ جانا پسند نہیں کرتے۔

ریل کے مسافروں کی طرح ان کی زندگی کا ظاہری سکون بھی حقیقتاً حرکت ہی حرکت ہے۔ ذرا گہری نظر سے دیکھیں تو یہاں "مادے" "حرکت" اور "سکون" کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ یہ تمام باتیں اضافی اور اعتباری ہیں۔ اصل حقیقت جو ہے وہ ہے۔

ان باتوں کو جو شخص جس نظر سے دیکھے گا۔ اسے وہ دیسی ہی معلوم ہوں گی۔
خلاصۂ تحریر یہ ہے کہ جب "مادہ"۔ "زندگی و موت"۔ "حرکت و سکون"۔ "زمان و مکان" وغیرہ وغیرہ الفاظ کا مفہوم عوام کی نظر میں کچھ اور ہوتا ہے اور خواص کی نظر میں کچھ اور تو صوفیائے کرام کے نقطۂ نظر کو وہ لوگ کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ جو خود تصوف و سلوک سے بے بہرہ ہوں۔ یا جن کی زندگی کا نصب العین صوفیاء کرام کے نصب العین سے مختلف ہو تصوف اور اہل تصوف پر اکثر اعتراضات اسی غلط مبحث کا نتیجہ ہیں کہ معترضین اصطلاحات تصوف کو صوفیاء کرام رض کے مفہوم کے مطابق نہیں بلکہ خود اپنی عقل یا دیگر غیر متعلق اشخاص کے سمجھے ہوئے مفہوم کے مطابق سمجھ لیا کرتے ہیں۔
"محدود" کو چاہیئے کہ "لا محدودیت" کی جانب "سفر" کے اسرار و رموز کو انہی نفوس قدسیہ سے سمجھے جو اس کا عملی تجربہ رکھتے ہیں۔ اور بفضلِ ایزدی "منزل رسی" کی نعمت سے بہرہ مند ہیں۔

به مئے سجاده رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
که سالک بے خبر نبود ز راه و رسم منزلها

Marfat.com

(۱۵)

حیاتِ اجتماعی
کے
بعض اہم پہلو

Marfat.com

۷۸۶

لَا تَہِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ط (۳-۱۳۹)

خوف نہ کھاؤ۔ غم نہ کرو۔ تم ہی غالب رہو گے۔ اگر تم مومن رہے۔

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب

(اقبالؔ)

حیاتِ اجتماعی کے بعض اہم پہلو

مسلمانوں کی حیات اجتماعی کے متعلق اقبال کا نظریہ وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتا رہا ہے۔ ان کی فکر و نظر نے مختلف سیاسی حالات، حکمائے مشرق و مغرب کے نظریات، علمائے شریعت و طریقت کے خیالات غرض کہ سب کے اثرات قبول کئے اور ان کے تحت نشو و نما پائی۔ اسی لئے ان کے سیاسی افکار کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جس سے ان کے تصورات میں عہد بہ عہد کی تبدیلیاں واضح ہو جاتی ہیں لیکن ایک چیز ہر دور میں مشترک نظر آتی ہے اور وہ ہے "معراج انسانیت" کا تصور جسے انہوں نے اپنی تحریروں، تقریروں اور اشعار میں مختلف طور پر بیان کیا ہے۔

اس سلسلے میں بھی اقبال کے بنیادی خیالات صوفیائے کرام کے نظریات سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً

حضرات صوفیہ رح کی طرح اقبال بھی اس بات کے قائل ہیں کہ جغرافیائی وطن انسان کا اصل وطن نہیں۔ بلکہ تمام روئے زمین اصل وطن ہے۔ جس کا اجتماعی پیمانہ عشق الٰہی اور توحید پرستی ہے۔ ہجرت نبوی صلے اللہ علیہ وسلم کی تعبیر انہوں نے یہی کی ہے۔

عقدۂ قومیّت مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود
زبخششہائے آں سلطان دیں
مسجد ما شد ہر روئے زمیں
ہجرت آئین حیات مسلم است
ایں ز اسباب ثبات مسلم است

صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو
یعنے از قید مقام آزاد شو

Marfat.com

ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد
چُوں فلک در شش جہت آباد شد

جہاں تک کسی شخص کی پیدائش اور بود و باش کا تعلق ہے۔ وہ کسی نہ کسی ملک سے ضرور وابستہ رہتا ہے۔ اور اس لحاظ سے وہ اس قطعۂ ارض سے محبت بھی کرتا ہے اس کی یہ محبت فطری ہوتی ہے۔ لیکن جب وطن کا یہ تصور سیاسی بن جاتا ہے۔ تو دوسری اقوام سے متصادم ہونا اور اللہ کی زمین میں فساد و خونریزی کا باعث بنتا ہے لہذا وطن کے سیاسی تصور کو غلط کہا جاتا ہے۔ اور اس کے مقابلے میں "انسانیت" کو اصل وطن کہا جاتا ہے۔ تاکہ اقوام عالم اس تصور کو اختیار کر کے "احترام انسانیت" کو پیش نظر رکھیں اور کسی قطعۂ ارض یا سیاسی تصور کی خاطر جنگ و جدال نہ کریں۔

"وطن" کے سیاسی تصور اور ملت یا انسانیت کے "اسلامی تصور" کے فرق کی بابت اقبال مولانا حسین احمد مدنیؒ کو ان کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں :-

"زمانۂ حال کے لٹریچر میں "وطن" کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ "وطن" ایک اصول ہے۔ ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ کا۔ اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے۔ چونکہ اسلام بھی "ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ" کا ایک قانون ہے۔ اس لئے جب لفظ "وطن" کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔" [۱]

حضرات صوفیہؒ اس کے قائل ہیں کہ تمام عالم بشریت کو توحید کی اساس پر متحد کرنا ہی اصل دین ہے۔ اسی لئے وہ تمام انسانوں کو اللہ کی مخلوق اور ایک ہی کنبہ کے افراد سمجھتے ہیں۔ اسی لحاظ سے وہ سب سے محبت کرتے۔ اور محبت و شفقت کی راہ سے سب کو اپنے دین کی طرف آنے کی عملی دعوت دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں فقراء

---

[۱] جغرافیائی حدود اور مسلمان۔ مضامین اقبال مطبوعہ حیدر آباد دکن۔

Marfat.com

اسلام کی بدولت جس قدر اسلام کی اشاعت ہوئی۔ اتنی صحیح معنے میں کسی دیگر ذریعہ سے نہیں ہوئی۔

ان معنے میں ان کے نزدیک "دین اللہ" نہ قومی ہے۔ نہ نسلی بلکہ خالص انسانی ہے اور تمام مقامی، وطنی، قومی۔ اور نسلی امتیازات کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی پہلو اسلام کا حسن و جمال ہے۔ اسی کا دوسرا نام تصوف یا فقر و درویشی ہے۔ یہ انسانیت نواز اصولوں کا مجموعہ اپنی بے پناہ وسعتوں کی وجہ سے "بین المملکتی یا بین الاقوامی اسلامی برادری" (ملت اسلامیہ) کے حدود سے بھی آگے بڑھنے اور کفر پرستوں کو بھی ایک حد تک اپنی آغوش شفقت میں لینے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ صوفیائے کرام اور فقرائے اسلام کافر کو بھی محبت و شفقت کے ساتھ حق کی طرف بلاتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو تبلیغ دین کی ضرورت بھی وہیں ہے جہاں کفر ہو۔

علامہ اقبال کے ذہنی ارتقاء کا جائزہ لینے والے کہتے ہیں۔ کہ جغرافیائی وطن (ہندوستان) سے محبت کرنے والے اقبال رفتہ رفتہ اسلامی بین الاقوامیت اور اس کے بعد فقر و قلندری کے علم بردار بن گئے۔ اس کی وجہ محض یہ تھی۔ کہ وہ نظریات اولیائے کرامؒ کے غائر مطالعے کے بعد وطن اور مذہب کو قومی، ملی یا نسلی ڈھانچہ سمجھنے کے بجائے انسانی سمجھنے لگے تھے۔ اب "ملت اسلامیہ" کی حیثیت ان کی نظر میں ایک اجتماعی وحدت کے مترادف تھی۔ چنانچہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمتہ اللہ علیہ کو اسی خط میں لکھا:۔

> کیا خدا کی بارگاہ سے "امت مسلمہ" کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی تھی۔ کہ آپ کی ہیئت اجتماعی کا کوئی حصہ عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا ہے۔ "امت مسلمہ" کے مقابل تو صرف ایک ہی ملت ہے۔ اور وہ اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ کی ہے [1]

---

[1] جغرافیائی حدود اور مسلمان۔

Marfat.com

اس سلسلے میں پروفیسر عزیز احمد لکھتے ہیں :-

"اقبال نے اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ" کی طرف جو اشارہ کیا ہے۔ اس کو اگر سرسری طور پر پڑھا جائے۔ تو بڑی سخت غلط فہمی کا امکان ہے۔ میرے خیال میں یہ استدلال اقبال نے محض ایک تنگ نظر مولوی کو قائل کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ جو معقول کے مقابلے میں منقول سے زیادہ آسانی سے قائل ہو سکتا ہے۔

ملتِ کفر اور ملتِ اسلام دونوں اجتماع انسانی میں جذب ہو سکتی ہیں٭ اور اقبال نے اس مشہور و معروف خط میں جو نکلسن کے نام ہے۔ اس کی تشریح کی ہے ......"

"یہ کہ 'مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا' اور 'ہر ملک ملکِ ماست کہ ملک خدائے ماست' کے معنے تمام دنیا کو ہی وطن سمجھنے کے ہیں۔ یعنے "وطن" کی تفریق کو سرے سے مٹا دینے کے ہیں۔ اسلامی ریاستیں قائم کرنے کے ہیں"۔ ؎۱

عسکری قوت اور اسلامی نظام اقتصادی کے متعلق علامہ اقبال کا نقطۂ نظر محولۂ بالا خط میں یہ بھی ہے۔

"اسلام کو جہاں ستانی اور کشور کشائی میں جو کامیابی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک وہ اس کے مقاصد کے حق میں بے حد مضر تھی۔ اس طرح وہ اقتصادی اصول نشو و نما نہ پا سکے۔ جن کا ذکر قرآن کریم اور احادیث نبوئی میں جابجا آیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی۔ لیکن ساتھ ہی ان کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا۔ اور انھوں نے اس

؎۱ اقبال نئی تشکیل، مصنفہ پروفیسر عزیز احمد۔ صفحہ ۶۷

٭ یہ نظریہ اسلامی تصوف کا ہی کا ہے

Marfat.com

حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں کہ اسلامی اصولوں کی گیرائی کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔ ؎

بانگ درا کے اس شعر میں اسی خیال کی طرف اشارہ ہے :۔

ہو چکا گو قوم کی شان جلالی کا ظہور

ہے مگر باقی ابھی شان جمالی کا ظہور

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال اس تمدن اور اس اقتصادی نظام کو دراصل "اسلامی" نہیں سمجھتے۔ جس کا علم ہمیں اسلامی فتوحات کی بعد کی تاریخ سے ہوتا ہے۔ کیونکہ فتوحاتِ ملکی کے ساتھ اسلامی تمدن اور وہ اقتصادی نظام قائم نہ ہو سکا۔ جو اسلام کا نصب العین ہے۔ ان کی رائے میں اسلامی اجتماعی زندگی کا خاص الخاص عنصر عسکری قوت نہیں۔ نہ فتوحات ملکی ہیں۔ بلکہ مخصوص اسلامی تمدن ہے۔ وہ ایک طرح کی اسلامی اشتراکیت یا اسلامی بین الاقوامیت کے قائل ہیں جس کی بنیاد روحانی و اخلاقی اوصاف پر قائم ہو۔ اور یہ اوصاف وہی ہوں جن کی تعلیم قرآن پاک اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے دی ہے۔

اقبال مارکس کے معاشی تجزئے اور اس کی معاشی تاویلات کے قائل تھے۔ مگر مادی جدلیات اور تاریخ کی معاشی تطبیق سے انہیں اختلاف تھا۔ اسی لئے وہ نٹشے کی طرح مارکس کے متعلق بھی "قلب او مومن دماغش کافر است" فرماتے ہیں۔

نٹشے کی کافری یہ تھی کہ "وہ اپنی جزئیت کو اصول خیر کا پابند نہ بنا سکا۔ اور ابدی تکرار" و "فوق البشر" کے تصورات میں الجھ کر رہ گیا۔" اسی طرح کارل مارکس نے انسان کی خارجی زندگی میں مساوات و انصاف کے سامان تو پیدا کئے۔ لیکن وہ انسان کے باطن اور وجدانیات کا منکر ہو گیا۔ وہ خودی کے تصور کا بھی قائل نہیں۔ جاوید نامہ میں اقبال نے کارل مارکس کی تعریف و تنقیص یوں کی ہے :۔

؎ اقبال نئی تشکیل ص ۹۸ بحوالہ اقبال نامہ ص ۱۷۲

Marfat.com

صاحب سرمایہ از نسلِ خلیل
یعنے آں پیغمبرے بے جبرئیل
زانکہ حق در باطل او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است

اور المیرمن کے ایک شیر کی زبانی اس کی تعریف یوں کی ہے :۔

آں کلیم بے تجلی آں مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب

روسی اشتمالیت اور اقبال کی اسلامی اشتراکیت میں صرف دہریت کا فرق ہے۔ ورنہ جہاں تک انسانی اجتماعی زندگی کے خارجی اوصاف کا تعلق ہے۔ وہ روسی اشتمالیت میں بہت کچھ پاتے ہیں۔ اور مغرب کے مہاجنی نظام معاشرت سے اسے کہیں بہتر سمجھتے ہیں۔ بہر حالی معاشی نظام کا نام خواہ کچھ ہو۔ اس کا تعلق کسی بھی ملک سے ہو۔ اصل عنصر اس کی "اسلامیت" ہے۔ "اسلامی" کہنے سے ہماری مراد یہ ہے۔ کہ وہ نظام فی نفسہٖ مقصود اصلی نہ ہو۔ بلکہ خدا اور رسول کی خوشنودی کے حصول کا ذریعہ اور انسانی اخوت و مساوات کا ضامن ہو۔ اخوت کا تعلق اخلاقیات سے اور مساوات کا اخلاقیات و معاشیات دونوں سے ہے۔ اسلامی اخوت و مساوات جغرافیائی حدود وطن کو تسلیم نہیں کرتی۔ اسلام موجودہ تصور وطنیت کے خلاف ہے۔ کیونکہ اس میں انسان سے بحیثیت انسان نہیں بلکہ ایک خاص ملک میں رہنے کی وجہ سے محبت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اور وہ بھی بعض تنگ نظر اقوام و ممالک میں صرف ان افراد سے جو مذہبی عقائد اور دیگر امور میں بااقتدار جماعت کے ہم خیال ہوں۔ مختلف عقائد یا خیالات رکھنے والوں سے "برادران وطن" ہونے کے باوجود نفرت کی جاتی ہے۔ ہندوستان کے فرقہ پرست ہندو آج کل اپنے مسلم "برادران وطن" کو اسی بناء پر اپنا دشمن سمجھتے اور ان کے ساتھ "انسانیت سوز" سلوک کر رہے ہیں۔

Marfat.com

آبائی وطن سے محبت کرنا انسان کی فطرت میں ضرور داخل ہے۔ اور اس حد تک اسلام ہرگز اس کا مخالف نہیں۔ لیکن اس محبت کو دیگر ممالک کے باشندوں یا مختلف مذہبی عقائد رکھنے والوں سے نفرت و عداوت کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ اسلامی اخوت و مساوات اسی قسم کی نفرت و عداوت کی جڑ کاٹتی ہے۔ جس تمدن میں مذکورۂ بالا تنگ نظری کے بجائے انسانی اخوت و مساوات کا رنگ غالب ہو۔ اسی کو اسلامی کہا جائے گا۔[1]

اس "اسلامی اخوت" کی حفاظت و تبلیغ کے لئے قوت کی ضرورت ہے۔ تاکہ اگر ملک کے مسلم باشندے بھی اس راہ سے ہٹ گئے ہوں یا ہٹ رہے ہوں۔ تو انہیں بھی قوت کے ذریعہ اسلامی اخوت و مساوات پر عمل پیرا ہونے کے لئے مجبور کیا جا سکے۔ "قوت" میں فرد کی ایمانی، اخلاقی اور روحانی قوت سے لے کر جماعت کی منظم عسکری قوت تک داخل ہے

اہل حق را زندگی از قوت است
قوت ہر ملت از جمعیت است
رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں
قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

امتناں را در جہانِ بے ثبات
نیست ممکن جز بہ کرّاری حیات

مدافعت کے لئے بھی قوت ضروری ہے (ورنہ ملت کا وجود ہی خطرے میں پڑ سکتا

---

[1] مثال کے طور پر ہم پاکستانی تمدن کو پیش کر سکتے ہیں جس میں تمام اقلیتوں کے جان و مال عزت و آبرو اور جملہ حقوق کی حفاظت خود اکثریتی فرقہ (مسلمان) اور اس کی حکومت کر رہی ہے دس سال کے اندر یہاں ایک بھی فرقہ وارانہ فساد یا بلوہ نہیں ہوا۔ جب کہ ہندوستان میں تقریباً ایک ہزار ایسے بلوے ہو چکے ہیں۔

ہے) اور اسلامی اصولوں کی حفاظت و اشاعت اور ان پر عملدرآمد کرنے کے لئے بھی قوت کی ضرورت ہے۔لیکن اسلامی نقطۂ نظر یہ ہے۔کہ ظاہری مادی ذرائع سے زیادہ ہمیں اپنی اخلاقی، ایمانی اور روحانی قوتوں کو مضبوط بنانا چاہیئے۔خود اقبال بھی اس کے قائل ہیں جیسا کہ ان کے متعدد اشعار سے ثابت ہوتا ہے۔یہ صورت اپنی موت و زندگی کو محض اللہ کے لئے وقف کردینے سے پیدا ہوتی ہے۔تاریخ شاہد ہے کہ اللہ کے صادق دوستوں یعنے انبیاء کرامؑ اور اولیاء عظامؒ نے بے سروسامانی کے باوجود بڑی بڑی طاقتوں اور سلطنتوں کا تختہ الٹ دیا ہے۔اور بسا اوقات نام نہاد "مسلمانوں" کی اجتماعی و عسکری قوتیں بھی وہ کام نہ کرسکیں۔جو روحانی و اخلاقی طاقت رکھنے والے افراد نے انجام دیا ہے۔زبردست فوجی طاقت رکھنے والی غیر مسلم اقوام بھی اس امر کی معترف ہیں کہ فوجی طاقت سپاہیوں کے عزم و استقلال، جرأت و ہمت اور دیگر اوصاف ذہنی و قلبی کے بغیر بیکار ہوکر رہ جاتی ہے

بہرحال جیسا کہ پہلے مذکور ہوچکا ہے۔اقبال عسکری قوت کو فتوحات ملکی کے لئے نہیں بلکہ مخصوص اسلامی تمدن کی حفاظت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔اور اسی کو وہ "جلال" کہتے ہیں۔

ان کے نزدیک اسلامی تمدن بھی وسیع المعنیٰ ہے۔یہ محض کھانے پینے اور رہنے سہنے کا طریقہ نہیں۔جیسا کہ بعض اشخاص کا خیال ہے۔بلکہ اس کے علاوہ ایسی تمام ایمانی، اخلاقی، روحانی اور قومی و ملّی قدریں بھی اس میں شامل ہیں۔جنہیں اسلام فلاح انسانیت کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔اسلامی تمدن کو اقبال "جمال" سے تعبیر کرتے ہیں۔ان کے فلسفۂ حیات میں ملتِ اسلامیہ کے عروج کے لئے "جمال" و "جلال" دونوں ضروری ہیں۔

لیکن زندگی کے ان زریں اصولوں پر پوری طرح عمل درآمد جبر کے ذریعہ نہیں کرایا جاسکتا۔نہ دنیاوی لالچ ہی سے کام چل سکتا ہے۔اس کی ایک ہی صورت ہے۔اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کے دلوں میں اللہ کا عشق پیدا کیا جائے۔کیونکہ جب تک دل عشق الٰہی سے معمور نہ ہوں گے۔زندگی میں نہ للّٰہیت پیدا ہوسکتی ہے اور نہ وہ ایمانی قوت جو قرونِ

Marfat.com

اولیٰ کے مسلمانوں میں موجود تھی۔

تاریخ شاہد ہے۔ کہ اس پیغام بلکہ جدوجہد کے علم بردار ہمیشہ فقرائے اسلام، صوفیائے کرام اور دیگر صلحائے امت ہی رہے ہیں۔ اور آج بھی یہی حضرات ہیں۔ انہوں نے اللہ کی محبت میں زندہ رہنے کے سچے نمونے نہ صرف اپنی زندگیوں سے پیش کئے بلکہ تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کے لئے بہترین تربیتی مراکز قایم کر کے اپنے معتقدین کی اصلاح میں ہمیشہ مصروف رہے اور آج بھی ہیں۔ کیا ان کی اس جدوجہد کے سامنے دنیا پرستوں کا "ہر عمل" ہیچ نظر نہیں آتا۔ اللہ والوں کی بنیادی خدمت کا اعتراف نہ کرنا اور ان کی دیگر قومی خدمات سے آنکھیں بند کر لینا۔ اللہ والوں پر دنیا پرستوں کا سب سے بڑا ظلم ہے۔[1]

---

[1] ان بزرگوں کی خدمات کے سلسلے میں تالیف ہذا کا دیباچہ اور میرا مقالہ "اسلامی خانقاہوں کی اہمیت" بھی زیر نظر رکھیں ۱۲

Marfat.com

(۱۶)

اسلامی خانقاہوں
کی اہمیّت

Marfat.com

۷۸۶

وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً

(۷۳ - ۸)

اور ہر طرف سے منقطع ہو کر اسی کی طرف متوجہ ہو جا

کیمیا پیدا کن از مُشتِ گِلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے

(اقبال)

اسلامی خانقاہوں کی اہمیّت

خانقاہیّت اور رہبانیّت کا فرق

علامہ اقبال نے متعدد اشعار "خانقاہیت" اور "خانقاہ نشینوں" کے خلاف لکھے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور مسلمانوں کے زوال کا دور ہے۔ اور اس دور میں ہر چیز کی طرح مسلم خانقاہوں کا نظام بھی درہم برہم ہوچکا ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ حال نہ تھا۔ بلکہ برِ اعظم ہند و پاکستان میں مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی تربیت کے نظام میں خانقاہوں اور خانقاہ نشینوں اور ان کی تعلیم و تربیت کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ یہاں اخلاقی و روحانی تربیت کے لئے صوفیائے کرام کا نظام تربیت ہی بہترین ہے۔ لہذا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ "رہبانیت" اور "خانقاہیت" کا فرق ظاہر کیا جائے۔ تاکہ "اسلامی خانقاہوں" سے متعلق غلط فہمیاں دور ہو سکیں۔

عہدِ اسلام سے قبل اکثر ممالک میں خانقاہیں ہوتی تھیں اور اب بھی ہیں۔ وہاں مخصوص مذہبی عقائد کے بموجب رہبانیت اور زندگی سے فرار کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور آج بھی دی جاتی ہے۔ چنانچہ بدھ مت اور عیسائیت سے تعلق رکھنے والی تمام خانقاہیں اسی مقصد سے قائم ہیں۔ تاکہ ان کے مذہبی عقائد کی تکمیل ہو سکے۔ لیکن عہدِ اسلام میں مسلم اکابر علماء و صوفیاء نے جو خانقاہیں قائم کیں وہ دراصل اسلامی علوم کی درس و تدریس اور ان کی اشاعت کا مرکز تھیں۔ وہاں عقائد اسلامی اور علوم دینی کی تکمیل کے لئے تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ اور اب بھی ان اسلامی مراکز تعلیم و تربیت کا یہی مقصد ہے۔ کہ ان میں عقائد اسلامی کے مطابق اخلاقی و روحانی تربیت کی تکمیل ہو۔ انہیں بدھ مت اور عیسائیت کی خانقاہوں کے ہم معنے سمجھنا سخت غلطی ہے۔ ہر اسلامی خانقاہ جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا اسلامی عقائد کے بموجب تعلیم د

Marfat.com

و تربیت (بالخصوص روحانی تربیت) کا ایک ادارہ ہوتی تھی۔ اسے اقامتی دار التربیت کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کا بانی و مہتمم کوئی شیخ کامل ہوتا تھا۔ جو شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دیتا تھا۔ اور طالبان علم دین کو نہ صرف علوم شرعیہ سے بہرمند کرتا تھا۔ بلکہ اپنی پاکیزہ نفسی، نورانیت قلبی، اور صفائے باطن کے اثرات سے طالبان حقیقت کے سینوں کو منور اور قلب کو پاک کرتا تھا۔ اس طرح جو طلبہ ان خانقاہوں سے کامیاب ہو کر نکلتے تھے۔ وہ موجودہ زمانے کے "چارپائے بر و کتابے چند" کے مصداق نہ ہوتے تھے۔ بلکہ تقویٰ اور طہارت میں ڈھلی ہوئی روحیں اور عمل و کردار صالح کے مجسمے ہوتے تھے۔ جن پر انسانیت فخر اور فرشتے ناز کرتے تھے

ان خانقاہوں کی عالیشان عمارتوں میں کتب خانے، شفا خانے، لنگر خانے اور مسافر خانے بھی تعمیر کئے جاتے تھے۔ (دراصل خود خانقاہ انہی چیزوں کا مجموعہ ہوتی تھی اور اس میں یہ شعبے علیحدہ علیحدہ نہ ہوتے تھے) یہاں لاکھوں بندگان خدا کی ذہنی اور روحانی تشنگی رفع ہونے کا سامان ہوتا تھا۔

ان خانقاہوں کے مصارف کے لئے اوقاف ہوتے تھے۔ جن کی آمدنی سے تمام اخراجات پورے کئے جاتے تھے۔ طالبان حق سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ خانقاہ اور شیخ خانقاہ کی خدمت کرنا ہی تعلیم و تربیت کا معاوضہ تھا۔ لنگر خانے سے دونوں وقت کھانا مفت[1] ملتا تھا تاکہ طالبان حق حصول معاش کی فکروں سے بے نیاز رہ کر اپنی تمام توجہ حصول دین اور اکتساب فیض روحانی کی جانب مبذول کر سکیں۔ تکمیل علم کے بعد روحانیت و اخلاق کے ان مجسموں اور علوم ظاہری و باطنی کے علمبرداروں کو اطراف و اکناف عالم میں بھیج دیا جاتا تھا۔ تاکہ وہ دین اسلام کا پیغام ہر کس و ناکس تک پہنچائیں۔ اور اپنے نور باطن سے دیگر قلوب کو منور فرمائیں۔ عمل و کردار کی یہ دیندار فوج منتشر رہنے کے باوجود اپنے مرکز (مرشد طریقت) سے وابستہ رہتی تھی

[1] دراصل خانقاہ کی زندگی جماعتی زندگی ہوتی تھی۔ اور ہر شخص خانقاہ کی کچھ کوئی خدمت اپنے ذمہ لے لیتا تھا۔ لیکن اس کا مقصد تزکیۂ نفس ہوتا تھا۔

شیخ طریقت ضروری ہدایت جاری کرتا رہتا۔ اور اپنے خلفاء کی کارگزاریوں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ خلفاء اپنے شیخ کی ہدایات پر دل و جان سے عمل کرتے تھے اور اسی کو سرمایۂ نجات جانتے تھے۔ حقیقت میں یہ نظام، یہ اطاعت، یہ ڈسپلن بے مثل تھا۔ اس لئے کہ دین کے ان بندوں کے قلوب منظم ہو جاتے تھے۔ اور ان کی خدمات کی نہ ہیں پیسے کے لالچ میں کام کرنے کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا تھا۔ نہ انہیں دنیاوی اعزاز کی تمنا ہوتی تھی۔ وہ سرکاری منصب اسی لئے قبول نہ کرتے تھے کہ آزادی کے ساتھ خدمت خلق کرنے میں اس سے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے بعض تو اتنے سخت تھے کہ سرکاری ملازمت کرنے والے کو اپنے سلسلہ میں داخل ہی نہ کرتے تھے۔

خلفاء کا خاص کام یہی ہوتا تھا کہ وہ جس جگہ مامور کئے جائیں وہاں روحانی درس گاہیں (خانقاہیں) قایم کریں اور اپنے پیشوایانِ طریقت کے اصولوں اور طریقوں کے مطابق اخلاق و روحانیات کے دیگر مجسمے تیار کریں۔ تاکہ سوسائٹی میں اکثریت ایسے افراد کی ہو جائے۔ جو اخلاق و روحانیت کے مالک ہوں۔ جو آج کل کی طرح محض "افراد" نہ ہوں بلکہ بااخلاق، باعمل اور دیندار انسان بھی ہوں۔

آج ملک میں بے شمار تعلیمی ادارے قائم ہیں۔ لیکن یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اخلاقی و روحانی تربیت کے مراکز ہرگز نہیں ہیں۔ وہاں محض دنیوی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس کے متعلق بھی ماہرین تعلیم کی یہی رائے ہے۔ کہ وہ ہرگز ہماری قومی ضروریات کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اس سے نہ دنیا ہی درست ہوتی ہے نہ دین کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود انسان ہزاروں روپے اور اپنی عمر عزیز کے متعدد قیمتی سال صرف کر کے چند کاغذی سندات حاصل کرتا اور اس تضیعِ اوقات پر فخر کرتا ہے۔

محققین کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ جس زمانے میں ہندوستان مسلم حکمرانوں

لہ تفصیل کے لئے دیکھو "تاریخ مشائخ چشت" از پروفیسر خلیق نظامی۔ علی گڑھ

کے زیر نگیں تھا۔ اسلامی خانقاہوں کا نظام ہی تربیت نفوس اور تزکیۂ اخلاق کے لئے بہترین نظام تھا۔ یہی نہیں۔ بلکہ خانقاہیں ایک قسم کے جماعت خانے تھے جہاں مشائخ عوام سے ربط و ضبط رکھ سکتے تھے۔ جہاں عوام کی تکالیف پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا جاتا تھا۔ اور جہاں ان کے زخموں کے لئے مرہم ملتا تھا۔

پروفیسر خلیق نظامی تاریخ مشائخ چشت میں حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ کا ذکر کرتے ہوئے صفحہ ۱۷۲ پر لکھتے ہیں کہ "تقریباً ۵۰ سال تک انسانی دلوں نے اس طرح ان کی خانقاہ میں راحت و سکون حاصل کیا۔ جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر تمازت آفتاب سے خستہ جان ٹھنڈے اور سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر فرحت و اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ حضرت محبوب الٰہیؒ کی خانقاہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ امیر و غریب۔ عامی و عالم شہری اور دیہاتی۔ بوڑھے اور بچے سب ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے......" یہی حال دیگر خانقاہوں کا تھا۔ ان کا مقصد عوام کے ذریعہ کوئی سیاسی انقلاب نہ ہوتا تھا۔ بلکہ انسانی ہمدردی کی بنا پر بندگان خدا کی خدمت اور ان میں اخلاقی و روحانی انقلاب پیدا کر کے اسلام کی اساسی اقدار کی حفاظت مقصود تھی۔

خانقاہ نشینوں کی دیگر خدمات

صوفیائے کرام کے تمام مشہور سلسلوں کے مشائخ کا تعلق تمام عمر خانقاہوں ہی سے رہا ہے کیونکہ ان کے طریقۂ تعلیم و تربیت میں خانقاہوں کو بنیادی حیثیت حاصل تھی یہیں سے لاکھوں نفوس روحانیت کے علمبردار ہو کر نکلے اور اطراف ہند و ایران نیز دیگر ممالک اسلامیہ میں دین و ایمان اور اخلاق و روحانیت کی روشنی پھیلائی۔ انہی خانقاہوں میں اللہ کے یہ برگزیدہ

لہ جہاں تک روحانی تربیت اور سلوک طریقت کی تکمیل کا تعلق ہے۔ اعلیٰ و ادنیٰ سب کے لئے خانقاہی تربیت ضروری تھی۔

Marfat.com

بندے ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اور ان کے مزارات (اللہ ان کی ارواح پر نزول رحمت فرماتا رہے) آج بھی فیض رساں عالم ہیں۔ انہی خانقاہوں میں گوشہ نشین رہنے والے بزرگ بڑے بڑے جابر و ظالم حکام وقت اور سلاطین زمانہ کے قلوب پر حکمرانی کرتے تھے۔ اور انہیں مخلوق خدا پر ظلم و ستم کرنے سے باز رکھتے تھے۔ یہ حکمران ان سے ڈرتے تھے اور انکی اطاعت و فرمانبرداری کو ذریعۂ نجات سمجھتے تھے۔

ضرورت کے وقت یہی "درویش خدامست" اور انکے "مریدین حق پرست" سر بکف ہو کر کفار و مشرکین سے جہاد بھی کرتے تھے۔ اور جام شہادت نوش کرنے کے جذبے سے سرشار ہو کر جنگ کرتے تھے۔ فتحمند ہوتے تو غازی کہلاتے ورنہ شہید ہو کر حیات ابدی سے مشرف ہوتے تھے۔ بقول اقبال:-

یہ غازی یہ تیرے پر اسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

(بال جبرئیل)

اور اس طرح وہ اپنے مریدین و معتقدین کو بھی راہ حق میں قربان ہونے کی عملی تعلیم دیتے تھے۔[2]

---

[1] صوفیاء کرام نے عالم ارواح سے اکتساب فیض کے اصول اور طریقے مقرر کئے ہیں۔ جو ان سے ناواقف ہیں انہیں کوئی فیض نہیں پہنچا۔ اسی طرح بد عقیدہ لوگوں کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ظاہر پرست اسے قبر پرستی سمجھتے ہیں۔ لیکن خرد کو عالم معنے سے کام نہیں ہے۔ ۱۲

[2] آج بین الاقوامیت اور سائنسی آلات کا دور ہے جنگ و مدافعت کی تمام ذمہ داری ہر ایک کی حکومت کے کاندھوں پر پہنچی ہے۔ عوام کا کام صرف تعاون کرنا ہے۔ چنانچہ جنگ یا جہاد سے پہلے حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ قوم کو ہر شعبۂ زندگی میں احتیاج سے آزاد کر دے۔ تاکہ وقت آنے پر وہ پوری طرح حکومت کے ساتھ تعاون کرے صوفیاء کرام کا عملی کام آج بھی اپنی جگہ اہم ہے۔ یعنی احتیاج میں مایوسی اور اخلاقی پستی سے اور خوشحالی میں عیش و عشرت میں مبتلا ہو کر خدا کو بھول جانے سے قوم کو محفوظ رکھنے کی کوشش نیز اللہ کے راستے میں ان کی راہنمائی کرنا۔"

میدانِ تصنیف و تالیف کے شہسوار بھی یہی "بوریا نشین" "خانقاہی" "فقراء" تھے۔ چنانچہ دینی تالیفات کا بہترین سرمایہ زیادہ تر انہی بزرگوں کے رشحات قلم کا ممنون ہے۔

غرض یہ کہ کفرستان ہند میں سب سے زیادہ "تبلیغ اسلام" خانقاہ نشین صوفیوں اور درویشوں ہی کی بدولت ہوئی اور وہی اسلام کے ستون اور حق کے علمبردار تھے اس مختصر مضمون میں تفصیلات کی گنجائش نہیں ہے۔ فقرائے اسلام کی سوانح عمریاں اور دیگر متعلقہ کتابیں ان کی خدمات اور عملی کارناموں کے بیان سے پُر ہیں۔ تفصیل کے متلاشی کتب مذکورہ کی جانب متوجہ ہو سکتے ہیں[1]

ہندوستان میں اسلامی خانقاہوں کے زوال کے اسباب

ہر چیز کے زوال کے اسباب خارجی بھی ہوتے ہیں داخلی بھی۔ چنانچہ ہندوستان میں مشائخ اسلام کی خانقاہوں کے زوال کے اسباب بھی یہی نوعیت رکھتے ہیں جبتک ہندوستان میں مسلمان برسر اقتدار رہے۔ مساجد و مکاتب کی طرح خانقاہیں بھی عروج پر رہیں۔ اور قومی تعلیم و تربیت، اصلاح قلوب و اعمال، تہذیبِ اخلاق اور تادیب سیاست کے فرائض انجام دیتی رہیں۔ مسلمانوں کے پاس دولت بھی تھی حکومت بھی۔ وہ ہر طرح ان خانقاہوں میں تعلیم و تربیت پانے والوں کی مدد کرتے تھے۔ سلاطین و امراء پیران طریقت کی غلامی پر فخر کرتے اور ہر طرح انہیں محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ (لیکن یاد رہے کہ مشائخ اسلام اپنے زریں اصولوں کو قربان کرکے کبھی ارباب اقتدار یا دیگر حضرات کے ساتھ مفاہمت نہ کرتے تھے) مشائخ مذکور اتنے غیور ہوتے تھے کہ وہ اپنے مریدوں کے سوا کسی غیر مرید کی کوئی "نذر" قبول نہ کرتے تھے خواہ وہ کسی سلطان ہی کی جانب سے کیوں نہ پیش کی گئی ہو۔ وہ ہزاروں لاکھوں اشرفیوں کو

---

[1] اس سلسلے کی بہترین کتاب پروفیسر خلیق نظامی (علی گڑھ یونیورسٹی) کی "تاریخ مشائخ چشت" حال ہی میں میری نظر سے گذری ہے۔ خدا کرے کتاب مذکور کے باقی حصے بھی شائع ہو چکے ہوں۔ دوسری کتاب "بزم صوفیہ" ہے۔ جس کے مصنف جناب صباح الدین عبدالرحمٰن ایم۔ اے ہیں۔ اور جو دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوئی ہے۔ ۱۲

پائے استغناء سے ٹھکرا دیتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے یا اپنے اہل و عیال کے نام کوئی جاگیر نہیں خریدی۔ نہ بطور نذر اپنے لئے قبول کی۔ جاگیریں خانقاہوں کے مصارف کے لئے وقف ہوئیں۔ تاکہ وہاں کتب خانے۔ اور لنگر خانے جاری رہ سکیں۔ اور علم دین کے طلب گار کسب معاش سے بے نیاز ہو کر پورے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہ سکیں اور مدرسِ اعلیٰ (صاحب خانقاہ) نیز مدرسین (خلفاء) بھی دنیاوی تفکرات سے علیحدہ رہ کر درس و تدریس کی خدمت انجام دے سکیں۔

لیکن زوالِ سلطنت کے ساتھ "تعمیر انسانیت" کے ان مراکز پر بھی زوال آیا جوں جوں سلاطین و امراء بے دست و پا ہوتے گئے۔ خانقاہوں کے ذرائع آمدنی مسدود ہوتے گئے ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستانی خانہ جنگیوں نے عوام و خواص کی توجہ کو زیادہ تر اپنی جانب مرکوز رکھا۔ ۱۸۵۷ء کی شورش بلائے بے درماں بن کر نازل ہوئی۔ اور جس طرح مسلمانوں کی حکومت و تجارت اور ان کے نظام تعلیم اور تہذیب و تمدن کو اس سے نقصان پہنچا۔ اسی طرح ان کی خانقاہوں کا نظام بھی اس کی زد سے نہ بچ سکا۔ انگریز مسلمانوں سے اور ان کے تمام اداروں سے بدظن ہو گئے۔ اور ہر اس نظام اور ادارے کو رفتہ رفتہ ختم کر دیا جس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ تفصیلات کے لئے میجر بسو کی کتاب "ہندوستان میں اہل کلیسا کے اقتدار کی ترقی" اور پنڈت سندر لال الہ آبادی کی مشہور کتاب "بھارت میں انگریزی راج" اور اس قسم کی دیگر کتب اور مقالات دیکھئے۔ جن میں ان مظالم کا ذکر ہے جو انگریزوں نے مسلمانوں پر کئے ہیں۔

شورش مذکورہ کے بعد (جو دراصل مسلمانوں کی پہلی جنگ آزادی تھی) صدہا مسلم اوقاف ضبط کر لئے گئے اور اس طرح ہزاروں مکتبوں، مدرسوں اور خانقاہوں کی شہ رگ ہی کاٹ دی گئی۔ جس کی وجہ سے ان کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔ صرف گنتی کی چند بڑی بڑی خانقاہوں کے اوقاف ضبطی سے بچ گئے۔ وہی آج تک قائم ہیں۔ اور ان کی آمدنی سے کہیں مدرسے قائم

Marfat.com

ہیں۔اور کہیں ان کے علاوہ لنگر خانے بھی جاری ہیں۔اور وہاں روزانہ لنگر تقسیم کیا جاتا ہے جس سے صدہا غریبوں، محتاجوں کی شکم پُری ہوتی ہے۔ان کے علاوہ زائرین کے قیام وطعام کا انتظام بھی آسانی سے ہو جاتا ہے۔اس سے یقیناً صاحب مزار کی رُوح خوش ہوتی ہوگی۔ اور اُسے ثواب پہنچتا ہوگا۔کیونکہ زندگی میں محتاجوں کی مدد کرنا ان کا خاص کارنامہ تھا۔وہی مقصد لنگر خانوں سے اب بھی پورا ہو رہا ہے۔اس طریقۂ امداد پر اعتراض غلط ہے۔کیونکہ ہر ملک میں محتاج خانوں کی ضرورت رہتی ہے۔خواہ وہ حکومت وقت کی نگرانی میں قائم رہیں خواہ اوقاف کی صورت میں۔بہرحال وہ ضروری ہیں۔ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی خانقاہوں کے لنگر خانے، جیسا کہ پہلے مذکور ہوا طلبائے علم کے لئے وقف تھے۔اور مسافروں کو بھی وہاں سے کھانا دیا جاتا تھا۔اس مقصد سے ان میں ضروری اصلاح کی جا سکتی ہے۔متولیوں پر بھی تمام اعتراضات صحیح نہیں ہیں۔کیونکہ اکثر متولی آج بھی باعلم وعمل اور متقی و پرہیزگار ہیں۔اور ہزاروں بندگان خدا اپنی روحانی تشنگی کی تسکین کے لئے ان ہی کی جانب رجوع کرتے اور فیض یاب ہوتے ہیں۔جہاں یہ باتیں نہ ہوں وہ خانقاہیں اور ان کے متولی بے شک قابل اعتراض ہیں اور اقبال کے اعتراضات ایسی ہی نام نہاد خانقاہوں اور بے فیض مجاوروں کے خلاف سمجھنے چاہئیں، اشعار میں اجمال سے کام لیا جاتا ہے۔تفصیل تلاش کرنا۔اعتراض و حقائق کا تجزیہ کرنا اور کھوٹے کو کھرے سے الگ کر کے فیصلہ کرنا ہمارا کام ہے۔کسی اعتراض کا اطلاق عمومیت کے ساتھ تمام خانقاہوں پر کرنا انصاف کے خلاف ہے۔

سطور بالا سے ثابت ہو گیا کہ مسلمان مشائخ کا نظام خانقاہیت بذاتِ خود برا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی تربیت کے لئے بہترین نظام ہو سکتا ہے۔جیسا وہ پہلے تھا۔ صحیح معنوں میں با اخلاق[1] انسان اور بہترین سوسائٹی پیدا کرنے کے لئے اخلاقی تربیتی مراکز کا

---

[1] "اخلاق" سے یہاں دیگر فضائل کے علاوہ وہ جرأت بھی مراد ہے جو سوسائٹی کے غلط معیار نیکی اور بدی کے مٹانے کے لئے ضروری ہے۔

ہونا لازمی ہے۔ وہ مشائخ کی خانقاہوں سے بہتر نہیں ہو سکتے۔ بشرطیکہ انکے منتظمین خلق اللہ کی خدمت خلوص و بے لوثی کے جذبے کے ساتھ اسی طرح انجام دیں۔ جس طرح بزرگان سلف دیا کرتے تھے۔

اقبال نے جو اعتراضات "شیوۂ خانقہی" پر کئے ہیں۔ ان کا اطلاق غیر اسلامی "شیوۂ خانقہی" پر کیا جائے گا۔ نہ کہ مسلم فقراء اور مشائخ کی خانقاہوں پر۔ کیونکہ وہ "مرد مومن" اور ان کی "نگاہِ غلط انداز" ہی کو "پرورش خودی" کے لئے ضروری اور موجود اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کو ناقص سمجھتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

گرچہ مکتب کا جواں زندہ نظر آتا ہے
مُردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نفس
پرورش دل کی اگر مد نظر ہے تجھ کو
مرد مومن کی نگاہ غلط انداز ہے بس

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ

میں نے اپنے بعض مقالات میں تفصیل سے یہ ثابت کیا ہے۔ کہ علامہ اقبال کا "مردِ مومن" اور "انسان کامل" صرف اولیاء اللہ ہو سکتے ہیں۔ دوسرا کوئی شخص نہیں ہو سکتا۔

ایک دوسری جگہ اقبال فرماتے ہیں:۔

مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت کہاں حجاب دلیل

کیا یہ "لذت حضوری" مشائخ کرام کی تربیت کے سوا کسی دوسرے طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہے؟ یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے۔ کہ غیر مسلم اہل فلسفہ کے "وجدان" اور مسلم فقراء و

Marfat.com

مشائخ کی "حضوری" میں فرق ہے۔ حقیقت اشیاء کا علم بذریعہ "وجدان" اور چیز ہے۔ اور "خدارسی" دوسری چیز ہے۔ یہاں "لذتِ حضور" سے وہ کیف و سرور مراد ہے۔ جو تصوف میں "عین الیقین" اور "حق الیقین" کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ "مقام انسانیت" کی معراج ہے جسے "فقر" یا "ولایت" کہتے ہیں

علامہ اقبال ایک جگہ بزرگوں کے فیضانِ نظر کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

یہ فیضانِ نظر تھا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آدابِ فرزندی

اور ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

ظاہر ہے کہ مذکورۂ بالا شعر میں جس "نظر" کا ذکر ہے۔ وہ ایک جلیل القدر نبیؑ کی نظر تھی۔ اور دوسرے شعر میں "نظر" بمقابلۂ خرد ایک "ولی حق" کی نظر ہو سکتی ہے۔ کسی دوسرے شخص کی نہیں۔ ایسی "نظر" نہ موجودہ درسگاہیں بنا سکتی ہیں۔ نہ ظاہری علم و حکمت کے ماہر تیار کر سکتے ہیں۔ بقول اقبال:۔

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

ایسی "نگاہ" صرف اولیاء اللہ کی صحبت میں ملتی اور عشق الٰہی کی فضاء میں پرورش پاتی ہے۔ (علم و عشق کا مقابلہ علامہ اقبال نے اپنی نظم "علم و عشق" ضربِ کلیم میں کیا ہے۔ اس نظم کا جواب نہیں ہے) بہر حال عشق الٰہی کی فضاء اور مردان حق کی صحبتیں صرف اسلامی خانقاہوں میں میسر آتی تھیں۔ ان کے زوال کے ساتھ اولیاء اللہ کی صحبتیں اور ان کی برکتیں قریب قریب ختم ہو گئیں۔ اسی زوال کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمانوں میں بے دینی، بے ایمانی، بد اعمالی، آوارہ مزاجی

Marfat.com

اور خدا و رسول کی نافرمانی کی کثرت ہے۔ اور مسلمانوں کی اکثریت بے دینی پر متاع ایمان کو، مغربی تہذیب پر اسلامی اخلاق و سیرت کو۔ ذاتی مفاد پر قومی، ملکی و ملی مفاد کو۔ اور دو روٹیوں کی ضرورت پر دینی عزت اور قومی حمیت کو قربان کر رہے ہیں۔ یہی وہ "مسلمان" ہیں جو دنیاوی آلودگیوں اور معصیت کی گندگیوں میں حلق تک ڈوبے ہوئے ہیں اور خدا و رسولؐ کا دم بھرنے کے باوجود خدا و رسولؐ سے کوسوں دور ہیں۔ کیونکہ ان کا "اسلام" انکے حلق سے نیچے نہیں اُترتا۔ ان کے دلوں کو دنیا کی حرص و طمع سے پاک کرنے اور انہیں خدا کی محبت سے بھر دینے والے مراکز تباہ ہو گئے۔ اسی نکتے کو اقبال ایک نظم میں اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

مُسلمان کا زوال

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں
اگر جواں ہوں مری قوم کے جسور و غیور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں
اگر جہاں میں مرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے سکندری سے نہیں (ضرب کلیم)

بال جبریل میں مرید ہندی کہتا ہے:۔

اب مسلماں میں نہیں وہ رنگ و بو
سرد کیونکر ہو گیا اس کا لہو

Marfat.com

اقبال اس کا جواب "پیر رومی" کی زبان سے یہ دیتے ہیں :-

تا دل صاحبدلے نامد بدرد
ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

اقبال افرنگی تعلیم کو محرومی د ناکامی سمجھتے ہیں۔ اس سے دماغی ترقی تو ہوتی ہے لیکن دل برباد ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

برا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اُسے
فرنگ دل کی خرابی خرد کی معموری

ہندوستان اور پاکستان کا موجودہ نظام تعلیم سراسر فرنگیانہ ہے۔ اس سے دل کی دنیا کو تباہ ہوتی ہی ہے۔ دماغ بھی کماحقہٗ درست نہیں ہوتے۔ اگر دس ہزار میں دس پندرہ افراد ذہنی و دماغی قابلیت کے حامل ہوئے تو کیا کمال ہوا۔ ان کے قلب و نظر کی خرابی ان کی دماغی قابلیت پر خاک ڈال دیتی ہے۔ اِلَّا مَا شَاءَ اللہ

علاوہ بریں ہمارا موجودہ نظام تعلیم، ہماری آزادی اور قومی و ملی ضروریات کے لئے بھی موزوں نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ قیام پاکستان کو دس سال ہو چکے لیکن اب تک ہم ایک آزاد قومی و ملی نظام تعلیم قائم نہ کر سکے۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم وہی اچھا ہو سکتا ہے۔ جو دل اور دماغ دونوں کی ترقی کا ضامن ہو۔ لیکن اصولاً انہیں دو الگ الگ شعبوں میں منقسم ہونا چاہئے۔ ایک علوم عقلی کے لئے ہو۔ دوسرا روحانی تربیت کے لئے۔ ایک کا انتظام حکومت کے سپرد ہونا چاہئے۔ دوسرا روحانی پیشواؤں کے ذمہ رہنا ضروری ہے۔ زمانہ قدیم سے یہی دستور چلا آرہا ہے اور بڑے بڑے علماء و فضلاء ظاہری علوم کی تکمیل کے بعد علم باطنی کی تحصیل کے لئے فقراء و مشائخ کی جانب رجوع کرتے تھے چنانچہ حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

ترجمہ :- "ظاہر بغیر امتزاج باطن کے منافقت ہے۔ اور باطن بغیر شمول ظاہر کے

Marfat.com

زندقہ ہے۔ شریعت کا ظاہر بلا باطن نقص ہے اور باطن بلا ظاہر ہوس" ۱؎
ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں :۔

"جسے علم معرفت نہیں۔ اس کے قلب پر جہل کی موت طاری ہے اور جسے علم شریعت نہیں اس کا قلب مرض نادانی میں گرفتار ہے" ۲؎

اس قسم کے اقوال متعدد بزرگان دین کے ہیں۔ غرض یہ کہ جب موجودہ تعلیمی ادارے ہماری قومی و ملکی ضروریات (ظاہری) کی تکمیل نہیں کرتے۔ تو ہم ان سے یہ توقع کس طرح کر سکتے ہیں۔ کہ وہ اقبال کے "مرد مومن" یا تصوف کے "مردان حق" تیار کرنے کے قابل ہیں۔

دراصل خانقاہوں کی اہمیت خانقاہ نشینوں کی شخصیت اور ان کے کارناموں کی بدولت قائم رہتی ہے۔ ان مقدس ہستیوں کی شان میں علامہ اقبال خود ایک جگہ فرماتے ہیں :۔

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موج نفس اُن کی
الٰہی کیا چھپا ہوتا ہے اہل دل کے سینوں میں
ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو
وہ رونق انجمن کی ہے انہی خلوت نشینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
محبت کے لئے دل ڈھونڈھ کوئی ٹوٹنے والا
یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

علامہ اقبال خودی کی تادیب و تہذیب اور اس کی تکمیل کے لئے جن باتوں کو ضروری

۱؎ ، ۲؎ کشف المحجوب۔

Marfat.com

قرار دیتے ہیں۔ ان میں "مرد کامل" کی محبت واطاعت سب سے اہم ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

کیمیا پیدا کن از مشت گلے

بوسہ زن بر آستان کاملے

یعنے ہماری یہ مشت خاک کیمیا تاثیر نہیں بن سکتی جب تک "کاملین" اور ان کے "آستانے" نہ ہوں۔ اور جب تک ان کی "آستانہ بوسی" عقیدت کے ساتھ نہ کی جائے خود علامہ کی اس ہدایت کے پیش نظر ان کے نظریۂ خودی کی محض تبلیغ کافی نہیں۔ بلکہ ملک میں "کاملین" کی جماعت اور ان کے تربیتی "آستانوں" کا ہونا بھی ضروری ہے۔ بقول شخصے ؎

"جائے استاد خالی است"

افسوس کہ آج یہ نظام برباد ہو چکا ہے اور "کاملین" کا فقدان ہے۔ لیکن دنیا ان سے کبھی خالی نہیں رہ سکتی۔ دیکھنے والی آنکھ چاہیئے۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ "کامل" کی تعریف اور "معیارِ کمال" میں اختلاف ہو جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔ لیکن میں "انسان کامل" کے تحت بیان کر چکا ہوں کہ اسلام میں ارتقاء روحانی، معنوی ہے۔ جسمانی ظاہری نہیں نیز یہ کہ معنوی ارتقاء ظاہری ترقیوں کا مانع بھی نہیں ہے۔ البتہ وہ انہیں جائز حدود کے اندر رکھتا۔ اور ذرائع کی حیثیت دیتا ہے۔ نہ کہ اصل مقصود کی۔ اسلام حصول علم، سیر و سیاحت تجارت و زراعت اور کسب معاش کے تمام جائز ذرائع کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ لیکن انہیں معاد کے تابع رکھتا اور اللہ کی رضا و خوشنودی کو اصل مقصود قرار دیتا ہے۔ اللہ کی رضا و خوشنودی ہی کی اعلیٰ ترین صورت قرب الی اللہ (ولایت) اور نبوت کے لئے علامات ہیں۔

علامہ اقبال نے اس دنیا میں "حیات اندر ستیز است" کی تعلیم دی ہے۔ وہ "شکوہ سنجر و سلیم" اور "فقر جنید و بایزید" کے امتزاج کو عروج ملت کے لئے ضروری قرار دیتے

ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ

"عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد"

اور انسانیت کی حفاظت کے لئے اسلامی سیاسی اقتدار (خلافت، حیدری و کراری) کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ سلطانی بھی فقر کے ہزاروں مقامات میں سے ایک مقام ہے۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سُلطانی
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِّ سُبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی

لیکن واضح رہے کہ وہ "مقام سلطانی" پر ٹھہر جانے کی تعلیم نہیں دیتے ؎

ہر ایک مقام سے آگے مقام ہے تیرا

اور اس سے بلند تر مقام کو یوں بیان فرماتے ہیں:۔

نہ تاج و تخت میں نے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

وہ اس مقام سے بھی گذر جانے کی سکیم دیتے اور آخری منزل کی تعیین یوں کرتے ہیں۔

آتش در گیر زد و خس و خاشاک من
مُرشدِ رُومیؒ کہ گفت منزلِ ما کبریاست

اور

یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

یہی وہ مقام ہے۔ جسے قرآن اور اسلامی تصوف میں تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ ؕ
اور "قربِ حق" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہی مومن کی معراج ہے اور اسی مقام کے حصول کی تربیت
اسلامی سلوک و تصوف میں دی جاتی ہے۔ خواہ اس کا مرکز کوئی "خانقاہ" ہو خواہ کوئی دوسری
جگہ۔ ان معنے میں اور اس مقصد کے لئے نہ "خانقاہ" موردِ الزام ہو سکتی ہے نہ "شیوۂ خانقہی"
پر کوئی اعتراض صحیح ہے۔ البتہ جہاں یہ تربیت نہ دی جاتی ہو اور قربِ حق کا حصول جس کا
مقصد اصلی نہ ہو۔ اس پر اعتراض حق بجانب ہو سکتا ہے۔

فلسفۂ خودی کی وضاحت کے سلسلے میں اقبال کے پورے فلسفۂ حیات اور اس کے
مختلف مقامات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ نیز اس اصول کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ
فقر کا کوئی مقام اپنے سے بلند تر مقام کی تردید نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کی طرف بڑھنے
کا ایک زینہ ہوتا ہے۔ چنانچہ فلسفۂ خودی کی جامعیت کو اقبال نے ایک جگہ یوں بیان
کیا ہے :-

خودی کی جلوتوں میں مُصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسمان و کرسی و عرش
خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

لیکن افسوس ہے کہ بعض حضرات "خودی کی جلوتوں" میں کچھ اس طرح کھو جاتے ہیں
کہ "خودی کی خلوتوں" کی تردید کرنے لگتے ہیں۔ اور ان "خلوتوں" کے شہنشاہوں یعنے
"اصحاب صفہؓ اور دیگر اکابر صوفیہ مثلاً حضرت حسن بصریؒ، اویس قرنیؓ، بایزید بسطامیؒ
جنید بغدادیؒ، محبوب سبحانی قطب ربانی حضرت عبد القادر جیلانیؒ، حضرت غریب نواز
خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ وغیرہ کے مسلکِ توحید وجودی حقیقی اور ان کے مشربِ فقر

Marfat.com

کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں (وہ نام لے کر تو ایسا نہیں کہتے لیکن توحید وجودی کو افلاطونی یا ویدانتی فلسفہ ثابت کر کے بالواسطہ طور پر ان بزرگوں کے صحیح عقائد کو غلط ثابت کرنے ہی کی کوشش کرتے ہیں۔)

کیا وہ اس طرح اقبال کے پیغام کو ناقص اور نامکمل صورت میں دنیا کے سامنے پیش نہیں کرتے؟ کیا وہ اس طرح خود اپنی جہالت دبے دینی کو بے نقاب نہیں کرتے؟ اور کیا وہ اس طرح اسلام کے روحانی اور معنوی ارتقاء کی تردید کر کے مسلمانوں کو صرف مادیت میں الجھ کر رہ جانے کی دعوت نہیں دیتے؟

اقبال تو دیانتداری کے ساتھ اسلامی زندگی کے تمام "مقامات" کو اور اصل "منزل حیات" کو بالصراحت بیان کرتے ہیں۔ لیکن سطح بین حضرات صرف ایک "درمیانی مقام" میں خود بھی پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی وہیں الجھا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (وہ بھی اقبال کے نام پر) اقبال کو شاید اس کا احساس تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک جگہ ایسے "غافلوں" کو اس طرح تنبیہ کی ہے:۔

خودی میں گم ہے خدائی تلاش کر غافل
یہی ہے تیرے لئے اب صلاح کار کی راہ

خودی کو صرف سلطنت یا "جنگ و جدال" کا فلسفہ ثابت کرنے والے حضرات اقبال کی قلندری کا بھی مطالعہ کریں اور ان کے اس نظریہ کی وضاحت کرنے کی تکلیف بھی اٹھائیں جو ان کے اس شعر میں بیان ہوا ہے:۔

اگر جہاں میں میرا جوہر آشکار ہوا
قلندری سے ہوا ہے سکندری سے نہیں

اور فلسفہ و سائنس سے ہٹ کر خودی کے اس اعلیٰ مقام کی گہرائیاں بھی بیان کریں۔ جو اقبال کے اس شعر میں اشارۃً مذکور ہیں یعنی

Marfat.com

حکیمی نامسلمانی خودی کی
کلیمی رمزِ پنہانی خودی کی

نیز علامہ کے ان نظریات کی وضاحت بھی فرما دیا کریں جو مندرجہ ذیل اشعار میں بیان ہوئے ہیں۔ یعنی

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

یہ کافری تو نہیں کافری سے کم بھی نہیں
کہ مردِ حق ہو گرفتارِ حاضر و موجود

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُو

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی
کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی جز خود نہ بینی
تلاشِ خود کنی جز او نیابی

خودی کا سرِّ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ   وغیرہ وغیرہ

کیا اقبال کے یہ خیالات بھی افلاطونی یا ویدانتی فلسفوں سے ماخوذ ہیں؟ اگر نہیں

ہیں تو صوفیائے کرام کی زبان سے نکلنے کے بعد یہ سطح بین حضرات انہی خیالات کو افلاطونی اور "ویدانتی فلسفوں سے ماخوذ کیوں" بتایا کرتے ہیں۔ میں یہ بھی عرض کردوں گا۔ کہ جہاں اسلامی فقر و تصوف اور خانقاہوں کی اہمیت و افادیت کے متعلق مغرب زدہ اور سطح بین اشخاص کو اپنا نظریہ تبدیل کرنا لازمی ہے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ خانقاہوں اور ان کے منتولیوں میں کوئی نقائص ہوں تو ان کی بھی اصلاح ہو تاکہ اسلامی خانقاہیں صحیح معنوں میں وہی خدمات انجام دے سکیں جن کے لئے ان کا قیام ضروری ہے۔ یعنے مسلمانوں کی صحیح اخلاقی و روحانی تربیت۔ اس کے علاوہ اسلامی خانقاہوں کو علوم دین کی تبلیغ و اشاعت کے زبردست مراکز کی حیثیت بھی اختیار کرنا چاہئے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی مقصد موجودہ درسگاہوں اور تعلیمی اداروں سے پورا نہیں ہو سکتا۔

اگر کسی کو لفظ "خانقاہ" سے نفرت ہے تو "روحانی درسگاہ" کہہ لیں یا کوئی دوسرا نام تجویز کرلیں لیکن خدارا اصل مقصد اور اس کی اہمیت سے انکار نہ کریں۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب دین از نظر

خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
نگاہ چاہیئے اسرار لا الہ کے لئے

اقبال

یہ "نگاہ" اسلامی روحانی درسگاہوں ہی میں تیار ہو سکتی ہے۔

وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ

Marfat.com

اشاریہ

Marfat.com

اشاریہ

الف

اجتہاد عالمانِ کم نظر ۹۹

اجماعِ علمائے حق ۴۳

احسان ۶۰

اختلافِ تعبیر ۶۳

اخلاق و روحانیت ۶۰ - ۲۲۸ تا ۲۳۰

اربابِ تصوّف کی غلطی ۲۹۴ - ۲۹۵

ارتقاء ۱۵۹ تا ۱۶۴ - ۲۲۴ - ۲۲۵ -
۲۶۷ - ۴۰۰ - ۴۰۱

ارشاداتِ اقبالؒ کا مرکزی نقطہ ۲۹۲

آزاد انسان کی ترقی ۳۶۱ تا ۳۸۵

استغنا ۲۳۹

اسرارِ دین ۴۴ تا ۴۶ - ۵۸

اسلامی بین الاقوامیت ۴۰۸ - ۴۰۹

اسلامی تصوّف کی تقسیم (عربی و عجمی)
غلط ہے ۸۶

اسلامی تصوّف کے متعلق غلط فہمیاں ۳۸
۴۲ - ۴۳ - ۵۰ - ۵۱

اسلامی تصوّف کی چند خصوصیات، دیباچہ
صہ - ۹، ۵۰ - ۵۱ - ۶۲ - ۶۳
۶۷ - ۸۰ - ۸۲ - ۸۵ - ۹۰ -
۱۰۵ تا ۱۱۰ - ۴۰۲ - ۴۰۸ - ۴۰۹

اسلامی حکومت ۵۹ - ۶۰

اسلامی خانقاہوں کی اہمیت ۴۰ (مقالہ
۱۶) - ۴۱۸ تا ۴۳۶

اسلامی خانقاہوں کے زوال کے اسباب
۴۲۳ - ۴۲۴

اسلامی خانقاہوں کی خوبیاں اور خرابیاں
۴۲۵ تا ۴۳۶

اسلامی سوشلزم ۲۸۱ تا ۲۸۳ -
(اقتصادی اصول ۴۱۰ تا ۴۱۲)

اشرف المخلوقات، دیباچہ صٹ

اصحابِ صفہؓ - ۳۷ - ۲۳۸ ، ۲۳۹

اصطلاحات کا استعمال (غلط مفہوم میں)
۳۸ تا ۴۲ - ۴۰۴

اصولِ تقسیمِ کار، دیباچہ ص۱۴

اضافات ۸۰

اعتبار ۷۹

اعترافِ اقبال، دیباچہ صٹ، ۱۹۱

افراد ۱۵۶ - ۱۵۷ (ذمہ داریاں ۲۹۵)

اقبالؒ اور ابن عربیؒ ۲۷ - ۲۸

اقبال اور برگسان ۲۵۳، ۳۹۲ تا
۳۹۷

Marfat.com

اقبال حضرت نظام الدینؒ اولیا کے مزار پر ۲۰-۲۱
اقبال اور حکیم سنائیؒ ۲۱-۲۲
اقبال اور خرقہ شریف کی زیارت ۲۲-۲۳
اقبال اور رومیؒ ۲۴ تا ۲۷-۲۹۳ تا ۳۹۷
اقبال اور مارکس ۴۱۱-۴۱۲
اقبال پر صوفیائے کرامؒ کے اثرات مقالہ ۱
اقبال کا اختلاف، دیباچہ ص۵، ص۷-۱۹-۲۷-۳۱-۷۴-۱۲۹
اقبال کا اصل پیغام ۱۱۰ تا ۱۱۵
اقبال کا نظریۂ عشق ۲۵۰ تا ۲۵۳
اقبال کی تائید در پردہ بسلسلۂ چشتی کی شہادت ۶۳-۶۴، ۷۱ تا ۷۳-۹۲-۹۳-۱۳۳-۳۸۴-۳۸۵
اقبال کی خودی اور قلندری کی بنیاد ۳۱-۳۲-۳۹۳ تا ۳۹۵
اقبال کی نصیحت اپنے فرزند کو ۳۰
اقبال، تصوف کے زبردست حامی و مبلغ ۳۱ تا ۳۳
اقبال نے فلسفیانہ انداز بیان کیوں اختیار کیا ۱۳۷
اقبال نے کوئی نیا فقر یا تصوف پیش نہیں کیا ۲۹-۳۰-۱۲۹
الجیلیؒ اور اقبال ۳۱۶-۳۱۷

اللہ کا راستہ ۱۲۷ تا ۱۲۹
الصلوٰۃ معراج المومنین ۴۷-۴۸
امامت ۵۹-۶۰
امانات الٰہیہ ۶۴
انا، ۴۵-۵۳-۷۷-۱۲۷-۱۷۷-
(انا اور عمل ۲۲۳) (انا اور خودی ۳۳۲-۳۳۳)
انائے حقیقی ۱۳۰ تا ۱۳۷ (انائے اعظم ۳۷۳-۳۷۴)
انسان (حقیقت ۴۶) (بلندیٔ انسان ۵۵) (انسانیت ۶۰-۶۱) (کمال انسانیت ۳۱۰-۳۴۴-۷۹-۸۰) (بلحاظ نفس ۸۲) (بلحاظ اعمال ۸۲) (طلسم یا راز ۱۱۸-۱۱۹) (انسانیت اور الوہیت ۲۲۱-۳۱۸) (نعم المطلوب ۲۴۳-۲۴۴) (قرآنی انسان مقالہ ۱۰) (انسان مرکز کائنات ۳۲۱) (مرتبۂ جامعیت ۳۸۱)-
انسان اور سوسائٹی ۴۰۲) (معراج انسانیت ۴۰۷) (تعمیر انسانیت کے مراکز مقالہ ۱۲)
انسانِ کامل، دیباچہ ص۳، ۵۹، مقالہ ۱۱، ۳۲۱ تا ۳۲۳ (اقبال کو کس انسانِ کامل کا انتظار ہے ۳۲۵ تا ۳۲۷)

انسانیت و احترام ۳۴۵ تا ۳۴۷)
(معراج انسانیت ۳۵۰)
انفس و آفاق (نشانیاں) ۱۵۰
انگریزی الفاظ اور ہماری اصطلاحات ۔
۴۰ تا ۴۲
اولیاء اللہ کا مرتبہ ۴۵
البغو ۳۷۰-۳۷۱
ایمان (اساسی عقائد پر پہلے ایمان لانا
ضروری ہے ۱۲۱)

ب

باطنی نعمتیں ۴۳-۵۶-۵۸-۵۹
باطل ۵۵
بقا ۵۵-۲۴۵-۲۵۴-۳۵۴ تا ۳۵۷-۴۰۱
بدھ مت کے غیر اسلامی عقائد ۱۹۱-۱۹۲
برکاتِ تصوف (دیباچہ ص۸، ص۹
بیعت ۴۴-۵۴-۶۰ (مقالہ ۵) (بیعت
طریقت کے انعامات ۲۶۹-۲۷۰)
بے عملی ۲۲۳ تا ۲۲۷
بصیرتِ مومن ۱۲۷

ت

تشبیہ و امثال ۱۳۷-۱۶۲-۳۳۳
تجلی و ظہور ۶۸-۶۹
تخریب قوم کی ذمہ داری ۲۲۶ تا ۲۲۸

تخلیقی فعلیت ۲۹۹ تا ۳۰۱-۳۲۴
ترقی کی اخلاقی و روحانی بنیادیں (مقالہ ۱
۳۱۳)
تزکیہ نفس ۳۷-۴۰-۴۸-۴۹-۵۱-۵۴
تصوف سے واقفیت کی ضروری شرطیں
دیباچہ ص۳
تصوف کی اصطلاح ۴۸ (تعریف ۴۸)
تصوف کے درجے ۵۲
تصوف کی خصوصیات (دیباچہ ص۸، ص۹
۵۰-۵۶ تا ۵۸
تصوف عملی زندگی کا نام ہے (دیباچہ
ص۴، ۵۶ تا ۵۸، ۲۳۲ (مقالہ ۹)
(انسانی و سماجی اقدار (تصوف ۱۰۵
تا ۱۰۸) (بعض غلطیاں ۲۵۴
۲۵۵-۴۰۴) (تصوف کی برگزیدہ
تعلیمات سے کن مسلمانوں نے انحراف
کیا ہے (دیباچہ ص۹)
تصوف (رہبانیت) پر اقبال کی نکتہ چینی
۱۲۱
تصوف اور اقبال (مقالہ نمبر ۲) ۴ تا ۵، ۱۱
تضاد ۳۶
تطہیرِ فکر کا تعلق تعمیرِ فکر سے ۔ دیباچہ ۲
تطہیرِ قلب ۳۷-۴۸-۴۹
تعلیم و تربیت ۱۱۱-۲۲۵-۲۲۶ (مقالہ ۱۶
تعمیرِ انسانیت کے مراکز (مقالہ ۱۶)

تعینات ۶۹ - ۱۷۳
تغیر ۳۶۹ - ۳۷۰ - ۴۰۰
تقوٰی اور رہبانیت کا فرق ۴۰
تکمیلِ دین تکمیلِ نعمت ۴۲
تنزلات (اقبال کی تائید ۷۳) ۱۳۴
تا ۱۳۷ - ۳۷۵ تا ۳۷۷
تنزیہہ وتشبیہہ ۶۹ تا ۷۱ - ۱۷۳ - ۱۷۴ -
۱۷۵ - ۳۷۵
توانائی ۱۴۳
توحید ۵۶ - ۶۲ - ۱۷۰ - ۱۷۱ (قسمیں
۵۷ - ۵۸ - ۶۲ - ۱۷۱)
توحید وجودی کی بعض اہم خصوصیات ۶۴
۶۵ - ۱۷۵ (خالص اسلامی عقیدہ
۱۰۴ - ۱۰۵) (غیر اسلامی عقائد ۱۸۴
تا ۱۹۳)
توحید وجودی کے متعلق صوفیائے کرام کا
عقیدہ ۶۷ - ۶۸ - ۱۸۲ - ۱۸۳ - ۳۶۳ تا ۳۸۵

ج

جبروت ۳۸۳
جمال و جلال ۱۱۴ (دلبری وقاہری ۱۱۳ -
۱۱۴ - ۲۱۱ - ۲۱۴)
جلوہ گاہ صفات ۳۶۲ - ۳۶۳
جمہوریت ۶۰

چ

چند اہم سوالات، دیباچہ صفحہ ۲، صفحہ ۳
چنگیزیت ۶۲

ح

حال ۵۸ - ۹۶ - ۹۸
حدیث نوافل (ترجمہ) ۵۴
حرکت ۱۲۳ - ۴۰۳ - ۴۰۴ - ۴۰۸ (حرکی اور
سکونی نظریہ حیات ۱۳۷ تا ۱۳۹)
حریت ۶۱
حریم ذات ۳۶۲ - ۳۶۳ - ۳۷۴ - ۳۷۵
حضورِ قلب ۹۶ تا ۹۹ - ۱۲۷ - ۴۲۶ -
۴۲۷
حفظِ مراتب ۷۱ - ۱۳۵
حق ۵۵ (حق الیقین ۵۵)
حقیقت ۴۳ - ۵۲ - ۵۶ - ۱۳۶ - ۱۴۳ -
۱۴۴ (وجودِ حقیقی ۱۴۶ - ۱۴۷)
حقیقتِ انسانیہ ۴۶ تا ۵۹ - ۶۲ - ۷۷ (
تا ۸۲) (مرتبۂ انسانی ۱۴۱ تا ۱۴۴ (
۱۴۸ تا ۱۵۱) (مقالہ نمبر ۳) (حضرت علیؓ
کے اشعار ۱۵۳) (حضرت مغربیؒ ۱۵۴)
حضرت عطارؒ ۱۵۴ - ۱۵۵) (۱۵۵ - ۱۵۶
(فرد سے امتیاز ۱۵۶ - ۱۵۷) (اہلِ
یورپ اور ہمارے نظریات کا فرق

Marfat.com

۱۵۸ - ۳۳۴ - ۳۳۵ - ۳۸۱
حقیقتِ حیات (سائنس اور فلسفہ کی رسائی
- مقالہ ۱۳) ۴۰۰
حقیقتِ محمدی ۷۹ - ۱۳۶
حقیقتِ موجودات ۱۷۸ تا ۱۸۱
حکمت ۵۱ - ۱۶۰ - ۱۶۱ (حکیم اور صوفی کا
فرق ۲۵۷)
حیات ۱۲۳ - ۱۲۴ - ۱۳۶ (وجدانِ حیات
رومی و برگسان ۱۶۲ - ۱۶۳) -
صوفیائے کرام اور اقبال کے نظریات
کا فرق ۲۱۷) (۳۳۵ تا ۳۳۹) (۳۴۳
۳۹۲ تا ۳۹۷
حیات اور قربانیاں ۳۴۳ تا ۳۴۵ -
۳۴۷ - ۳۵۳
حیات - بعض نکات جن کی تفصیل تعلیمات
اقبال میں نہیں ملتیں ۳۴۵ تا ۳۴۰
حیات سے متعلق چند تفصیلات ۳۶۰ - ۳۶۱
حیاتِ اجتماعی، مقالہ ۱۵ (اقبال کے
نظریئے میں تبدیلیاں ۴۰۷) (بنیادی
تصور ۴۰۷)

خ

خانقاہیت (اسلامی اور رہبانیت کا
فرق ۴۱۰)
خانقاہ نشینوں کی خدمات ۴۲۱ تا ۴۲۳
(خدماتِ صوفیائے کرام کے تحت بھی
صفحات درج ہیں) (اقبال کے
اعتراضات ۴۲۶) (اصلاح ۴۳۶)
خداشناسی دیباچہ ص ۳
خدا فراموش ماحول سے بچنا زندگی سے
فرار نہیں ہے ۴۰
خدا فراموش "مسلمان" ۱۱۲ - ۲۹۴ - ۴۲۰
خدماتِ صوفیائے کرام، دیباچہ ص ۱۱ تا ص ۱۴
۹۱ - ۲۳۰ - ۲۶۸ - ۲۶۹ - ۲۸۲
تا ۲۸۵ - ۳۸۵ - ۴۱۵ - ۴۲۱ تا
۴۲۳
خطباتِ اقبال ۳۱ - ۲۲۴
خلاصہ حقیقتِ انسانیہ اور اس کا عروج
۱۶۵ تا ۱۶۸
خلاصہ تصوف (نتائج بحث) ۱۰۸ تا ۱۱۰
خلافت فی الارض ۵۹ - ۶۰ - ۲۰۷ - ۲۰۸
(نظریۂ اقبال ۲۰۸ تا ۲۱۱)
خلافت اور ملوکیت ۳۸ - ۳۹ (خلافتِ
راشدہ ۳۹ - ۱۶۲ - ۵۹ - ۶۰ - ۲۰۷
۲۰۸ - ۲۸۷
خلیفۃ اللہ، دیباچہ ص ۳ ۴۹ - ۵۹ - ۶۲
۱۴۸ - ۲۷۵
خود شناسی - دیباچہ ص ۳
خودی (انائے انسانی) ۲۱۴ تا ۲۱۶ (انا
کے تحت دیکھو)

خودی اور عمل (مقالہ ۶) ۲۱۴ تا ۲۳۹
خودی کی جامعیت ۲۳۴

د

دشمن حق ۵۵
دنیا ۹۱
دورِ حاضر میں روحانی عوارض کا علاج ۲۵
۲۶-۳۰-۳۱
دین اللہ ۴۲-۴۴
دین کے اساسی اصول (روحِ ؟) ۳۰
دین میں ظاہر و باطن ۴۴ (ظاہر و باطن کے تحت بھی دیکھو)
دیدارِ الٰہی ۵۲

ڈ

ڈاروِن کا نظریہ ارتقا ۳۲۷ (ارتقا بھی دیکھو)

ذ

ذکر ۹۰-۹۱

ر

رجوع الی اللہ ۸۶-۸۷ (الی الاصل ۴۰)
روح ۱۲۰ تا ۱۲۳-۱۴۰-۱۴۱ (یورپ کا نظریہ ۱۵۸) ۲۴۴ تا ۲۴۷
روح الاسلام دیباچہ صہ
روحانی ارتقا اور اقبال ۳۱-۳۲
روحانیت اور سیاست (مقالہ ۹)
روحانیت کی تعلیم اور حکومت ۲۳-۲۳۰-۲۳۱ (روحانیت سیاسی اقتدار کی محتاج نہیں، اس کی مصلح ہے ۲۷۳ تا ۲۷۶-۲۸۰) (روحانیت کی برتری ۲۸۳-۲۸۴-۲۸۸ تا ۲۹۰) (روحانیت بے عملی نہیں سکھاتی ۲۷۶) (روحانیت قومی ترقی یا اس کی جدوجہد کے منافی نہیں ۲۹۵-۲۹۶)
روحانی تربیت گاہیں۔ مقالہ ۱۶ (بالخصوص ۴۲۹-۴۳۶)
روحِ عمل ۲۳۵-۲۳۶
روحی ۲۳ تا ۳۰
روحی کا نسخہ شفا ۳۰
رہبانیت ۳۹-۴۰-۴۰۲

ز

زندگی ۹۱ (زندگی سے فرار ۴۰-۲۲۳)
زمان و مکان ۱۲۷-۱۳۷-۳۶۹ تا ۳۷۱-۴۰۰-۴۰۴
زیارت قبور کے اثرات اقبال پر ۲۲

Marfat.com

س

سائنس ۶۰ - ۱۲۱ - ۱۲۲ (کوتاہیاں ۳۸۹)
سلوک بے عملی نہیں ہے ۱۳۸ - ۱۳۹ - ۴۰۱ (سفرِ عشق ۴۰۲ - ۴۰۳)
سوشلزم ۲۷۳
سیاسی اقتدار ۳۴ - ۲۹۰

ش

شریا نقص ۵۵
شرح صدر ۴۷ - ۷۸
شرح فلسفہ خودی (غیر مطلوب ۲۱۶)
" " (مطلوب ۲۱۷ اور مقالہ ۳)
شرک اور اقسام شرک ۵۷ - ۵۸ - ۶۷
شریعت ۴۱ تا ۴۶ - ۵۲ - ۵۶ - ۵۷ - ۱۶۶
شہادت امام حسین علیہ السلام ۳۵۰ تا ۳۵۳
شہدائے کرام رض ۲۴۸
شہادت (گواہی) بلا مشاہدہ باطل ہے ۸۹

ص

صبغۃ اللہ ۵۸
صحیح راہ عمل ۲۳۳ - ۲۳۴ - ۲۳۸ - 239
صدقہ وخیرات ۲۷۹ (نذر و تحفہ ۲۸۰)
صلوٰۃ ۸۸ - ۸۹
صوفیائے کرام "کا عمل" دیباچہ ص۱۱ تا ص۱۴ (مقالہ ۶) ۲۳۰ - ۲۷۸ - ۲۷۹ -
صوفیائے کرام اور سلاطین ۲۲۳ (دولت وجاگیر ۲۲۳ تا ۲۲۴) (غیرت ۲۲۴) (خاص ذمہ داری ۲۲۵) (اس کے علاوہ مقالہ ۲ مقالہ ۶ وغیرہ میں بھی جا بجا اس کا ذکر ہے)
صوفیائے کرام سے غلط توقعات (دیباچہ ص۵ و ص۶ ۲۸۱ ، ۲۹۴

ط

طلسم بود و عدم ۱۱۸ - ۱۱۹
طرز جمہوری ۹۹
طریقت ۴۳ ، ۴۵ تا ۴۸ / ۵۲ / ۵۶ / ۵۷

ظ

ظاہر و باطن ۴۳ تا ۴۷ - ۶۹ - ۱۶۵ تا ۱۶۷ - ۳۱۳ - ۳۱۴
ظاہری اور باطنی تمنیں ۴۳ تا ۴۷
ظاہری مشابہت ۵۰ - ۵۱
ظن و حقیقت ۴۷ - ۱۲۲ - ۱۲۷
ظہورِ ذات ۱۳۷ - ۱۴۳ - ۱۴۴

ع

عالمِ مثال ۳۸۳

Marfat.com

عبادت ۳۶-۳۷-۵۲-۵۳-۲۷۹-۲۷۴ تا ۲۷۸
۳۷۲ (عبادت میں غلو ۳۷ -
۲۳۸ - ۲۳۹)
عبد ۵۳ (عبد اور عبدہٗ کا فرق ۹۴-۹۵)
عجمیت ۸۷ - ۱۰۲-۱۰۳-۱۰۴-۱۰۵
عرفان ۷۹-۱۲۴-۱۲۵ تا ۱۲۷ (۱۴۹
۱۵۰ تا ۱۵۶/۳۲۱-۳۷۴ (رومیؒ
اور برگساں ۲ ۱۶۲-۱۶۳- ۳۹۶)
عروج الی اللہ ۸۲ تا ۹۶ - ۳۸۱
عشق ۷۹-۱۲۳-۱۲۴ (مقالہ ۳ ۲۴۴ تا
۲۵۸) ۳۵۳ (عشق اور عقل ۲۴۴-
۲۲۷ (عشق خدا و رسولؐ دیباچہ ص۱۵
۵۶-۲۲۳-۲۵۰ تا ۳۵۳ (۳۵۴
(عشق اور برگساں ۲۵۳-۲۵۴)
عطارؒ ۲۳-۲۴-۳۰-۸۱-۱۵۴-۱۵۵
عظیم ترمقصد حیات ۳۴۸ تا ۳۵۳
عقل منطقی ۱۶۴-۳۹۲ تا ۳۹۷
علم لدنی ۷۵ (معرفت ۸۴-۸۵)
علوم عقلی اور اسلام ۳۱۳
علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا قول ۸۱ -
(اشعار ۱۵۳)
عمل اور خودی ۲۱۷ تا ۲۲۲
عمل اور صوفیائے کرام ۲۲۳ تا ۲۲۵
عوام کے لئے اقبال کی تجویز ۳۱-
(حالت ۲۲۸)

غ

غفلت ۱۹ (غافل انسان ۱۴۸)
غیر اسلامی "باطنیت" اور اسلامی روحانیت
۴۰-۴۱-۴۷
غیر حق ۵۵ (غیریت ۵۵)
غیر مسلم نقاد، دیباچہ ص۸، ۴۷

ف

فراست مومن ۱۲۵
فراق و وصال ۹۹-۱۰۰-۳۱۷ تا ۳۲۰-
۳۵۴ تا ۳۵۷-۳۸۰ تا ۳۸۴
فرنگی تعلیم ۲۲۹-۲۳۰
فسطائیت ۶۰
فقر ۴۵-۴۹-۵۹-۶۰-۱۱۲-۱۱۳-۱۱۴-
(مقالہ ۶) ۱۹۶ تا ۲۱۱ (نظریۂ
اقبال ۲۰۸- بنیاد ۲۱۰) ۴۲۳-۴۲۴
(غلط فہمیاں- دیباچہ ص۶)
فضائل قلبی کی ضرورت ۳۱۰
فکر اقبال کی تبدیلیاں ۳۶
فلسفہ پر دین کی بنیاد (دیباچہ ص۶ و ص۸
۳۷۱-۳۷۲-۳۹۴ تا ۳۹۷-
(خدا رسی کے لئے ۱۲۱-۳۷۱-
۳۷۲ اور ۳۹۰ تا ۳۹۷)
فلسفۂ خودی، دیباچہ ص۸، ۱۴۷-۳۳۴

Marfat.com

(غلط تشریحات ۴۳۳ تا ۴۳۵) اگری معنویت ۴۳۵)
"فلسفہ عجم" (اقبال) ۲۱۵
فنا ۵۵ - ۱۰۰ - ۲۴۵ - ۳۵۴ تا ۳۵۷ - ۴۰۱

ق

قرآنی انسان - مقالہ ۱۰
قرآنی تصوف (غیر اسلامی "مسٹی سزم" نہیں ہے) ۴۰ - ۴۱
قرآن وسنت ۴۳
قبر اور قیامت کے نئے معنے ۳۵۷ تا ۳۶۰
قرب حق ۳۷ - ۴۸ - ۴۹ - ۵۱ تا ۶۲ (حصول ۶۸ تا ۹۶)
قرب نوافل ۵۴
قرنِ اولیٰ کے مسلمان اور تصوف ۲۵۴ - ۲۵۵
قلب ۳۷ - ۴۸ (فضائل ۳۱۰) ۳۷۳ - ۳۷۴
قلندری ۵۹ (قلندری اور ولایت ۴۲۱) ۴۲۸
قوت کی ضرورت ۴۱۳ تا ۴۱۵
قومیت ۶۰

ک

كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۵۷
کامل پیروی رسول ۴۰
کائنات اور ہمارے آلات ادراک ۳۲۰ - ۳۲۱ - ۳۷۲ تا ۳۷۴
کتاب وحکمت ۵۱
کشف والہام، دیباچہ ص۷ ۱۲۷ - ۳۷۴
کُنْ فَیَکُوْنُ ۳۹۳

ل

لامحدود کی جانب محدود کا سفر، مقالہ ۱۴
لاہوت ۳۰۳
لبید (شاعر عرب) کا قول ۶۵

م

مابعد الطبیعیات ۱۲۱ - ۱۲۲
ماخذ تصوف، دیباچہ صفحہ ۱۵ - ۵۰ - ۵۱
مادہ کی حقیقت ۱۲۳ (مادیت سے معنویت تک ۱۶۰ تا ۱۶۲) ۱۶۲ - ۱۷۰ - ۴۰۰
محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاءؒ ۲۰
مراجعت ۱۰۰ تا ۱۰۵
مراقبہ ۷۰ - ۱۰۳ - ۱۰۴
مرتبہ انسانی ۱۴۱ تا ۱۴۴
مرتبہ روح ۱۴۰ - ۱۴۱

Marfat.com

مساوات شکم ۳۴۴
مسلک خدا رسی، دیباچہ ص۵ تصوف
فقر اور عشق کے تحت بھی دیکھو۔
مسلمان کا زوال ۲۲۸
مسلم مملکت ۵۹-۶۰
مشاہدہ ۷۰-۱۴۴ تا ۱۴۷
معاشی و سیاسی امور ۲۳۱
معراج مومن ۵۸-۷۰-۷۴ تا ۹۶
۸۸-۱۶۴-۱۶۵
معراج نبویؐ ۴۳-۸۴-۸۸-۹۴ تا
۹۶-۲۴۷
معرفت اور علم معرفت، دیباچہ ص۴
۴۳-۴۵-۵۲-۵۳-۵۶-
۵۸-۵۹-۸۴-۸۵-۳۷۴
(معرفت نفس ۵۳)
معجزِ اسلام، دیباچہ ص۶
مقام بندہ مومن ۳۶۲-۳۶۳
مقربین ۵۲-۸۲
مقصد تالیف کتاب، دیباچہ ص۱۰ ص۱۱
مکشوفات اولیاء اللہ ۲۵۵ تا
۲۵۶-۳۶۲-۳۷۳
ملفوظات اولیاء اللہ کا درجہ ۷۹-
۲۵۶
ملکوت ۳۸۳
ملوکیت ۶۰ تا ۶۲ (ملوکیت اور

اہل بیت اطہار رض ۲۳۳-۲۳۴ (۲۳۴
عوام ۲۳۴) (ملوکیت و روحانیت
۲۸۶)
ممکنات عالم ۶۸-۱۵۲-۱۷۸-
(حقیقت موجودات ۱۷۸ تا ۱۸۱)
۳۲۰ (زمیں سے تا بہ ثریا ۳۶۲
۳۶۳-اور آگے) ۳۷۴
منزلِ کبریائیت ۳۲ (معراج کے
تحت بھی دیکھو)
منصور رح ۵۴
موت ۹۱ (مقالہ ۱۲) ۳۳۰-۳۵۳-
(ارتقاء کے لئے ضروری ۳۳۹)
نئے معنے ۳۵۷-۳۵۸) ۴۰۰
موجودہ متصوفین کی کوتاہیاں، دیباچہ
ص۱
موجودہ آزاد اسلامی مملکتوں کی کوتاہیاں
۲۳۷ تا ۲۳۹
موسیٰ و خضر ۴۵
مومن کا ارتقائے روحانی ۷۹-
۲۴۵-۲۴۶ (اقبال کا
مردِ مومن ۳۶۱-۳۷۵) ۳۶۱
تا ۳۸۵ (معراج مومن کے
تحت بھی دیکھو)

ن

نبوّت ۴۴ (سیاسی اقتدار ضروری

Marfat.com

نہیں ۳۰۹
نذر و تحفہ ۲۸۰
نزول و عروج ۲۴۹ (تنزلات بھی
دیکھو)
نفس کی قسمیں ۲۲۲
نسخۂ شفا ۳۰
نطشہ ۳۲ (نطشے یا نٹشے کا فوق البشر
اور ہمارا انسان کامل ۳۲۳ تا
۳۲۷) (نطشے کی کافری ۴۱۱)
نگاہِ مومن ۴۲۷
نورِ مطلق ۲۲۴ (نور و ظلمات سے
مراد ۸۹)
نو فلاطونی غیر اسلامی عقائد ۱۸۶ تا
۱۸۸
نیابتِ الٰہی اور نائب حق ۵۹ -
۶۲ - ۴ - ۸ (نیابت حق اور
قلندری ۲۲۱-۲۲۳-۲۷۵)

و

وجدان ۷۹ - ۲۴۸ - ۳۷۱ - ۳۷۴
۳۹۲ تا ۳۹۷
وجود مطلق ۱۳۰ تا ۱۳۷ (دو تعین:
۱۷۹) ۳۷۶ تا ۳۸۰، ۳۸۳ (حوالہ
۸۹) (تین صورتیں ۱۷۶-۱۷۷)
وحدتِ انسانی ۴۰۹ - ۴۱۰

وحدت الوجود اور اقبال ۲۷ - ۵۳ -
۵۹ (پروفیسر سلیم چشتی کی شہادت
۶۳-۶۴) (مولانا عبدالسلام
ندوی کی شہادت ۷۴ تا ۷۷) -
۱۸۱ تا ۱۸۳ - ۱۹۲ - ۳۶۳ -
۳۶۴ - اور آگے ۳۷۴ - ۳۷۵
(بعض اہم خصوصیات ۶۴،
ایک تعبیر ۱۲۹ - ۱۳۰) ۱۷۵ - ۱۹۲
(آیات و احادیث ۶۵ تا ۶۷،
۱۷۲ تا ۱۷۵) (عقل کی روشنی
میں ۱۷۷ تا ۱۸۱) (صحیح تعریف
۱۳۲-۱۳۳-۱۳۴) (احیائے تنزیہہ و
تشبیہہ ۱۷۵) (غلط عقائد ۱۳۲)
(اصطلاح ۱۷۲) (نفی خودی کا
امکان ہی نہیں ہے ۱۳۹،
۱۷۵)
وسیلۂ شیخ ۲۶۳
وطن کا سیاسی تصور ۴۰۸-۴۱۲-۴۱۳
وصل ۵۳ - ۸۰ - ۵ (اقبال ۳۱۷ -
۳۸۰ تا ۳۸۴) (اہم ترین پہلو
۳۱۹) ۳۵۴ تا ۳۵۷ - ۳۷۴
ولایت اور ولی ۴۴ - ۵۹ - ۶۰ (نبوت
سے مقابلہ ۳۰۸) (سیاسی اقتدار
ضروری نہیں) (مقالہ انسان
کامل ۱۱)

Marfat.com

ویدانتی عقائد ۱۸۸ تا ۱۹۲
ہدایت کا انحصار ۲۶۷
ہمہ اوست ، ہمہ از وست ۵۳
ہُو ، اللہ ہُو ۵۳
۵
ہادی کے بغیر کتاب اللہ ۲۶۵ تا ۲۶۷

قطعۂ تاریخ طبع کتاب

قرآنی تصوف اور اقبال (اسم تاریخی "چراغ معنوی")

مرحبا! اے کاوشِ کلک غنی — شرحِ اقبال و تصوف خوب کی

نسخہ کیا ہے مخزنِ انوار ہے — اور خضر شاہراہِ حق رسی

مسلکِ مردانِ حق کا آئینہ — رہنمائے راہِ عشق و عاشقی

یا خدا! مقبولیت کا دے شرف — قلبِ انساں پائے اس سے روشنی

غیب سے آئی ندا ہے نورپاش
اسم تاریخی "چراغ معنوی"
۱۳۸۰ھ

اقبال علامہ محمد
تصوف
تمام

مکتبہ جدید
(چوک انار کلی) لاہور
ہ بک سیلرز

Marfat.com

تعارف

و

پیش لفظ

Marfat.com